قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اُردو)

جنوری ۲۰۰۴ء

مقالہ نگار

مسرت جہاں

ایم اے (مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا) ایم فل (یونیورسٹی آف حیدرآباد)

نگراں

ڈاکٹر حبیب نثار

ایم اے ایم فل، پی ایچ ڈی (یونیورسٹی آف حیدرآباد)

لکچرر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبہ اُردو، اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۶

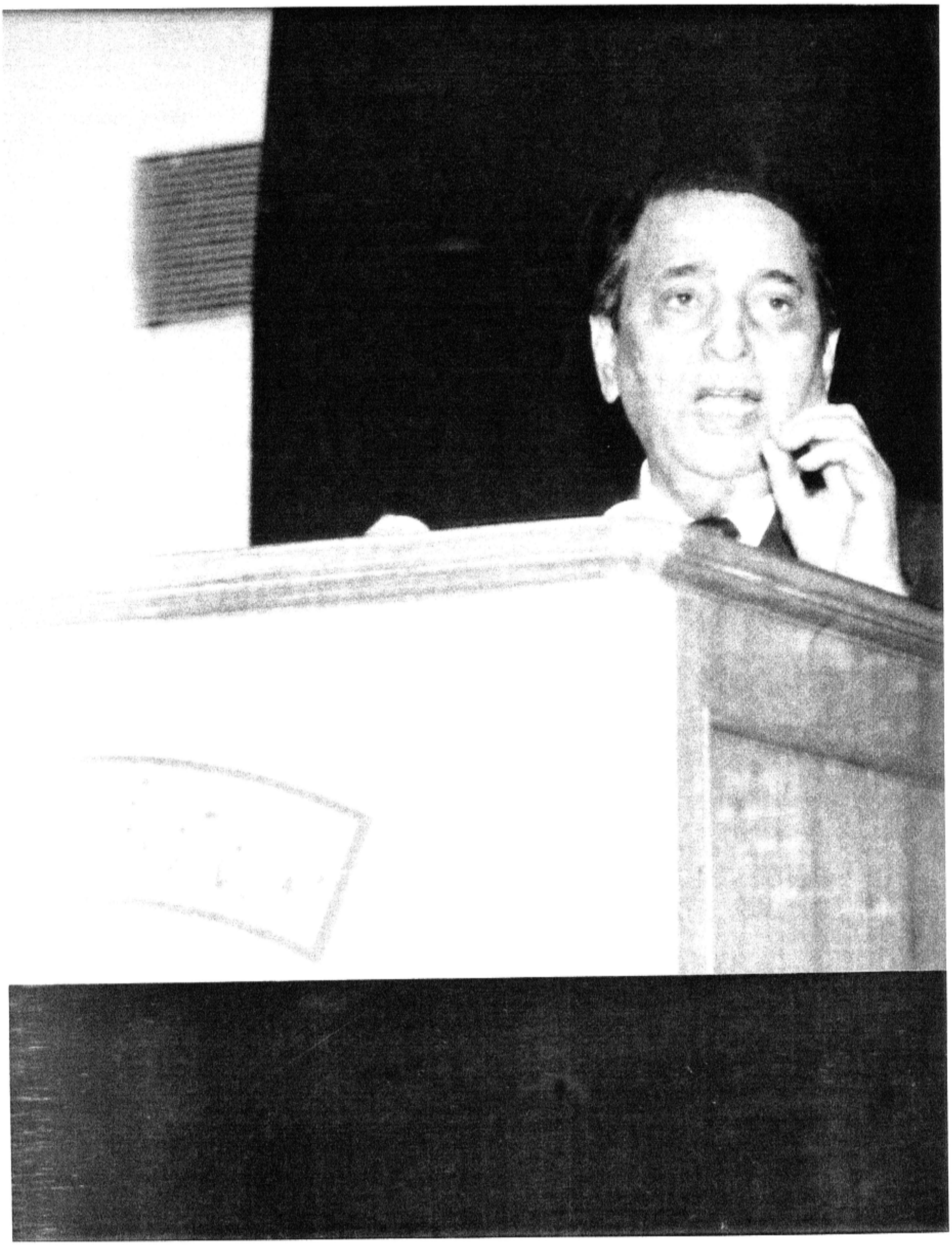

فہرست

ابتدائیہ		4
باب اول	قمر رئیس: سوانح و شخصیت	13
	(الف) سوانح	14
	(ب) شخصیت	35
باب دوم	قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات : مختلف جہتیں	53
	(الف) تصانیف کا اجمالی تعارف	54
	(ب) صحافت	63
	(ج) ترجمہ اور ترجمہ نگاری	81
	(د) ترتیب و تدوین	90
	(ہ) تنقید	119
	(و) شاعری	124
باب سوم	ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس	134
باب چہارم	پریم چند اور قمر رئیس	203
باب پنجم	نیاز حیدر اور قمر رئیس	231
باب ششم	ازبکستان اور قمر رئیس	255
اختتامیہ		324
کتابیات		339

ابتدائیہ

دُنیائے اُردو ادب میں چند ہی ایسے ادیب ہوئے ہیں جو قلم کی جولانی کی بدولت مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے اور جن کا نام نامی ادبی دنیا میں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ قمر رئیس کا شمار ایسے ہی باوقار ادیبوں میں ہوتا ہے۔ قمر رئیس ایک ترقی پسند ادیب ہیں جن کی تقریباً دو درجن کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ پریم چند اور فکشن کی تنقید اُن کے خصوصی موضوعات رہے ہیں۔ اُنہوں نے ازبکستان کے ادب اور تہذیبی تاریخ کو اُردو میں متعارف کرایا۔ اس کے علاوہ قمر رئیس نے نیاز حیدر جیسے خلاق شاعر کے کلام کا انتخاب اور ایک طویل و بسیط مقدمے کے ساتھ اُس کی اشاعت کا اہم کام بھی کیا ہے۔ اُنہوں نے ترجمے کے فن اور روایت پر ایک ایسی کتاب ترتیب دی جو تقریباً تیس برس گزر جانے کے باوجود آج بھی اس فن پر ایک کلیدی اور اساسی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس علمی وادبی خدمات کے علاوہ قمر رئیس ترقی پسند تحریک کی ایک مرکزی شخصیت ہیں۔ 1950ء میں انہوں نے جس نظریہ کو اپنایا اُس پر آج زمانے کے نامساعد حالات اور نظریات کے شکست و ریخت کے باوجود مضبوطی سے کار بند ہیں اور ترقی پسند تحریک کی کامیابی سے قیادت کر رہے ہیں۔

راقمۃ الحروف نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے قمر رئیس کی خدمات کے موضوع پر ایم فل کا مقالہ داخل کیا تھا۔ ایم فل کے سلسلے میں تحقیق کے دوران بار بار یہ احساس رہا کہ قمر رئیس کی خدمات کے صرف ایک پہلو کے احاطے سے تحقیق کا پوری طرح حق ادا ہو رہا ہے اور نہ ہی اس شخصیت کے شایان شان انصاف ہو پا رہا ہے۔ لہٰذا جب پی ایچ ڈی کے لیے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں نے قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات کے تعلق سے تشنگی

کا ذکر اپنے اساتذہ سے کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ بعض استفسار کے بعد میرے اساتذہ نے میرے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے ''قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات کا تنقیدہ جائزہ'' پر تحقیق کی اجازت دے دی۔

زیر نظر مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب ''قمر رئیس۔ سوانح و شخصیت'' سے متعلق ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں مصاحب علی خاں عرف چھکن کے اباواجداد کے بارے میں روشنی ڈالنے کے بعد قمر رئیس کے بچپن، ابتدائی تعلیم شاہجہاں پور میں ننھے قمر رئیس کی اٹکھیلیاں، معصوم شرارتیں، ہائی اسکول کی تعلیم، انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے دوران اشتراکی ادب سے دلچسپی اور پھر بی اے وایل ایل بی کی تعلیم کا بیان کیا گیا ہے۔ قمر رئیس کی زندگی کے اس تعمیری عہد کی سرگرمیوں کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے دوست احباب، اُن کے مشاغل، شاعری سے دلچسپی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قمر رئیس کی سوانح حیات تفصیل سے بیان کرتے ہوئے اُن کی شادی، ملازمت، تاشقند میں قیام اور اُزبیکستان کے لیے اُن کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 1997ء میں قمر رئیس کے دہلی یونیورسٹی سے سبکدوشی پر حکومت ہند نے انھیں انڈین کلچر سنٹر، سفارتخانہ ہند برائے اُزبیکستان کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔ پانچ برس تاشقند میں خدمات بحسن خوبی انجام دے کر اپنے وطن لوٹ آئے ہیں۔ باب اول میں قمر رئیس کی سوانح حیات قلمبند کرنے کے بعد حصہ ثانی میں اُن کی شخصیت کے مختلف الجہت پہلوؤں کو منور کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب ''قمر رئیس کی ادبی خدمات'' کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے جس کو پانچ ضمنی موضوعات کے ذریعہ مکمل کیا گیا ہے۔ قمر رئیس ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ انہوں نے اُردو ادب کی خدمات مختلف حیثیتوں میں انجام دی ہیں، وہ ایک سلجھے ہوئے صحافی اور ایک معتبر مترجم ہیں۔ انہوں نے متعدد کتابیں ترتیب دیں ہیں یا تدوین کی ہیں۔ اُردو فکشن کے وہ مستند نقاد ہیں۔ اُنہوں نے شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس باب میں قمر رئیس کی انہیں ہمہ جہت پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کے مندرجہ ذیل ضمنی عنوانات ہیں:

الف۔ قمر رئیس کی تصانیف کا اجمالی تعارف

(ب) صحافت

(ج) ترجمہ اور ترجمہ نگاری

(د) ترتیب وتدوین

(ہ) تنقید

(و) شاعری

اس باب کی ابتداء میں قمر رئیس کی جملہ تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اور اُن تصانیف پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اس باب کے ضمنی ابواب میں زیر بحث نہیں آئے ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان ''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس'' ہے۔ اُردو ادب میں جو چند ایک ادبی تحریکیں رونما ہوئی ہیں اُن میں سب سے کامیاب تحریک ترقی پسند تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے ادب کو زندگی کے تلخ حقائق سے معمور کیا۔ 1936ء میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اُردو کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی سرپرستی کی جن میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، ملک راج آنند، عزیز احمد وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ 1950ء کے بعد تحریک میں ایک طرح کا جمود آ گیا جو کہ آزادی ہند اور تقسیم ہند کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سجاد ظہیر نے پاکستان سے واپسی کے بعد تحریک میں از سر نو زندگی پیدا کرنے کی سعی وجستجو کی۔ لیکن باوجود حد درجہ کوشش وکاوش کہ تحریک کو عروج نو حاصل نہ ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نوجوان ارکان اس تبدیلی اور اس کش مکش کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے۔ ان نوجوان ارکان میں سب سے زیادہ پر جوش اور پر یقین قمر رئیس تھے جنھوں نے بالآخر 1972ء میں ترقی پسند تحریک میں ایک نئی روح پھونکی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بے شمار سمینار و سمپوزیم کا انعقاد کیا۔ مضامین اور اداریوں کے ذریعے تحریک پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب دیے اور غلط فہمیوں کا ازالہ

کیا۔ اُنہوں نے یہ تمام سمینار، یہ تمام کوششیں ترقی پسند تحریک کو زندہ جاوید بنانے اور اُس کے پیغام کو جاری و ساری رکھنے کے لیے اپنے رفیقوں اور اپنے شاگردوں کے تعاون سے انجام دیں۔ ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس 1972ء کے بعد اسم مسمّٰی بن گئے ہیں۔ قمر رئیس کی تیس (30) برس کی انتھک جدو جہد کا ثمر' ترقی پسند تحریک کا عصر حاضر میں باقی و زندہ رہنا ہے۔ آج بھی ادب میں ترقی پسندی کی روح اس کی عین شہادت ہے۔ اس باب میں تحریک کی ابتدا اور بتدریج ارتقا کا بیان کرتے ہوئے قمر رئیس کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب ''پریم چند اور قمر رئیس'' قرار دیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسندی اگر قمر رئیس کا عشق اول کی حیثیت رکھتی ہیں تو پریم چند اور مطالعہ پریم چند قمر رئیس کی پہلی تخلیق کا رتبہ رکھتی ہے۔ قمر رئیس کی پہلی ادبی تصنیف بھی پریم چند سے متعلق تھی جو کہ اُن کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا۔

پریم چند اور اس کے فن پر تا حال قمر رئیس کی چھ تصانیف شائع ہوئیں جو حسب ذیل ہیں:

1۔	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار	1959ء
2۔	مضامین پریم چند	1960ء
3۔	پریم چند فکر و فن	1980ء
4۔	پریم چند	1981ء
5۔	منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے	1983ء
6۔	پریم چند کے افسانے	1991ء

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے پی ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے کے لیے پریم چند کے ناول کو موضوع قرار دیا تھا۔ انہوں نے تمام تر سنجیدگی' دل جمعی اور دل بستگی کے ساتھ پریم چند کے ناولوں کے ایک ایک واقعہ' ایک ایک کردار' ایک ایک مکالمے' ایک ایک منظر نامے کا مطالعہ کیا جس کا حاصل اُن کی کتاب ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند پر اپنی مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ اپنے مقالات میں بھی پریم چند کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ''عصری آ گہی'' میں اُن کا مقالہ ''پریم چند اور فرقہ واریت'' اور ''پریم چند کی

کہانیوں کا مطالعہ'' مشمولہ تلاش وتوازن.......... پریم چندفہمی کی چند بہترین مثالیں ہیں۔ پروفیسر سید محمد عقیل نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ 1959ء تک پریم چند کے ناولوں کے صحیح عنوانات کا بھی اہل اُردو کو علم نہ تھا۔ پہلی مرتبہ قمر رئیس نے اپنے مقالے میں پریم چند کے ناولوں کے مستند ترین سنین اور نام بہ اسناد درج کیے۔

قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں ہی کو اپنی جولانیٔ طبع کا حصہ نہیں بنایا ہے۔ اُنہوں نے پریم چند کے افسانوں پر بھی اسی طرح اظہار خیال کیا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ قمر رئیس نے پریم چند پر لکھتے ہوئے تنقید سے زیادہ تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور حقیقت کی بازیافت اتنی صاف اور روشن ہے کہ انکار ممکن نہیں۔ قمر رئیس کی پریم چند پر لکھی ہوئی تصانیف پر تحقیق وتنقید کے اسی نقطۂ نظر وتناظر میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

قمر رئیس کو 1962ء میں ازبیکستان میں خدمات انجام دینے کا موقع ملا اور پھر انہوں نے مختلف ادوار میں ازبیکستان میں تدریسی خدمات انجام دی ہیں جس کے نقوش ان کی چار تصانیف میں روشن ہوئے ہیں۔ اسی طرح قمر رئیس نے ممتاز ترقی پسند شاعر نیاز حیدر کی زندگی وکلام کو دو تصانیف میں متعارف کروانے کا اہم ترین کارنامہ انجام دیا ہے۔ راقمۃ الحروف نے مقالہ لکھتے ہوئے قمر رئیس کے انہی امتیازات کو ترجیحی بنیاد پر ابواب کی شکل میں پیش کیا ہے تاکہ قمر رئیس کے فکر وفن کو انہی کے حوالے سے جانچا اور سمجھا جاسکے۔ چنانچہ مقالے کے ابواب ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس، پریم چند اور قمر رئیس کی طرح ''نیاز حیدر اور قمر رئیس'' مقالے کا پانچواں باب ہے۔ قمر رئیس کے اہم کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے نیاز حیدر جیسی شخصیت کے فن کو گرد آلود ہونے سے بچایا اور اُسے از سر نو اُردو دُنیا کے سامنے پیش کیا۔

نیاز حیدر ترقی پسند فنکار تھے۔ وہ ایک فطری ڈرامہ نگار، اسکرپٹ رائٹر، نغمہ نگار، نظم گو، غزل سرا کی حیثیت سے ہندوستان کے فنون لطیفہ کے حلقوں میں معروف تھے۔ قمر رئیس نے نیاز حیدر کی نظموں کا مجموعہ ''شعلۂ آوارگی'' 1992ء میں شائع کیا جس پر ایک مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا۔ اس مجموعہ میں قمر رئیس نے نیاز حیدر کی چند غزلیں بھی

شامل کی ہیں جو کہ انھیں نظمیں اکٹھا کرتے وقت دستیاب ہوئیں تھیں۔قمر رئیس نے مقدمے میں نیاز حیدر کی سوانح، شخصیت، ان کی فطرت کا لا اُبالی پن اُن کی سفر آشنا طبیعت کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ یہ تمام تفصیلات پہلی مرتبہ ایک مبسوط و مفصل شکل میں سامنے آئی ہیں۔قمر رئیس نے نیاز حیدر کی غزلیں بھی خاصی تعداد میں بازیافت کیں اور ان غزلوں کو ''نغمہ جمال زمیں'' کے عنوان سے 2002ء میں شائع کیا۔ترقی پسند شعرا کے بارے میں عموماً یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ چند ایک شعرا کے علاوہ کسی نے غزل میں طبع آزمائی نہیں کی۔قمر رئیس نے نغمہ جمال زمیں شائع کرتے ہوئے ایک اور ترقی پسند غزل گو شاعر کو متعارف کروایا ہے جس کی غزلیں ہم عصر زندگی کی حسیت کے مضامین سے پُر ہیں اور اسی کے ساتھ اُن کے یہاں کلاسیکی غزل کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ یہ باب انہیں تفصیلات پر مبنی ہے۔

مقالے کا باب ششم ''ازبکستان اور قمر رئیس'' ہے۔قمر رئیس نے ازبکستان سے متعلق حسب ذیل چار تصانیف شائع کی ہیں:

1۔ ازبکستان اور علی شیر نوائی 1994ء
2۔ ازبکستان انقلاب سے انقلاب تک 1997ء
3۔ بیسویں صدی کی ازبیک شاعری 2001ء
4۔ ظہیرالدین محمد بابر، شخص، شخصیت اور شاعری 2002ء

قمر رئیس کی یہ تصانیف آزاد جمہوریہ ازبکستان کی تاریخ، تہذیب اور فنون لطیفہ کے عرفان حاصل کرنے کا اہم ماخذ قرار دی جاسکتی ہیں۔انہوں نے علی شیر نوائی جیسے کلاسیکی ازبکی شاعر کی سوانح و خدمات پیش کرتے ہوئے ازبکستان کی تاریخ و تہذیب کو سمجھانے کی سعی کی ہے۔قمر رئیس کی دوسری تصنیف ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' دراصل پہلی تصنیف ہی کا تسلسل پیش کرتی ہے۔قمر رئیس کی یہ دو تصانیف ازبکستان کی شعری روایت اور ادبی تاریخ کو پیش کرتی ہیں۔ظہیرالدین محمد بابر پر قمر رئیس کی تصنیف اس لحاظ سے اولیت کا درجہ رکھتی ہے کہ غالباً پہلی مرتبہ کسی ہندوستانی نقاد یا اُردو کے کسی دانشور نے ظہیرالدین محمد بابر کی شخصیت اور فکر وفن کو سمجھنے سمجھانے کی سعی بلیغ کی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی وتہذیبی تناظر میں قمر رئیس کی یہ تصنیف ایک بہترین تریاق ہے۔

قمر رئیس کی ازبکستان کے سلسلے میں چوتھی اور آخری تصنیف ''ازبکستان انقلاب سے انقلاب تک'' دراصل قمر رئیس کی 'تزک' اور 'سفرنامے' کا حسین امتزاج ہے جس میں ازبکستان کی عوامی زندگی بھرپور انداز میں بیان ہوگئی ہے۔ قمر رئیس نے تقریباً بارہ برس ازبکستان میں گزارے اور انہوں نے اپنی ان تصانیف کے ذریعہ سرزمین ازبکستان کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس باب میں انہیں کتابوں کے حوالے سے قمر رئیس کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا چھ ابواب کے بعد اختتامیہ تحریر کیا گیا ہے جبکہ مقالے کے آخر میں بنیادی اور امدادی کتابوں اور اخبارات ورسائل کی فہرست درج کی گئی ہے۔

مقالے کے لیے مواد کی فراہمی اور مختلف شکوک وشبہات کے ازالے کے لیے میں مستقل پروفیسر قمر رئیس کے ربط میں رہی۔ اُنہوں نے فون اور خطوط کے ذریعے میری غیر معمولی رہنمائی کی ہے۔ شکریے کا لفظ اُن کی معاونت کے آگے پھیکا محسوس ہوتا ہے مگر پھر بھی میں اُن کی بے حد مشکور وممنون ہوں۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر اس کی تکمیل تک مجھے اپنے شعبے کے سبھی اساتذہ کی شفقت اور سرپرستی حاصل رہی ہے لہٰذا میں اُن سبھوں کا بطور خاص صدر شعبہ اُردو پروفیسر محمد انورالدین اور پروفیسر رحمت یوسف زئی صاحبان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ پروفیسر محمد انورالدین ملک کے ممتاز پروفیسر اور حیدرآباد کی ایک مقبول شخصیت ہیں۔ اُن کی فعال اور متحرک شخصیت کے فیض سے شعبہ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی کا شہرہ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل چکا ہے۔ وہ عمل اور حرکت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شعبے میں آئے دن کوئی نہ کوئی سرگرمی جاری رہتی ہے۔ ان سرگرمیوں میں عموماً طلبہ کے لیے مفید پہلو کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سمینار ولکچرس میں طلبہ وریسرچ اسکالروں کو شریک ہونے کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دی جاتی ہے۔۔۔ اور یہ سب پروفیسر محمد انورالدین کی ایما اور پہل پر ہوتا ہے۔ میں ایک بار پھر اُن کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور شعبے کی مزید فعالیت کے لیے اللہ سے دعا کرتی ہوں۔

ڈاکٹر حبیب نثار میرے نگراں ہیں۔ اُنہوں نے میرے مقالے کے موضوع میں خصوصی دلچسپی لی۔ اُنہوں

نے سب سے پہلے خود پروفیسر قمر رئیس کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اُن پر نشانات لگائے اور بے شمار نکات نوٹ کیے۔ اُنہوں نے دہلی جا کر بنفسِ نفیس پروفیسر قمر رئیس سے ملاقات کی اور اُن سے تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر نثار صاحب نے قمر رئیس سے ہوئی بات چیت کے بھی پوائنٹس نوٹ کیے۔ تب کہیں جا کر اُنہوں نے میرے مقالے کی تصحیح و تنقیح کی۔ میرے نزدیک کسی نگراں کے لیے یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ وہ موضوع کے تعلق سے پہلے خود وسیع پیمانے پر مطالعہ کر لے۔ اُس کے نکات نہ صرف ذہن میں بلکہ صفحہ قرطاس پر بھی محفوظ کر لے۔ اس سے تحقیق کے مرحلے میں ریسرچ اسکالر اور نگراں کے لیے آسانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور غلطیوں کا احتمال کم سے کم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر حبیب نثار نے ایسا ہی کیا۔ یقیناً اُنہیں اس طریقہ کار کو اختیار کرنے میں بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔ میں اُن کے تعاون اور رہنمائی کے لیے اُن کی شکر گزار ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے کرم فرماؤں کو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ خاص طور پر پروفیسر وہاب قیصر جنہوں نے اکثر میری حوصلہ افزائی کی اور ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال جن کے قیمتی مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

اپنے شریکِ حیات ڈاکٹر محمد ظفر الدین کی کوشش و کاوش کا بھی تہہ دل سے اعتراف کرتی ہوں کہ یہ دن میں نے اُن ہی کی بدولت دیکھا ہے۔ اور آخر میں اختر الایمان سے الفاظ مستعار لیتے ہوئے خدائے عالم‘ بزرگ و برتر کی بارگاہ میں سجدہ تشکر کرتی ہوں جس کے خاکداں میں‘ محبتوں کے لطیف دامن‘ مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں‘ یہ وادیاں ہیں گلوں کا مسکن ــــــ۔ اور جس کے خاکداں میں‘ زمیں کے سینے سے پھوٹتے ہیں‘ نئے شگوفے‘ نئی بہاریں‘ فرازِ کوہ گراں سے گرتی‘ ہیں تند اور تیز آبشاریں!

مسرت جہاں

30 جنوری 2004ء

باب اول

قمر رئیس: سوانح و شخصیت

(الف) سوانح

(ب) شخصیت

سوانح

”لے کے نکلا ہوں یہ دفتر آگہی
ان کا بازار ہے میری جنس گراں

کس سے سودا کروں کس کو آواز دوں
کون ہے جو سنے شوق کی داستاں

ہے کسے اس گھڑی فرصت یک نظر
وہ ہیں، اصنام ہیں اور فرش دکاں

بت گری بت فروشی حقیقت سہی
کچھ تو دیں قیمت خوابِ عمرِ رواں

کچھ تو تسکین قلب ونظر ہوسکے
کچھ تو گل رنگ ہو شیشہ جسم وجاں

ان پہ نازاں سہی شیوۂ آذری
میں نے دی ہے مگر پتھر دل کو زباں“

خوابِ عمر رواں کی قیمت کے عوض تسکین قلب ونظر کا متمنی شاعر جو دفتر آ گہی لے کر نکلا ہے اُسے دنیا ”مصاحب علی خاں“ (قمر رئیس) کے نام سے جانتی ہے جو زندگی کے سفر میں اس نقطہ بقا پر پہنچ گیا ہے جہاں فنا بقول

سید عاشور کاظمی خودفنا ہوجاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''کیا ستم ہے کہ جہاں جہاں اُردو ہے وہاں وہاں یہ صورت حال ہے کہ کام کرنے والوں کے راستے میں کانٹے بچھادئیے جاتے ہیں اور اگر کوئی دیوانہ کانٹوں پر چلنا شروع کردے اور ہمت نہ ہارے تو اس پر پتھراؤ کیا جاتا ہے تاکہ وہ لہو لہان ہوکر گرپڑے اور دم توڑ دے۔

ایسے ہی ایک لہو لہان شخص کا نام قمر رئیس ہے جو کانٹوں پر بھی چل رہا ہے' پتھر بھی کھا رہا ہے لیکن اتنا سخت جان ہے کہ لہو لہان ہونے کے باوجود ابھی تک گرا نہیں۔ ابھی تک مرا نہیں ......یہ شخص گرے گا بھی نہیں۔ یہ شخص مرے گا بھی نہیں' اس لئے کہ کچھ لوگ اپنی زندگی کے سفر میں اس نقطے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں فنا' خود فنا ہوجاتی ہے اور صرف بقا باقی رہ جاتی ہے۔ بقا کا یہ مقام خیرات میں نہیں ملتا ...... خوشامد سے بھی نہیں ملتا۔ دولت و جاہ حشم سے بھی نہیں ملتا' یہ صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جو لوگوں کے ہوجاتے ہیں۔ اہل قلم کے حوالے سے یوں عرض کروں گا کہ جن کی زندگی خود سے زیادہ دوسروں کے لئے اور جن کا قلم 'میں' سے زیادہ 'ہم' کے لئے چلتا ہے۔'' 1

بقا کی یہ ابدی زندگی پانے والا لڑکا شاہ جہاں پور کے وکیل' عبدالعلی کے حویلی نما گھر میں 12 جولائی 1932ء کو پیدا ہوا جسے مشفق باپ نے مصاحب علی خاں کے نام سے موسوم کیا۔

قمر رئیس کی زندگی پر لکھے جانے والے متعدد مقالوں اور مضامین میں اُن کی تاریخ پیدائش یہی درج کی گئی ہے لیکن خود قمر رئیس نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ اُن کی پیدائش اس تاریخ و ماہ سے قبل ہوئی تھی۔ اقتباس دیکھئے:

''قمر رئیس : میری تاریخ پیدائش 12 جولائی 1932ء درج چلی آئی ہے۔ لیکن والدہ (مرحومہ) کے حساب کے مطابق میں اس

تاریخ سے تقریباً آٹھ ماہ قبل پیدا ہوا تھا۔ صحیح تاریخ پیدائش کا مجھے بھی علم نہیں۔"[2]

شاہ جہاں پور اتر پردیش کا ایک زرخیز علاقہ ہے جہاں عموماً غرباً کی آبادی ہے۔ لیکن اس مردم خیز علاقہ نے ہندوستان کی جنگ آزادی کو جہاں اشفاق اللہ خاں اور رام پرشاد بسمل جیسے روشن ستارے ادا کئے وہیں اردو ادب کو رشید حسن خاں اور مصاحب علی خاں جیسے آفتاب ومہتاب عطا کئے۔ شاہ جہاں پور کا محل وقوع قمر رئیس کے بڑے بھائی جناب مبارک شمیم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" "شاہ جہاں پور اضلاع پیلی بھیت" لکھیم پور کھیری، سیتاپور، بدایوں، فرخ آباد اور بریلی سے گھرا ہوا ہے، اس کی آب وہوا خوشگوار، زمین زرخیز اور جائے وقوع ہر اعتبار سے مناسب ہے۔ آبادی شہر کے وقت نواب بہادر خاں چغتائی بانی شہر اور ان کے برادرخورد نواب دلیر خاں نے یہاں توطن اختیار کرنے والوں کو رہائش اور پرورش کے لئے جو آراضیات دی تھیں ہمارے اجداد کو دریائے کھنوت کے مشرقی کنارے اور شہری حدود کے حاشیے پر دی گئی تھیں۔ ہمارا گھرانہ اس وقت سے یہاں آباد ہے۔"[3]

شاہ جہاں پور میں ایک بستی احمد پورہ کے نام سے آباد ہے جہاں کی سرزمین پر مصاحب علی خاں قمر رئیس نے اپنا بچپن اچھلتے کودتے ہوئے بتایا ہے۔ اسی کی چھوٹی چھوٹی گلیوں اور کوچوں میں اس نے ہمراہیوں کے ساتھ اپنی حیات کا بھولپن گزارا ہے۔ احمد پورہ کے محل وقوع، اُس کی آبادی اور آباد لوگوں کے پیشے وکاروبار کا بیان کرتے ہوئے مبارک شمیم لکھتے ہیں:

"بستی احمد پورہ جہاں ہمارا کنبہ آباد ہے ایک بلند اور پر فضا مقام پر واقع ہے اس کے مغرب میں کچھ دور تک سرسبز وشاداب وادی اور وادی کے کنارے دریائے کھنوت بجانب جنوب بہتا ہے جو آگے جاکر دریا میں جاملتا ہے۔ شمال میں جنگلات تھے جو صاف ہوگئے اور چپہ چپہ پر زراعت ہوتی ہے۔ مشرق میں

بھی جنگلات تھے جو شاداب کھیتوں میں بدل گئے۔ جنوب میں نواب فتح خاں ابن نواب بہادر خاں کا آباد کردہ محلہ فتح پور ہے۔ ہماری بستی میں برھمن، کسان، بڑھئی، مالی، شیخ اور پٹھان آباد ہیں۔ یہاں لوگوں کا عام پیشہ زراعت اور مزدوری ہے۔ ملازمت پیشہ اور کاروباری لوگ بھی ہیں کچھ صاحب حوصلہ پڑھ لکھ کر کمشنر، کلکٹر، پروفیسر، وکیل، تھانیدار اور دست کاروفنکار بھی ہوئے لیکن مجموعی طور پر غرباء کی آبادی زیادہ ہے۔'' 4

مصاحب علی خاں قمر رئیس کی ساتویں پشت پر اُن کے جد خان احمد خاں کا نام ملتا ہے جو غالباً ڈھائی سو برس قبل گزرے ہیں۔ اُن کا قمر رئیس تک سلسلہ نسب اس طرح ہے:

خان احمد خاں

مکرم خاں

محمد اعظم خاں

معظم علی خاں

محمد ولایت علی خاں

عبدالعلی خاں

مصاحب علی خاں قمر رئیس۔ 5

قمر رئیس کے اجداد علمی فتوحات کی عدم موجودگی کے باوجود علمی حیثیت کے حامل تھے۔ قمر رئیس کا ننہال اہل سادات کا خاندان ہے اُن کی والدہ محترمہ اہل سادات سے تھیں۔ نانا حضرت سید حبیب الحق حبیب عربی وفارسی کے عالم تھے جن کے جد کو اورنگ زیب عالمگیر نے شاہ جہاں پور کا امام وخطیب مسجد جامع مقرر کرنے کے بعد دہلی سے اس منصب پر فائز کیا تھا۔ قمر رئیس کے نانا سید حبیب الحق حبیب کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی جس کی بنا پر یہ منصب ختم ہوگیا۔ قمر رئیس کے نانا کے نام کے ساتھ حبیب کا لاحقہ لکھا ملتا ہے۔ وہ عربی وفارسی کے عالم تھے۔ یقیناً وہ شاعر بھی ہوں گے۔ گویا قمر رئیس کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔

جناب مبارک شمیم نے مقالہ لکھتے ہوئے اپنے اجداد کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ اُن کے جد خان احمد خاں

پر منتہی ہوتی ہے جن کے بارے میں انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آبادیٔ شہر کے وقت نواب بہادر خاں چغتائی بانیٔ شہر اور ان کے برادر خورد نواب دلیر خاں نے دریائے کھنوت کے مشرقی کنارے اور شہری حدود کے حاشیے پر اُن کے اجداد کو رہائش اور پرورش کے لئے آراضی دی تھی۔ جناب مبارک شمیم نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ آیا بستی احمد پورہ اُن کے جد امجد خان احمد خاں نے بسایا تھا۔ قمر رئیس کی سوانح لکھنے والوں نے اس امر پر غور نہیں کیا ہے کہ آیا بستی احمد پورہ اُن جد کے نام پر بسائی گئی۔ راقمۃ الحروف نے مبارک شمیم کے بیان کے بین السطور سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قمر رئیس کے جد امجد خان احمد خاں ہی نے بستی احمد پورہ بسایا ہوگا۔ اسی مناسبت سے اس بستی کا نام اُن کے نام سے موسوم ہوا ہے۔

قمر رئیس کے دادا محمد ولایت علی خاں کو چھ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکیاں اور تین لڑکے۔ بڑے لڑکے اکبر علی خاں نے فوجی خدمات کو ترجیح دی اور حیدرآباد دکن کی فوج میں خدمات انجام دیں۔ دوسرے لڑکے امداد حسین خاں نے خاندان کی مزروعہ آراضیات کا انتظام سنبھالا جس میں اُن کے چھوٹے بھائی عبدالعلی خاں بھی مدد دیتے تھے۔ عبدالعلی خاں کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی ہوئی بعد میں وہ شہر منتقل کر دیئے گئے۔ جہاں انہوں نے امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے اسکول اور کالج کی تعلیم مکمل کی۔ انہیں وکالت میں دلچسپی تھی لہٰذا انہوں نے اُس کورس میں داخلہ لیا اور سند حاصل ہونے کے بعد شہر شاہ جہاں پور میں ہی پریکٹس شروع کر دی۔ وکالت کے ابتدائی دور سے ہی انہیں اپنے ہمعصر وکیلوں میں خصوصی اہمیت حاصل ہونے لگی تھی۔ وکیل ساتھیوں اور مؤکلین کے ساتھ اُن کا رکھ رکھاؤ اور سلوک بہت اچھا تھا جس کی وجہ سے اُن کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مقدمے کی بہتر پیروی کی وجہ سے بھی اُن کی شہرت ہونے لگی۔ اُن کی مقبولیت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اُن کی یافت میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوا اور اوسط خاندانی پس منظر رکھنے والے عبدالعلی رفتہ رفتہ قدرے آسودگی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کی آمدنی کے اثرات فطری طور پر ان کی ذاتی زندگی پر مرتب ہوئے۔ انہوں نے اپنے آبائی زمین و مکان کو بھائیوں کے حوالے کر دیا اور خود ایک علاحدہ مکان تعمیر کیا جس میں ضرورت کی ساری چیزیں مہیا تھیں۔

عبدالعلی خاں نے جو مکان تعمیر کیا تھا وہ اس قدر وسیع و عریض تھا کہ حویلی سے آنکھیں لڑاتا تھا۔ قمر رئیس کے ہم جماعت دوست احمد جمال پاشاہ، عبدالعلی خاں کی شاندار شخصیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قمر رئیس کے والد شاہجہاں پور میں چوٹی کے وکیل تھے۔ احمد پورہ میں ان کی شاندار حویلی تھی۔ میں نے بچپن میں انہیں دیکھا تھا۔ بہت ہی بارعب اور شاندار پرسنالٹی تھی۔ بہت ہی تیز عقابی آنکھیں۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا وکیل بنے۔" 6

بستی احمد پورہ کے محل وقوع کا بیان کرتے ہوئے اُس کے مضافات کے پس منظر میں عبدالعلی خاں کی حویلی کا نقشہ، قمر رئیس کے لڑکپن کے ساتھی عصمت اللہ خاں نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اس شہر میں شمال کی طرف سے یعنی ریلوے اسٹیشن کی جانب سے داخل ہوں تو دائیں جانب دریائے گرا مضافات شہر کو سلامی دیتا ہوا ملے گا بائیں جانب ہمالیہ کی ترائی میں واقع ایک جھیل سے نکلی ہوئی کھنوت ندی سواد شہر سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ ان دو دریاؤں کے دو میل چوڑے دو آبے ہر تقریباً چار میل کی لمبائی میں شاہجہاں پور پھیلا ہوا ہے اس کے ایک سرے پر دریائے گرا کے قریب میں راقم الحروف کا محلہ جلال نگر اور دوسرے کنارے پر کھنوت ندی کے پار محلہ احمد پورہ واقع ہے۔ وہ احمد پورہ جہاں گنے، سرسوں اور چنے کے کھیتوں سے متصل حویلی نما مکان میں مصاحب علی اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتے تھے اور جہاں میں اپنی سائیکل سے کھنوت پرواقع لودھی پور کے چوبی پل (اب اس کی جگہ پختہ پل بن چکا ہے) پر سے ہوکر مصاحب علی سے ملنے جایا کرتا تھا یا یوں کہیے کہ مصاحب علی کی کشش مجھے وہاں کھینچ کر لے جاتی تھی۔" 7

عبدالعلی خاں بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی ذہانت اور ذاتی محنت سے نام کمایا تھا وہ

بڑے ٹھاٹ سے اپنے حویلی نما مکان میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اسی حویلی کے مردانہ حصہ میں اُن کا دفتر بھی واقع تھا۔ پیشہ وکالت کے عروج پر پہنچ جانے کے باوجود اُن کی فطرت میں غرور یا تکبر نام کو نہ تھا بلکہ اپنے موکلوں سے وہ بڑی شفقت سے ملتے۔ اُن کے مسائل سنجیدگی سے سنتے اور اُن کا حل خلوصِ دل سے ڈھونڈ نکالا کرتے تھے ،سی کے ساتھ اپنے چھوٹوں کے لئے ہمیشہ دست شفقت دراز ہوتا۔ عصمت اللہ خاں، عبدالعلی خاں کی حویلی کا احوال بیان کرتے ہوئے عبدالعلی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ایک بڑا سا کشادہ مکان جس کے کوٹھی نما مردانہ حصے کے برآمدے میں ایک طرف مصاحب علی کے والد صاحب اپنے موکلوں کے ساتھ رونق افروز ملتے تھے تو دوسری طرف کے ایک بغلی کمرہ میں مصاحب علی اپنی کتابوں سے نمٹنے میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی جب میں کوٹھی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتا تو وہاں صرف عبدالعلی خاں صاحب کچھ لوگوں کے ساتھ یا اکیلے اخبار پڑھتے ہوئے ملتے تھے اور اخبار سے سر اٹھا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے زنانہ مکان کی طرف منہ کرکے بلند آواز سے پکارتے "چھکن کہاں ہو! دیکھو یہ کون آیا ہے؟" اگر غور کروں تو یہ آواز آج بھی مجھے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوگی۔"8

عصمت اللہ خاں کی قمر رئیس سے ملاقات اور دوستی اُس وقت ہوئی جب وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے لیکن عبدالعلی خاں کے مکان میں اُن کی آمد ورفت زمانہ قبل سے تھی اس لئے کہ اُن کے والد کے مقدمہ کی پیروی عبدالعلی خاں کررہے تھے۔ عصمت اللہ خاں اپنے والد کے ہمراہ اکثر اُن کی حویلی جایا کرتے تھے اور ڈھیر ساری شفقت بٹورلاتے۔ اقتباس دیکھئے:

" لیکن مصاحب علی خاں سے بہت پہلے میری ملاقات اُن کے والد عبدالعلی خاں صاحب سے ہوچکی تھی جو شہر کے ایک معزز زمیندار ہونے کے علاوہ مختار کار بھی تھے۔ اور کئی سال مجسٹریٹ رہے۔ میرے والد کو کسی مقدمے میں ان سے

مشورہ لینا تھا۔ میں بھی والد صاحب کے ساتھ تھا۔ والد نے مطلوبہ مشورہ لینے سے پہلے میرا تعارف کرایا تو میرے سلام کے جواب میں عبدالعلی خاں صاحب نے دعائیں دیتے ہوئے اتنی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا کہ ان کی شخصیت میرے ذہن کے پردے پر مرتسم ہوکر رہ گئی۔ اس کے بعد والد کی طرف سے میں بارہا ان کے پاس قانونی امور کے سلسلے میں گیا اور ہر بار ان کے مشفقانہ رویے سے پہلے سے زیادہ متاثر ہوکر لوٹا۔'' 9؎

قمر رئیس کے والد پٹھان تھے اُن کی شخصیت میں یہ بردباری، یہ تمکنت، یہ شفقت جہاں اُن کی تعلیم کے سبب پیدا ہوئی تھی وہیں اِس میں کہیں نہ کہیں اُن کے خسر جناب سید حبیب الحق حبیب اور اُن کی دختر نیک اختر کے اعلیٰ کردار کو بھی دخل تھا۔ مبارک شمیم اپنی والدہ محترمہ اور نانا حضرت کے صفات اعلیٰ کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' والدہ محترمہ اہل سادات سے تھیں میرے نانا سید حبیب الحق حبیب عربی وفارسی کے عالم تھے ان کے جد عہد اورنگ زیب عالمگیر میں شاہجہاں پور کے امام وخطیب کے منصب پر دلی سے بھیجے گئے تھے۔ منصب ہمارے نانا پر ختم ہوگیا کیونکہ اولاد نرینہ نہ تھی۔ ننہال کے بیشتر افراد عالم ودین دار تھے۔ والدہ محترمہ کم سنی ہی میں شفیق باپ کے سائے سے محروم ہو چکی تھیں۔ بلا کی مخیر اور کنبہ پرور تھیں۔ بلا ضرورت تقاریب کرتی رہتی تھیں کہ گھر مہمانوں سے بھرا رہے۔ دنوں پہلے اور تقریب کے دنوں بعد تک گھر میں ہنگامے رہتے۔ عجیب چہل پہل رہتی تھی۔'' 10؎

نواب وزیر آصف الدوم بہادر تاجدار اودھ کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ انہوں نے قحط کے زمانے میں اپنی رعایا کی مدد کے لئے رفاہ عام کے ذرائع کو کھولے ہی تھے لیکن عاشور خانے کی تعمیر بھی اسی لئے کروائی کہ کسی بہانے عوام کی ضروریات کا سامان کیا جائے۔ اسی لئے تو کہا گیا ''جسے نہ دے مولیٰ اُسے دے آصف الدولہ''.........اور قمر رئیس کی والدہ محترمہ بھی اسی سرزمین اودھ سے تعلق رکھتی تھیں۔ کتنا عظیم یہ تصور ہے

کہ غریب رشتہ داروں کی پرورش کی غرض سے گھر میں دعوتوں کا اہتمام کیا جائے۔ ایسے ہی ماحول میں بندہ اور بندہ نواز کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور ایاز اور محمود ایک ہی صف میں کھڑے ملتے ہیں۔ قمر رئیس کے حوالے سے رتن سنگھ عبدالعلی خاں کے گھر کے ماحول کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' بڑی وسعت تھی گھر کے ماحول میں۔ کوئی بندھن نہیں تھے، نہ سماجی، نہ اخلاقی اور نہ مذہبی۔ غریبوں یا ملازموں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں کوئی مناہی نہیں تھی۔ ایک تانگے والے کا لڑکا منگل ان کے کھیل کا ساتھی تھا۔ ایک پوسا تھا۔ کسان کا لڑکا انکا دوست۔ ہولی اور دوسرے تیوہاروں کے موقعوں پر دیہاتی بھاشا میں گیت جوڑ کر گایا کرتا تھا۔ اس کا ساتھ انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔'' 11

اس ماحول میں مصاحب علی خاں قمر رئیس کا بچپن پروان چڑھنے لگا۔ اُن کے والد عبدالعلی خاں چونکہ ایک خود ساز (Self made) انسان تھے اور انہیں وکالت کے پیشے کے ذریعے عزت، شہرت اور کسی حد تک دولت نصیب ہوئی تھی لہٰذا ایک طرف تو تعلیم پر اُن کا اعتقاد بہت پختہ ہو گیا تھا اور دوسری طرف پیشۂ وکالت اُنہیں بے حد عزیز تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بہترین تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے خواہش مند تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اُن کے بچے پڑھ لکھ کر باوقار عہدوں پر فائز ہوں تاکہ اُن کی زندگی اطمینان بخش گزرے۔ اُن کی یہ خواہش بھی شدت کی حد تک اُن کے دل میں موجزن تھی کہ اُن کا کوئی ایک بیٹا وکالت پاس کرے اور اسے اپنے خاندانی پیشے کے طور پر اختیار کرے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی کوئی اولاد اس پیشے میں قدم رکھے گی تو وہ اُن کی بہترین رہنمائی کر سکیں گے اور اسی کے ساتھ ان کے اپنے مؤکلین اور باعزت شہریوں میں قائم شدہ شناخت بھی وکیل بیٹے کو وراثت میں مل جائے گی۔

عبدالعلی خاں کے گھر جملہ 19 اولادیں ہوئیں پندرہ بیٹے اور چار بیٹیاں لیکن صرف تین بیٹے اور ایک بیٹی حیات رہے۔ مبارک شمیم لکھتے ہیں:

> '' ایک ماں باپ سے چار بیٹیاں اور پندرہ بیٹے گویا ہم سب انیس بھائی بہن تھے، مرتے جیتے یہ ہم دو بھائی کسی نہ

کسی طرح جی بچے ورنہ کچی عمر' نوخیز' کڑیل جوان اور صاحب اولاد بیٹے بیٹیاں مریں تو ماں اور باپ دونوں نے مل کر اولاد کا غم اٹھایا تھا۔'' 12ے

مصاحب علی خاں کی عرفیت چھکن ہے۔اُن کے گھر والے اسی نام سے انھیں یاد کرتے ہیں۔خاندان میں بھی وہ اسی نام سے معروف ہیں شاہجہاں پور کے باسی آج بھی پروفیسر قمر رئیس کو''چھکن'' ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔مصاحب علی خاں چھکن نے اپنی عمر کے چار برس ہنسی خوشی مکمل کیے تو اُن کے مشفق والد محترم نے بڑے تزک واحتشام سے اُن کی ''بسم اللہ'' کا اہتمام کیا۔قمر رئیس کے چچازاد بھائی عاشق حسین خاں ''بسم اللہ'' کا بیان کرتے ہوئے چھکن کے بچپن کا بیان کرتے ہیں۔اقتباس دیکھئے:

'' میں جوان تھا جب چھکن پیدا ہوئے وہ چونکہ کئی شیر خوار بچوں کی موت کے بعد پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کی زندگی کے لئے بہت سی منتیں مانی گئیں۔ چار سال کے ہوئے تو دھوم دھام سے بسم اللہ ہوئی۔ قصبہ کانٹ کے ایک مولوی صاحب ان کی ابتدائی تعلیم پر مامور ہوئے۔ قاعدہ بغدادی کے بعد قرآن پاک کی تعلیم شروع ہوئی۔ مجھے یاد نہیں قرآن ختم کیا یا نہیں۔ لیکن پڑھائی سے زیادہ یہ کھیل کود کے دیوانے تھے۔ محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کبھی باغوں میں' کبھی کھیتوں پر اور کبھی ندی میں تیرتے نظر آتے ۔ فالیز کے زمانے میں کچے پکے خربوزے توڑ کر ندی میں پھینکتے اورتیرکر انہیں پکڑتے۔ ایک بار شفیق بھائی شب برات کے لئے آتشبازی بنا رہے تھے چھکن قریب کھڑے تھے۔ اچانک بارود میں آگ لگ گئی۔ چھکن بال بال بچے۔ بڑے بھائی (محمد احمد خاں) بری طرح جل گئے۔'' 26ے

مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ' قمر رئیس کے قریبی دوست ہیں۔چھکن کی بسم اللہ تقریب کے بارے میں رتن سنگھ نے قمر رئیس کے حوالے سے لکھا ہے کہ''ہاتھی'' پرسواری نکالی گئی اوراحمد پورہ کا گشت کروایا گیا۔اقتباس دیکھئے:

'' ہمیں دولہا بنایا گیا۔ سہرا باندھا گیا۔ ہمارے گھر ہاتھی آیا تھا۔ اس پر بیٹھا کر ہمیں گھمایا گیا۔ گھر سے کچھ دوری پر

پاکڑ کا پیڑ تھا۔ ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ اس پیڑ پر ایک میاں صاحب رہا کرتے تھے۔ ہاتھی نے اس پیڑ کے گرد چکر لگایا۔"

چھکن بہت خوش تھے۔ ایک تو ہاتھی کی سواری کرنے کو ملی اور پھر محلے کی سبھی خوبصورت عورتیں سنور کر آئی تھیں اور یہ ایسا محسوس کررہے تھے جیسے یہ ان سب کے سچ مچ کے دولہا بن گئے ہوں۔ اگر وہ لمحہ ایک مرتبہ پھر نصیب ہوجائے تو ڈاکٹر قمر رئیس اپنی پروفیسری کو فارخطی دے کر ننھا چھکن بننے کو ترجیح دیں گے۔ ایسا ہمیں کامل یقین ہے۔"14

بسم اللہ کے بعد تعلیم کا با قاعدہ آغاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ بعد ازاں انھیں محلّہ کے اسکول میں شریک کروایا گیا۔ 1938ء میں جبکہ چھکن کی عمر چھ برس تھی اُن کے بڑے بھائی مبارک شمیم کی شادی تہمینہ سے انجام پائی۔ تہمینہ شمیم جس وقت دلہن بنی عبدالعلی خاں کے گھر تشریف لائی ہیں اُس وقت "چھکن" کی مصروفیات کا ذکر خیر سنئے:

" 1938ء میں جب میں بیاہ کر آئی تو چھکن کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ آنگن میں ننگے نہاتے اور کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے رام گسیاں پانی دے" کرتے پھرتے تھے۔ مجھے ان کی معصومیت بھولی بھالی صورت اور بھولی بھالی باتوں پر بہت پیار آتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی خاموش مزاجی پر ترس بھی آتا۔ ذرا بڑے ہوئے تو کھیل کود میں کھو گئے۔ سارا سارا دن ولی حسن خاں کی نودھیا میں لڑکوں کے ساتھ لپوڈنڈا کھیلتے یا ندی میں نہاتے' ماسٹر سری رام پڑھانے آتے تو نوکروں سے ان کو تلاش کرایا جاتا۔" 25

تہمینہ شمیم لکھتی ہیں کہ چھکن کو نٹ اور سرکس کے تماشوں سے خاصی دلچسپی تھی اور گھر آتے تو قلابازی کھاتے ہوئے آنگن پار کیا کرتے تھے۔ بچپن میں "انھی ایک انگلی منھ میں اس طرح ڈالے رہتے جیسے کسی کلھیا میں گڑ گھول رہے ہوں"۔ تہمینہ شمیم لکھتی ہیں کہ یہ عادت بڑی مشکل سے چھوٹی۔ چھکن کے مزاج کا بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں

کہ ''خیر شرارتیں تو سبھی بچے کرتے ہیں لیکن طبعاً خوش مزاج اور خاموش طبع تھے'' آگے فرماتی ہیں:

''خیر شرارتیں تو سبھی بچے کرتے ہیں لیکن طبعاً چھکن خوش مزاج اور خاموش طبع تھے۔ آپ (راقم) اور بڑے بھائی صاحب غصہ ور تھے۔ بڑے بھائی صاحب تو بڑے طنطنے کے آدمی تھے مگر چھکن میں غصہ نام کو نہ تھا۔ خفا ہوتے تو خاموش رہتے تھے۔ بچپن سے بڑے ہونے تک ان کا یہی حال رہا۔ بچپن میں کسی بات پر ناراض ہوتے تو سامنے کنویں کی منڈیر پر جا بیٹھتے اور انگلی کے پورے سے یونہی لکیریں بناتے رہتے۔ کپڑے لتے کا کوئی خاص شوق تھا نہ سلیقہ تھا۔ جودے دیا پہن لیا۔ جو بنادیا پسند کرلیا۔ نہ رنگ کی پروا۔ نہ کوالٹی اور فیشن کا خیال۔ بس کپڑا ہونا چاہئے۔ آپ (راقم) اور بڑے بھائی تو اکثر مسئلہ بن جاتے تھے لیکن چھکن کبھی مسئلہ نہیں بنے۔'' 16ؔ

تہمینہ شمیم کے اس بیان کی تصدیق مبارک شمیم کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ چھکن کے بچپن اور لڑکپن کا بیان کرتے ہوئے انہوں نے چھکن کے مزاج اُن کی افتادِ طبع اور لباس کے ساتھ ساتھ اُن کی طبعی سنجیدگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

'' چھکن دوسرے لڑکوں کی طرح فسادی نہیں تھے۔ نہ شور شرابا کرتے تھے۔ خاموش خاموش رہتے تھے۔ لیکن بچوں کی ٹولی انہیں اپنا سردار مانتی تھی۔ دس بارہ سال کی عمر تک وہ محلے کے غریب بچوں کی طرح ننگے سر اور ننگے پیر گھومتے تھے۔ بے حد لاپروا اور لا ابالی تھے۔ عجیب حلیے میں رہتے تھے۔ کبھی ایک پائنچہ نیفے میں اڑسا ہوا' ایک زمیں سے رگڑتا ہوا۔ کبھی نیکر بنیائن پہنے گھومتے' شرارتیں بھی سنجیدگی سے کرتے تھے۔'' 17ؔ

چھکن کی شرارتوں میں سنجیدگی دراصل ایک طرف اُن کی فطری سنجیدگی کی بنا پر تھی دوسری طرف گھر کے ماحول کا اثر تھا جہاں دو بڑے بھائی اور والدِ محترم کے ساتھ ساتھ ماسٹر سری رام ہر لمحہ چھکن پر نیا حکم نئی پابندی لاگو

کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔ چھکن کا بچپن گھر کے ماحول میں دیکھئے کیسے بسر ہوا کرتا تھا۔ مبارک شمیم لکھتے ہیں:

''قمر رئیس کے ساتھ آنجہانی ماسٹر سری رام کا وہی رویہ قائم رہا جو ہم لولوں کے ساتھ تھا' چھکن بھی خوب پٹے اور مرغا بنائے گئے ہم دونوں بڑے بھائی بھی پٹتے پٹاتے اور مرغا بنائے جاتے تھے' عام طور پر بچوں کو ماں سے کم مگر باپ سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ چھکن کا حال بھی مختلف نہ تھا' مزید یہ کہ باپ کے ساتھ اب دو بڑے بھائیوں کا ڈر بھی ان کو لگ چکا تھا۔ جس طرح باپ کے سامنے جاتے جھجکتے تھے بھائیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی چور پاؤں گزرتے تھے۔ چھکن سامنے پڑے اور کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کردی گئی۔ چھکن فلاں کو بلا لاؤ' چلم بھر لاؤ' چائے بنوا لاؤ' جوتا اٹھا لاؤ وغیرہ بے شمار کام نکل آتے اور چھکن خاموشی سے حکم بجا لاتے۔ پڑھنے لکھنے کا زمانہ آیا تو چنگی کے مدرسے میں داخل کرادئے گئے' میاں صاحب زادے ٹکتے ٹکاتے' گھومتے گھماتے تعلیم گاہ کب پہنچتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا سوائے قمر رئیس اور ان کے کھلاڑی ساتھیوں کے' پتہ تو جب چلتا جب ماسٹر ممتاز اللہ خاں اپنے شاگرد کی خیر لینے کسی دن آجاتے اور مسلسل غیر حاضری کا سبب دریافت کرتے۔'' 18؎

چھکن کے اس رویہ سے تعلیم کی اہمیت سے باخبر اور علم کے شیدائی عبدالعلی خاں کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں وہ زیور تعلیم سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ غور وفکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ چھکن کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُسے گھر اور دوستوں سے دور کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے چھکن کو تعلیم کے لئے لکھنؤ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے بڑے بیٹے مبارک شمیم کو حکم دیا کہ اُسے لکھنؤ کے کسی اسکول میں شریک کروایا جائے۔ مبارک شمیم اپنے والد محترم کی فکر وتشویش کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں دوران تعلیم لکھنؤ میں تھا کہ والد صاحب کا خط پہنچا کہ چھکن سارا سارا دن واہی تباہی مچاتا پھرتا ہے' پڑھتا

ہے نہ پابندی سے اسکول جاتا ہے، برباد ہورہا ہے، گنوار لڑکوں میں دن رات رہتا ہے، اس کو لکھنؤ لے جاؤ اور کسی اسکول میں نام لکھادو۔ میں نے چھکن کو بلوالیا اور حسین آبادہائی اسکول میں داخلہ کرادیا۔ وہ سال چھکن کا لکھنؤ میں گزرا، امتحان بھی پاس ہوگئے تھے۔'' 19

پروفیسر غوث انصاری اطلاع دیتے ہیں کہ 1946ء (20) میں چھکن لکھنؤ آئے تھے اور گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول میں نویں درجہ میں داخلہ حاصل کیا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ معین منزل (21) مولوی گنج کے بالائی مکان میں دونوں بھائیوں نے سکونت اختیار کی تھی۔ نویں جماعت کے طالب علم مصاحب علی خاں کا تعارف کرواتے ہوئے پروفیسر غوث انصاری لکھتے ہیں:

'' مبارک بھائی جان رئیسانہ ٹھاٹھ اور بڑے کروفر کے انسان ہیں۔ شاعری کا ذوق تھا۔ تعلیم کا مشغلہ کم لیکن یار احباب کی محفلیں روزانہ شام کو اپنی رہائش گاہ پر جماتے۔ صدر نشین خود مبارک بھائی جان ہوتے۔ حقے تازہ کئے جاتے اور درباری انداز کی صحبت جمتی۔ اس کے برعکس چھوٹے بھائی ''مصاحب علی'' روایتی برادرخورد کی طرح بڑے بھائی کی بے تکلف محفلوں سے خارج از امکان رہتے۔ پھر بڑے بھائی سے بالکل مختلف تنہا پسند اور کم سخن تھے۔ ہماری اس پہلی ملاقات میں انہوں نے غالباً نپے تلے چند ہی جملے بولے تھے۔ میرے ہر سوال کا جواب مختصر ملا۔

کچھ عرصہ کے بعد دونوں بھائی مولوی گنج کے مختصر مکان سے پیر بخارا محلہ کے ایک کشادہ مکان میں منتقل ہوگئے۔ یہاں مبارک بھائی جان کے رئیسانہ کروفر میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ ذاتی سواری کے لئے تانگہ خریدا گیا۔ وسیع جگہ میں احباب کا حلقہ بھی وسیع تر ہوا۔ مگر مصاحب علی کی سیدھی سادی طرز رہائش اور سنجیدہ فکری میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہائی اسکول کا آخری سال تھا امتحان کی تیاری نے سنجیدگی میں

کچھ اور اضافہ کردیا۔'' 22ے

1948ء میں قمر رئیس نے میٹرک کا امتحان حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے کامیاب کیا اور وطن لوٹ آئے۔شاہجہاں پور میں انہوں نے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کی غرض سے گاندھی فیض عام کالج میں داخلہ لیا اور 1950ء میں امتحان کامیاب کیا۔

بچپن سے عہد جوانی میں قدم رکھتے ہوئے اُن کی علمی صلاحیت اور شخصیت کی خوبیاں نکھرنے لگی تھیں۔وہ اپنے احباب' اساتذہ اور علاقے میں کافی مقبول ہوگئے۔عام طور پر اُن کے ہم عمر لڑکے اُن سے دوستی کے خواہش مند رہتے تھے۔قمر رئیس وقت کے ساتھ سنجیدہ ہوتے چلے گئے اور اُن کی متانت' شائستگی' ذہانت اور خلوص میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد انہوں نے 1952ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی اے اور 1954ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ایل ایل بی پورا ہوتے ہی اپنے والد کی خواہش کے عین مطابق شاہجہاں پور میں ہی قمر رئیس نے وکالت شروع کردی لیکن یہ پیشہ اُن کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا تھا اور اسی لئے وہ اس میدان میں زیادہ دنوں تک جم نہیں پائے۔اُن کے پیشۂ وکالت پر روشنی ڈالتے ہوئے عصمت اللہ خاں یوں لکھتے ہیں:

> ''مصاحب علی خاں سے پہلے بھی میں نے بہت سے وکیل دیکھے تھے مگر اس سج دھج کاکاہے کو دیکھا تھا۔ ماتھے پر پڑی ہوئی زلفوں کی ایک آوارہ لٹ' چال میں ایک متوالی لہر' گنگناتے ہوئے سے ہونٹ اور نجانے خلا میں کیا چیز ڈھونڈتی ہوئی لڑکھڑاتی نگاہیں۔ مصاحب علی اور میرے ایک مشترکہ دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت موکل کا چہرہ مہرہ' چال چلن' بات چیت اور حسب نسب دیکھ کر مقدمہ ہاتھ میں لیتے ہیں لیکن جس زمانے میں شعر گوئی کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے تو کوئی نیا مقدمہ ہاتھ میں لینا تو درکنار پرانے مقدموں کی تاریخوں پر کچہری کا رُخ بھی نہیں کرتے۔ ایک

دوسرے دوست نے انکشاف کیا کہ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کوئی خاتون تھی اور خاصی جنت نگاہ واقع ہوئی تھی۔ عدالت میں اس خاتون کے خلاف پہلی مرتبہ پیش ہوئے تو بس ایک ہی نظر کافی تھی۔ حضرت اچھے خاصے تیار کئے ہوئے مقدمہ کی ساری بحث بھول گئے اور تقریباً جیتا جتایا مقدمہ کسی کے خال رخ کی قربان گاہ پر ''سمر قندوبخارا'' ہو کر رہ گیا۔ بھلا جمالیاتی دنیا کا یہ متوالا شہزادہ پیشہ وکالت میں کب تک ٹھہر سکتا تھا۔ وکالت مصاحب علی کا لاکھ خاندانی پیشہ ہو مگر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔'' 23ؔ

بعض ایسے بھی واقعے پیش آئے جن سے انہیں وکالت چھوڑ دینے کی ترغیب ملی ورنہ اُن کے لیے یہ عمر بھر کے گھاٹے کا سودا ہو جاتا۔ اُن کا خلوص اور وضع داری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ان کے لیے اپنے موکل سے فیس وصول کرنا ممکن نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مختصر سی مدت میں کئی ایک موکل حضرات سے نہ صرف یہ کہ فیس نہیں لی بلکہ ان کی حالت سے متاثر ہو کر خود اپنی طرف سے اسے کچھ دے کر رخصت کیا۔ ان حالات میں یہ بڑا فطری فیصلہ تھا کہ وہ پیشہ وکالت ترک کر کے اپنے میلان کے مطابق میدان عمل کا انتخاب کر لیتے۔ انٹرمیڈیٹ کے زمانے سے ہی وہ اردو ادب میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ صف اول کے معروف ادیبوں کے فن پاروں کو وہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ ان دنوں انہیں نثر کی بہ نسبت شاعری میں زیادہ لطف آتا تھا اور اپنے احباب کو اپنے شعر سنا کر داد وصول کیا کرتے تھے۔ قمر رئیس نے ''افسانہ نگاری'' سے بھی لو لگائی چنانچہ رتن سنگھ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ایل ایل بی کی تعلیم کے زمانے میں قمر رئیس نے افسانے بھی لکھے اقتباس دیکھئے:

''اسی عرصے میں قمر رئیس نے کچھ کہانیاں بھی لکھیں اور ڈاکٹر محمد حسن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھ ڈالے جنہیں کافی پسند کیا گیا۔ قمر رئیس کی ایک کہانی ''وہ چار'' آج بھی یاد ہے جس میں پولیس والے ایک اغواہ شدہ لڑکی سے کہتے ہیں گھبراؤ نہیں وہاں تو صرف چار ہی ہیں۔'' 24ؔ

اس زمانے میں قمر رئیس نے ادبی دنیا سے دلچسپی بڑھائی۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے سے قبل ہی انہوں نے اپنی شاعری کی بابت شناخت بنالی تھی۔ انہوں نے ایسی کہانیاں لکھیں جو عام قارئین کے علاوہ افسانہ نگاروں کو بھی متاثر کر گئیں اور ہمیشہ کے لئے ان کی یادداشت کا حصہ بن گئیں۔ 1956ء میں قمر رئیس نے ڈرامہ سے دلچسپی لی اور محمد حسن کے ''اردو تھیٹر'' میں معاونت کرنے لگے۔ حیدرآباد میں منعقدہ ڈرامہ فیسٹول میں اپنے اختراع کردہ ''مسیتا بیگ'' کے کردار کی ادائیگی اس مہارت سے کی کہ کردار کو اسم بامسمّیٰ بنادیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر محمد حسن کے مشورے پر قمر رئیس نے تنقیدی مضامین لکھنے کی جانب توجہ دی۔ عمر کے اس حصے میں وہ اپنے احباب میں ''افسانہ طرازی'' کے لئے خاصے مقبول ہو گئے تھے اور وہ دوستوں کی محفل میں اکثر من گھڑنت قصے کہانیاں سناتے تھے جن کے ہیرو وہ خود ہوتے تھے۔ یہ قصے اتنے دلچسپ ہوتے تھے کہ لوگ انہیں فرضی جانتے ہوئے بھی مزے لے لے کر سنتے اور انہیں داد دیتے تھے۔ قمر رئیس کے احباب کے مضامین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لڑکیوں سے ان کی شناسائی تھی اور بے شمار لڑکیاں ان کے قرب کی خواہش مند تھیں لیکن قمر رئیس کی شادی اس لڑکی سے ہوئی جسے انہوں نے اپنے وطن شاہجہاں پور ہی میں پسند کیا تھا۔ ایل ایل بی کرتے ہی قمر رئیس کی شادی رئیس بانو سے ہوئی جو آج بھی ان کی جیون ساتھی ہیں۔ وہ اپنی خوش مزاجی اور ضیافت کی وجہ سے قمر رئیس کے دوستوں میں بھی کافی مقبول ہیں۔ انہوں نے شروع سے اب تک قمر رئیس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے شوہر کو نہ صرف گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد و بے پرواہ کردیا بلکہ ان کے ادبی سفر میں بھی ان کی معاون و مددگار بنی رہیں۔ انہوں نے قمر رئیس کو اس بات کی کبھی فکر نہ ہونے دی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے، انہوں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ ان کے خاوند لکھتے پڑھتے رہیں، علمی سفر کرتے رہیں اور علمیت و شہرت کی بلندیوں کو چھوتے رہیں۔ کئی بار قمر رئیس کے سفر میں وہ بھی شریک رہتی ہیں لیکن اب قمر رئیس عموماً ان کے بغیر ہی سفر کرتے ہیں۔ ان کے گھر اگر کوئی مہمان آجائے تو وہ ان کی اچھی خاطر و مدارت کرتی ہیں۔ قمر رئیس کے اشارے یا مہمان سے پوچھنے کی منتظر نہیں رہتیں بلکہ اندر سے خود ہی چائے بھیج دیتی ہیں۔ اگر مہمان دیر تک بیٹھ جائے تو چائے دوبارہ آجاتی ہے۔ اگر وقت کھانے کا ہو تو عموماً مہمان سے کھانے کے لئے دریافت نہیں کیا جاتا بلکہ مسز رئیس صرف بتادیں گی کہ کھانا لگ گیا ہے اور

قمر رئیس صاحب مہمان سے اچانک یہ کہیں گے کہ ''آیئے بھائی جو ہے وہ حاضر ہے'' اور سیدھے ڈائیننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھ جائیں گے۔ غرضیکہ ازدواجی زندگی میں اس غیر معمولی میل جول اور باہمی تعلقات کی وجہ سے بھی قمر رئیس کو پوری آزادی سے علم وادب کے کاموں میں مصروف رہنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنا اصلی نام مصاحب علی خاں ترک کر کے کوئی قلمی نام اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اس میں اپنی بیگم کا نام شامل کیا۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ بیویاں اپنے شوہر کا نام اپنے نام کے ساتھ لاحقے کے طور پر استعمال کرتی ہیں لیکن قمر رئیس نے اپنی بیوی کے نام کا لاحقہ لگا کر ایک انفرادیت قائم کی۔ رئیس بانو سے قمر رئیس کی غیر معمولی وابستگی اور محبت کا یہ کھلا ثبوت اور واضح اظہار ہے۔

شاہجہاں پور میں وکالت کے دوران ہی قمر رئیس نے ناگپور یونیورسٹی سے 1955ء میں اردو میں ایم اے کر لیا۔ اردو ادب میں ان کی دلچسپی تو تھی ہی، ایم اے میں یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل ہونے سے ان کے حوصلے مزید بلند ہو گئے اور انہوں نے پی ایچ ڈی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں مسلمان لڑکوں کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی بلکہ اس علاقے میں اعلیٰ اور عمدہ تعلیم کی کسوٹی ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھی۔ قمر رئیس نے اسی تاریخی اہمیت کی حامل یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹریشن کروایا۔ ان کے نگراں شہرۂ آفاق صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی قرار پائے اور موضوع ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحیثیت ناول نگار'' طے ہوا۔ یہ موضوع قمر رئیس کی طبیعت سے کافی مطابقت رکھتا تھا۔ وہ پریم چند کے فلسفہ انسان دوستی کے زبردست قائل اور حامی تھے۔ پریم چند ترقی پسند تحریک کے سربراہوں میں شامل تھے اور قمر رئیس اس نظریے کے ایک سرگرم مبلغ کی حیثیت سے نمایاں ہو رہے تھے۔ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے موضوع پر کافی محنت کی اور ایک ایسا مقالہ تیار کیا جس کی مقبولیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ قمر صاحب نے 1959ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی برس ان کا مقالہ شائع ہو کر تفہیم پریم چند کے سلسلے میں ایک اہم کتاب کا درجہ حاصل کر گیا۔ قمر رئیس نے اس مقالے کی تیاری میں غیر معمولی استغراق سے کام لیا تھا۔ زبردست محنت اور انہماک سے وہ مسلسل مقالے کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ وہ پریم چند کے بے شمار عزیزوں سے ملے اور

اس وقت تک پریم چند پر جو کچھ بھی اردو ہندی میں لکھا گیا تھا اُس کا مطالعہ کیا۔ اقبال مجید نے قمر رئیس کے تحقیقی کام پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک منظر اسی طرح بیان کیا ہے:

"قمر بھائی ہاسٹل کے باہر ایک چھوٹے سے کمرے میں کرائے پر رہ رہے ہیں اور پرانی میز پر پریم چند سے متعلق پچاسوں کتابیں ڈھیر کئے بیڑی کے بنڈلوں اور جلی ہوئی ماچس کی تیلیوں اور فول اسکیپ سفید کاغذوں کی تحریر شدہ شیٹوں کے درمیان بیٹھے پریم چند کی اصلاحی کہانیوں میں غرق ہیں۔" 25ؔ

1959ء میں ہی قمر رئیس کو دہلی یونیورسٹی کے ایوننگ سیکشن میں لکچر رشپ کی ملازمت حاصل ہوئی۔ ملازمت کے ساتھ وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ یوں بھی قمر رئیس جیسی شخصیت کے لئے چھوٹے شہر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے کہ چھوٹے شہروں میں صلاحیتوں کے نکھرنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ ان دنوں دہلی ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ قمر رئیس تحریک کے کاموں میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ موثر طریقے سے شامل ہو گئے۔ لکچر رشپ سے ترقی کرتے ہوئے وہ 1968ء میں ریڈر اور 1984ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1976ء اور 1978ء میں تین تین سال کے لئے شعبے کی صدارت کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی۔ قمر رئیس 1992ء میں شعبہ اردو سے سبکدوش ہوئے لیکن انہیں یونیورسٹی نے پہلے دو اور پھر تین برس کی یعنی مجموعی طور پر پانچ برس کی توسیع دی۔ اس طرح شعبہ اردو سے 1997ء تک وابستہ رہے۔ وہ جب تک اور جس حیثیت سے بھی شعبے سے وابستہ رہے۔ انہوں نے شعبے کو متحرک اور کارکرد بنائے رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کے دور میں سمیناروں اور خطبات کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ شہر میں آنے والے دانشور مہمانوں کو شعبے میں مدعو کیا جاتا اور اُن سے طلبہ کو استفادے کا موقع فراہم کیا جاتا۔

قمر رئیس کی نگرانی میں 58 تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں جن میں 20 ایم فل اور 38 پی ایچ ڈی ہیں۔ قمر رئیس نے اپنے طلبا و طالبات کی نگرانی صرف مقالوں کی تکمیل تک محدود نہیں رکھی بلکہ انہوں نے اپنے طالب

علموں کو زندگی کے دوڑ میں سبقت لے جانے کا ہنر بھی سکھایا اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کے تقریباً سبھی طلبہ ملک کے مختلف دانش گاہوں اور دیگر اداروں سے وابستہ ہیں اور اپنے استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔

ترقی پسند تحریک ایک عظیم علمی، ادبی اور سماجی تحریک ہے۔ ہندوستان میں اس کا باقاعدہ آغاز 1936ء میں اس وقت ہوا جب لکھنؤ میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی صدارت شہرۂ آفاق ادیب منشی پریم چند نے کی۔ قمر رئیس نوجوانی کے زمانے سے ہی اس تحریک سے وابستہ رہے اور بالآخر 1973ء میں یہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری منتخب کر لئے گئے اور اب تک اس تحریک کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔

قمر رئیس نے بے شمار علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ہیں اور انعامات و اکرام سے نوازے گئے ہیں۔ وہ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے ترتیب و تدوین اور تراجم بھی کئے۔ بے شمار کتابوں میں ضخیم اور معلوماتی مقدمے بھی درج ہیں۔ صحافت اور شاعری سے بھی ان کی دلچسپی رہی۔ تاحال انہیں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ 1994ء، اعلی میرٹ ایوارڈ 1960ء، اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ 1968ء، امتیاز میر ایوارڈ 1981ء، بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ 1981ء، ہندی اردو ادب ایوارڈ 1984ء، نیشنل لکچرر آف اردو۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن 86-1985ء، سید احتشام حسین ایوارڈ 1987ء، پریم چند ایوارڈ 1989ء، نیاز فتح پوری ایوارڈ 1989ء اور بھارتیہ انو واد پریشد ایوارڈ 1994ء سے نوازا گیا ہے۔ قمر رئیس تحقیقی و اشاعتی کمیٹی، اردو اکیڈمی دہلی (1987ء) کے چیرمین بھی رہے۔ انہیں انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی دہلی (1978ء تا 1986ء) کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ یہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین، کل ہند انجمن اساتذہ اردو، ہندی، کل ہند جشن فیض کمیٹی (دہلی) لکھنؤ، بھوپال، الہ آباد اور رانچی، انڈو ازبیک فرینڈ شپ سوسائٹی دہلی، نیاز حیدر میموریل سوسائٹی۔ دہلی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ انہیں یونیورسٹی اساتذہ وفد برائے جامعات ہند اور دیگر تعلیمی ادارے پاکستان، ترقی پسند مصنّفین (ہند) کے نیشنل فیڈریشن کی کانفرنس جبل پور، پریم چند صد سالہ تقریبات نیشنل کمیٹی کے سکریٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار قومی اور بین الاقوامی سطح کی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت اور خطبات کا موقع بھی ملا ہے۔ انہوں نے سوویت روس، امریکہ، انگلستان، کناڈا، پولینڈ، پرتگال، افغانستان، پاکستان اور دوبئی وغیرہ کے سفر کئے ہیں۔

قمر رئیس کی زندگی میں ازبکستان کو خاصی اہمیت حاصل ہے جہاں انہوں نے تقریباً بارہ برس گزارے ہیں۔ یوں تو انہوں نے روسی ممالک کے متعدد سفر کئے لیکن ازبکستان میں رہ کر خدمات انجام دینے کے لئے وہ وہاں چار مرتبہ گئے۔ تین بار ستمبر 1962ء سے جون 1966ء تک، ستمبر 1970ء سے جون 1972ء تک اور ستمبر 1982ء سے جون 1983ء تک وہ اسٹیٹ یونیورسٹی تاشقند میں مہمان پروفیسر رہے جبکہ 1997ء سے 2001ء تک وہ انڈین کلچرل سنٹر سفارت خانہ ہند تاشقند میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ اس مدت میں انہوں نے وہاں کی زبان سیکھی اور متعدد شعرا کے کلام کے ترجمے کئے۔ انہوں نے ازبکستان اور وہاں کی تہذیب سے متعلق کئی مضامین بھی قلمبند کئے۔ ازبکستان میں قمر صاحب کے بے شمار دوست اور شاگرد ہیں جو ان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ازبکستان میں اگر کوئی اردو جاننے والا ہے اور وہ قمر رئیس کو نہیں جانتا ہے تو آپ کو اس کی اردو دانی پر شک کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

مئی 2001ء میں اکیڈمی آف فائن آرٹس، ازبکستان نے قمر رئیس کو فائن آرٹس میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ جون 2001ء میں تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز نے ادب میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ اور جب وہ تاشقند سے ہندوستان واپس آئے تو مرکزی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر کئے گئے۔

ازبکستان کی طرح ہندوستان میں بھی قمر رئیس اپنے شاگردوں اور دوستوں میں اسی طرح سے مقبول ہیں۔ 60 سال کی عمر تک مستقل ملازمت، پانچ برسوں کی توسیع اور پھر سبکدوشی کے بعد مزید 5 برس کلچرل سنٹر تاشقند کی ڈائرکٹرشپ اور اُس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ سے وابستہ رہنے کے بعد انہوں نے دفتری زندگی سے ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ البتہ انہوں نے لکھنے پڑھنے اور علم و ادب کی سرگرمیوں سے ریٹائرمنٹ نہیں لی ہے۔ ان کا علمی سفر ہنوز جاری ہے۔ چنانچہ ترقی پسند نظریات کی اشاعت کی غرض سے انہوں نے ''آب وگل'' کے نام سے رسالہ کی اشاعت عمل میں لائی ہے جس کا پہلا شمارہ جنوری 2004ء میں شائع ہوا۔ ان کی خود اعتمادی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر جاری رہے گا۔ بہت دور تک! بہت دیر تک!

شخصیت

قمر رئیس دلنواز شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے اچھے دوست، اعزہ کے وضع دار عزیز، طلبا کے شفیق استاذ، بیوی سے بے حد محبت کرنے والے خاوند، بیٹی کے شفیق والد، اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے معاون و رفیق اور ان سب سے بڑھ کر پورے بنی نوع انسان کے لئے جذبۂ اخلاص و ہمدردی رکھنے والی شخصیت ہیں۔ انہیں ہر جگہ اور ہر حلقے میں مقبولیت حاصل ہے اور وہ جہاں بھی رہے ہر دل عزیز بن کر رہے۔

شخصیت انگریزی لفظ Personality کا اردو متبادل ہے۔ یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظ Persona سے مشتق ہے جس کے معنی بناوٹی روپ کے ہیں۔ قدیم یونانی ڈراموں میں اداکار اپنے چہرے پر مکھوٹا لگایا کرتے تھے جسے Persona ہی کہا جاتا تھا۔ اب بھی ہمارے ملک میں جو تاریخی و تہذیبی ڈرامے یا لیلائیں پیش کی جاتی ہیں ان میں کسی مشہور تاریخی شخصیت کا کردار پیش کرنے کے لئے اداکار اپنے چہرے پر میک اپ کرنے کے علاوہ مکھوٹے (خصوصاً جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں) بھی لگاتے ہیں۔ یعنی اداکار اپنے چہرے پر سرخی و سیاہی مل کر مخصوص کردار سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر اس مخصوص کردار کی تسلیم شدہ صورت والے مکھوٹے کو اپنے چہرے کے اوپر لگا لیتے ہیں۔ یہ روایت قدیم یونانی ڈراموں سے ہی چلی آتی ہے جس کے لئے لفظ Persona کا استعمال ہوتا تھا۔ پتہ یہ چلا ہے کہ انسان کے Persona ہی سے اس کی Personality کا تعین ہوتا ہے یعنی آپ جو نظر آتے ہیں، آپ جو کچھ محسوس ہوتے ہیں، آپ خود کو جو ظاہر کرتے ہیں بادی النظر میں وہی آپ کی شخصیت ہوتی ہے۔ شخصیت کے مطالعے میں انسان کا مزاج، افسردگی، حق پسندی، ایمانداری، مستقل مزاجی، جذباتی استحکام، رواداری اور غور و فکر جیسی صفات بھی شامل ہوتی ہیں۔

دراصل کسی شخص کے ظاہری اور باطنی کردار اور رویوں کو اس کی شخصیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اندرونی

رویہ ہی اس شخصیت کا Persona ہوتا ہے۔اس کی شکل وصورت' بات چیت' طور طریقے اور زندگی میں دوسروں پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی کی وجہ سے اس کی شناخت بنتی ہے۔شخصیت کے بارے میں ماہرین نفسیات نے متعدد آراء پیش کی ہیں۔جس میں اختلاف کے باوجود تمام نقاط نظر کی بنیادی باتیں ملتی جلتی اور یکساں ہیں۔مثلاً ظاہری اور باطنی رویے کا نام ہی شخصیت ہے۔شخصیت کی تعمیر میں فرد کے آباواجداد' بچپن کا ماحول' تہذیب ومعاشرت اور بدلتے ہوئے حالات نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی خصوصیات میں بھی بتدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔جسمانی بناوٹ کو بھی شخصیت سازی کا ایک اہم پہلو تسلیم کیا گیا ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ انسان کے طور طریقوں پر اس کی جسمانی ساخت کا بھی بڑا اثر پڑتا ہے۔

شخصیت سے متعلق بعض ماہرین نفسیات کے مشہور مقولے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔جی ایم البورٹ نے کہا ہے کہ ''شخصیت کسی فرد کے نفسیاتی وجسمانی نظام کے اندر ایسی متحرک تنظیم ہے جو اس کے ماحول سے اس کی مطابقت کا تعین کرتی ہے۔''

Warren and Charmichael شخصیت کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''کسی شخص کی تشکیل کے کسی مرحلے میں اس کی پوری ذہنی تنظیم کو شخصیت کہتے ہیں۔اس میں انسانی کردار' ذکاوت' مزاج' ہنر اخلاقیات جیسے ہر مرحلے اور روز وشب میں پنپنے والے ہر رویے کا احاطہ ہوجاتا ہے۔''

WATSON کہتا ہے ''شخصیت ان سرگرمیوں کا مجموعہ ہے جن کا مشاہدہ بہت دنوں تک کیا جائے اور جن سے قابل اعتبار اطلاعات فراہم ہوسکتی ہوں۔ بالفاظ دیگر شخصیت ہماری عادات کے نظام کی آخری شکل ہے۔''

SHERMAN کا قول ہے ''شخصیت کسی فرد کا امتیازی برتاؤ ہوتا ہے۔''

ماہرین نفسیات کے درمیان شخصیت کے تعلق سے یہ بحث بھی چلتی رہی ہے کہ انسان کی شخصیت اس کے ظاہر کو قرار دیا جائے یا باطن کو لیکن بالآخر ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کے ظاہری وباطنی دونوں رویے کو مجموعی طور پر اس کی شخصیت قرار دیا جائے گا۔ہمارے سماج میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اپنی زندگیوں میں بناوٹ اور تصنع

کو اپنا وطیرۂ امتیاز بنا لیتے ہیں۔ وہ جب کسی سے ملتے ہیں تو انداز کچھ اور ہوتا ہے اور جب غائبانے میں گفتگو کرتے ہیں تو رائے بدل جاتی ہے۔ بعض لوگ کسی حلقے میں نرم مزاج ہوتے ہیں تو دوسرے حلقے میں سخت مزاج۔ وقت اور حالات کے اعتبار سے شخصیت میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض شعرا کی مثال بطور خاص دی جاسکتی ہے۔ جیسے ریاض خیرآبادی نے عمر بھر خمریات کی شاعری کی اور اپنے کلام میں رند، ساغر، شراب اور ساقی کی باتیں کرتے رہے لیکن ذاتی زندگی میں متقی و پرہیزگار واقع ہوئے تھے۔ ایسے بھی شعرا ہیں جنہوں نے صوفیانہ کلام پیش کیا۔ اپنے کلام میں زہد، تقوی اور روحانیت کی باتیں کیں لیکن ان کی اصل زندگی میں شراب کے بغیر شام کا تصور ہی بے معنی تھا۔ اختر الایمان نے قرآن کا منظوم ترجمہ کرڈالا لیکن یہ ان کا نجی معاملہ تھا کہ وہ ''شوق'' بھی فرماتے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ کوئی ضروری نہیں کہ انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو۔ اس لئے شخصیت کے تجزیے کے لئے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنی ضروری ہے۔

اسی طرح جسمانی ساخت کا معاملہ ہے۔ بعض ماہرین نفسیات نے شخصیت کو جسمانی ساخت کے اعتبار سے تین حصوں Ectomorphy, Edomorphy اور Mesomorphy میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے کے لوگ مضبوط جسم والے اور خوش خوراک ہوتے ہیں۔ وہ اچھی نیند سوتے ہیں، دوستوں پر اعتبار کرتے ہیں اور اپنے عزیزوں سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ دوسرے زمرے کے لوگ طویل قامت ہوتے ہیں۔ وہ دماغی کام کرنا پسند کرتے ہیں مگر تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ تیسرے زمرے کے لوگ قدرے موٹے ہوتے ہیں اور اپنی عمر سے زیادہ عمر رسیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض ماہرین نفسیات نے جسمانی بناوٹ کی بنیاد پر لوگوں کو دو گروپ Cycloid اور Schizoid میں بانٹا ہے۔ پہلے گروپ کے لوگ فربہ ہوتے ہیں اور ان میں مادیت پرستی، معاشرتی احساس اور ملنساری کی صفات ہوتی ہیں جبکہ دوسرے گروپ کے لوگ دبلے پتلے ہوتے ہیں۔ ان کے مزاج میں تنہائی پسندی اور خودسری ہوتی ہے۔

اب آیئے علم نفسیات کے مطابق شخصیت کی مذکورہ بالا توضیحات کی روشنی میں قمر رئیس کی شخصیت کا مطالعہ کریں۔ نگار عظیم کے مطابق قمر رئیس کے خدوخال کچھ اس طرح ہیں:

" دراز قد، متناسب اعضا، دلکش خدوخال، مسکرانے کا انداز بڑا پرکشش، ماتھے پر پڑی ہوئی بالوں کی ایک باغی لٹ جسے وہ ہر دو منٹ کے وقفے سے پیچھے کرتے ہیں اور وہ ہر تیسرے منٹ اپنی جگہ واپس آجاتی ہے کہ گویا پیشانی کو چومتے رہنا ہی اس کا واحد مقصد ہو۔ مزاج میں خوش اطواری، طبیعت میں خودداری، چال میں خود اعتمادی، ظاہر وباطن یکساں، سیدھے سچے، بے غرض محسن، یہ ہیں فن شناس تنقید نگار پروفیسر قمر رئیس۔" 26

جسمانی اعتبار سے ان کی شخصیت Edomorphy اور Cycloid کے ذیل میں آتی ہے جس زمرے کے لوگ مضبوط جسمانی ساخت اور قدرے فربہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے افراد خانہ سے محبت کرتے ہیں، احباب پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان میں معاشرتی احساس اور ملنساری کی صفات پائی جاتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ قمر رئیس بے انتہا لگاؤ اور وابستگی رکھنے اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ سب سے خوش مزاجی بلکہ خندہ پیشانی سے ملنا اور لوگوں کے کام آنا ان کے مزاج میں شامل ہے۔ خارجی اور داخلی صفات کے زاویے سے اگر ان کی شخصیت پر نظر ڈالی جائے تو بھی ان کی یہی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ قمر رئیس کی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے ان کے ابتدائی دن، شادی، وکالت، علی گڑھ کا دور، دہلی یونیورسٹی کا دور، احباب سے تعلق، طلبہ اور خاص طور پر ریسرچ اسکالروں کے ساتھ ان کا رویہ، ترقی پسند تحریک سے وابستگی، ازبکستان کے ادوار وغیرہ پر نگاہ ڈالنی ہوگی۔

قمر رئیس کا بچپن ایک مشترکہ خاندان کے رکن کی حیثیت سے دادا کے مکان، واقع آبائی وطن شاہجہاں پور میں گزرا۔ وہ ایک پُر فضا مقام تھا۔ جلد ہی وہ اپنے والد کے علاحدہ مکان میں منتقل ہو گئے۔ اہل خاندان بہت زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر والد وکیل تھے۔ پڑھے لکھوں سے واسطہ تھا۔ معززان شہر سے شناسائی تھی۔ نانا سید حبیب الحق حبیب عربی وفارسی کے عالم تھے۔ ان کے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بھائی مبارک شمیم لکھتے ہیں:

" چھکن کسی کا دل دکھانا تو جانتے ہی نہ تھے۔ ہم لوگ اپنے تھے، کسی غیر کے ساتھ بھی ان کا رویہ برانہ تھا۔ لڑنے جھگڑنے سے بھی انہیں سروکار نہ تھا۔ .... چھکن دوسرے

لڑکوں کی طرح فسادی نہیں تھے۔ نہ شور شرابا کرتے تھے۔ خاموش خاموش رہتے تھے۔ لیکن بچوں کی ٹولی انہیں اپنا سردار مانتی تھی۔ دس بارہ سال کی عمر تک وہ محلے کے غریب بچوں کی طرح ننگے سر اور ننگے پیر گھومتے تھے۔ بے حد لاپرواہ اور لاابالی تھے۔ عجیب حلیے میں رہتے تھے۔ کبھی ایک پائنچہ نیفے میں اڑسا ہوا' ایک زمین سے رگڑتا ہوا۔ کبھی نیکر بنیائن پہنے گھومتے۔ شرارتیں بھی بڑی سنجیدگی سے کرتے تھے۔'' 27

قمر رئیس کے گاؤں میں گزارے ہوئے بچپن کا دور ختم ہوا تو وہ اسکول میں اور پھر شاہجہاں پور ہی میں گاندھی فیض عام انٹر کالج میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بی اے کی تعلیم آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔

قمر رئیس کی شخصیت اور کردار کو سمجھنے کے لئے ان کے ایک دوست سید احمد سحر کا یہ بیان بہت مددگار ہوگا:

'' قمر رئیس سے میری دوستی کالج کے زمانہ میں ہوئی۔ وہ مجھ سے سینئر تھے اور خاصے سنجیدہ رہتے تھے۔ کالج میں بزم ادب کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ شعر کہتے تھے اور مقامی مشاعروں کے علاوہ قریب کے شہروں کے طرحی مشاعروں می بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا دائرہ الگ تھا۔ پارٹی کے دفتر میں پابندی سے جاتے تھے لیکن اس کے بارے میں ہمیں کم ہی بتاتے تھے۔ لگتا تھا ان کے کردار کی کئی تہیں ہیں۔ ایک طرف شعر و شاعری' دوسری طرف سیاست اور تیسری جانب وہ دوستوں کی محفلوں اور صحبتوں میں بڑے کھلنڈرے بن جاتے تھے۔ جی کھول کر ہنستے تھے۔ چھل کپٹ اور دنیا داری کی باتیں قمر رئیس شائد اب تک نہیں سیکھ پائے نہ اس وقت جانتے تھے۔ جو کہنا ہوتا صاف اور سامنے کہہ دیتے یا خاموش ہوجاتے۔'' 28

قمر رئیس نے اپنے والد کی خواہش کے مطابق لکھنؤ سے وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور پھر اسے پیشے کے طور پر اختیار کرلیا۔ وہ سیاہ کوٹ میں ملبوس ہوگئے اور شاہجہاں پور کی عدالت میں پریکٹس بھی کرنے لگے لیکن معاملہ

یہ تھا کہ قمر رئیس کے مزاج سے یہ پیشہ قطعی طور پر میل نہیں کھاتا تھا۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش، مجبور اور پریشان حال لوگوں سے اپنی مقررہ فیس کی وصولی اور وکالت کے پیشے سے جڑی ہوئی اس طرح کی تمام سرگرمیاں ان کی پریشانی کا سبب تھیں۔ ان کی شاعرانہ طبیعت جمالیاتی حسّیات سے سرشار تھی۔ وہ حسن انسانی ہو کہ مناظر قدرت سب کے دلدادہ تھے۔ شرافت نفسی ان کا خاصہ تھی۔ ان حالات میں ان کے لئے اس پیشے کو جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ مبارک شمیم لکھتے ہیں:

> '' وکالت میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ کہتے وکیل غریبوں کو لوٹتے ہیں۔ ان کی مصیبتوں سے بے جا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک بار کچہری سے آ کر مجھے بتانے لگے۔ آج ایک ضعیف عورت ابا کے پاس آئی اور اپنی مصیبت بیان کی۔ معمولی کیس تھا ابا نے اس کو میرے سپرد کر دیا۔ میں نے اس کی بپتا سن کر محرر سے مقدمہ داخل کرنے کو کہا۔ تحریر اور ٹکٹوں کے لئے جب عورت سے رقم طلب کی تو وہ رونے لگی۔ مجھے اس پر ترس آ گیا اور ٹکٹوں وغیرہ کی رقم میں نے اپنے پاس سے محرر کو دے دی۔ شائد ابا کو یہ اچھا نہیں لگا لیکن میں کیا کروں؟''29ؔ

یہ محض ایک واقعہ ہے مگر اس سے ان کے میلان طبع کا پتہ چل جاتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے وکالت کا پیشہ ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ انہیں زیادہ حوصلہ اس وقت ملا جب انہوں نے ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ اردو کا امتحان دیا اور اس میں انہوں نے اول پوزیشن سے کامیابی حاصل کی۔ ایم اے کا نتیجہ آتے ہی انہوں نے وکالت کو خیر آباد کہا اور پی ایچ ڈی کرنے کے لئے علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ علی گڑھ کا وہ دور اردو زبان و ادب کے لئے ایک سنہرا دور تھا۔ بے شمار ادیب و شعرا کی موجودگی سے وہاں علمی و ادبی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ قمر رئیس اپنے تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ ان سرگرمیوں میں بھی شریک ہونے لگے۔ اقبال مجید جو قمر رئیس کے لکھنؤ اور علی گڑھ زمانے کے ساتھی ہیں، نے اپنے مضمون میں اس زمانے کے علی گڑھ اور قمر رئیس کے کردار پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> '' آئیے آپ کو کچھ دیر کے لئے سن 58-57ء کے علی گڑھ لے چلیں۔ آل احمد سرور صاحب اردو ڈپارٹمنٹ کے صدر ہیں،

'ہماری زبان' کی باگ ڈور بھی سنبھالے ہیں اور غالب ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کام بھی۔ سرسید ہال کے پرووسٹ بھی ہیں اور ادبی حلقوں کی رونق بھی' ڈاکٹر محمد حسن اردو شعبے سے وابستہ ہیں' خلیل الرحمن اعظمی' شہریار' شاہد مہدی' احمد جمال پاشا' عثمان غنی' کاظم علی خاں (محقق) رضوان حسین' محمود الہی سبھی موجود ہیں۔ خلیل الرحمن صاحب کو چھوڑ کر باقی سب ہی برائے تعلیم یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ میں چند روز قبل ہی علی گڑھ محمد حسن صاحب کے بھیجے گئے تار پر داخلہ لینے پہنچا ہوں .... قمر بھائی نے اپنے پاس ہی ٹھہرایا۔ سرور صاحب نے ازراہ محبت' ہماری زبان' میں ایک ماہ کے لئے امداد کا ایک باعزت بہانہ نکال کر کچھ رقم فراہم کردی۔ قمر بھائی اپنے تمبولی کے پاس لے گئے ایک ڈبیانمبر Ten سگریٹ روزانہ مجھے مہیا کرنے کے لئے اسے پابند کیا' اپنے دھوبی سے میرے کپڑے دھلوائے' اپنے باربر سے بال کٹوائے یہ سارے کام وہ اپنی جیب سے کرتے۔ پھر جب علی گڑھ کے مچھروں نے ملیریا کا بیش بہا تحفہ مجھے مرحمت فرمایا تو انہوں نے میری تیمارداری کی۔''30

علی گڑھ سے دہلی آنے کے بعد شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستگی کے ساتھ ساتھ قمر رئیس کی دیگر علمی سرگرمیوں میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ شاہجہاں پور کے بعد دہلی ہی قمر رئیس کا وطن بن گیا اور یہیں سے انہوں نے تمام تر علمی معرکے سر کیے۔ ان کی باضابطہ عملی زندگی جس سے آج ان کی پہچان ہے' ان دنوں شروع ہوئی جب 1959ء میں وہ لکچرر بن کر دہلی آئے۔ ان کی اس وقت سے لے کر اب تک زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ دو جو انہوں نے استاد شعبہ اردو کی حیثیت سے دہلی میں گزارے' دوسرا حصہ وہ ہوسکتا ہے جو وقت انہوں نے ترقی پسند تحریک کے فروغ اور اس کے مقاصد کی تشہیر و تبلیغ میں صرف کیے۔ تیسرا حصہ اسے قرار دیا جاسکتا ہے جب انہوں نے ازبکستان میں مختلف حیثیتوں سے ذمہ داریاں انجام دیں۔ گرچہ یہ تینوں کام زمانی اعتبار سے

خلط ملط بھی ہیں لیکن یہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر بالکل مکمل اور قدرے مختلف کام ہیں۔

قمر رئیس 38 برسوں تک شعبۂ اردو سے لکچرر، ریڈر اور پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ انہوں نے درجنوں اساتذہ کے ساتھ پڑھایا۔ نجانے کتنے طلبا سے سابقہ رہا۔ پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کتنی ہی انتظامی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں یا ترتیب دیں۔ 58 ایم فل پی ایچ ڈی کے اسکالروں کی ترتیب ونگرانی کی۔ اس پورے دور میں ان کی شخصیت ہمیشہ صاف شفاف رہی۔ بعض موقعوں پر نظریاتی اختلاف ضرور ہوا۔ ان کے احباب اور سینئر طلبا کے مطابق ترقی پسند تحریک کے مخالفین سے معرکہ آرائی بھی ہوتی رہی لیکن ان کی شرافت اور انسان دوستی سے ان کا بنیادی رشتہ کبھی مجروح نہیں ہوا۔ ممتاز محقق اور قمر رئیس کے دہلی یونیورسٹی کے رفیق کار ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ”پچھلے بیس پچیس برس میں دہلی کی ادبی بساط پر جو شطرنج کھیلی جاتی رہی قمر صاحب اس کے ناکام کھلاڑی بھی نہیں قرار دئے جاسکتے مگر انہوں نے جام وصہبا کے اس کھیل میں علم وادب سے اپنی وفاداریوں کو باقی رکھا اور ادبی سیاست کا زنجیری بننا کبھی پسند نہ کیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ قمر رئیس ترقی پسند زاویہ نگاہ کے آدمی ہیں مگر ان کا انداز نظر کبھی اس نظریہ کی بے لچک حدود کا اس حد تک پابند نہیں رہا کہ وہ اس کے ماسوا ادب و زندگی کی ہر قدر سے انکار کردیں، شعر وادب کے لئے تصوف سے لے کر ترقی پسندی تک وہ روح ادب کے قدر شناس رہے ان میں ادبی کارکردگی اور ان کی علمی صلاحیت کو بیش از بیش دخل رہا۔ قمر صاحب نے اپنے یہاں خوئے انتقام جیسے کسی رویے کو آگے نہیں بڑھنے دیا وہ انتقام لینے کے نہیں ہنس کر معاف کردینے کے قائل ہیں۔“ 31

قمر رئیس کی انہیں خوبیوں کو ان کی ایک سینئر طالبہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے اس طرح بیان کیا:

> ”قمر رئیس صاحب کے افکار ونظریات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ عدل ومساوات پر مبنی اشتراکی نظام کے

حامی ہیں اور اسے انسان کے دکھ درد کا مداوا سمجھتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ ایک جدید سائنسی ذہن اور افہام وتفہیم کا ایک عقلی زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے نظریات، عقائد اور ان کا کردار ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ ان کے سارے احباب اور طالب علم جانتے ہیں کہ ان کے کردار، گفتار اور عمل میں ایسے تضاد یا پیچ نہیں کہ ان کو دوہرے کردار کا آدمی کہا جائے۔ وہ اس دور کے دوسرے لوگوں کی طرح مختلف چہرے بھی نہیں رکھتے۔ منافقت اور غیبت ان کا شیوہ نہیں۔ ان کی محفل میں بیٹھئے تو کسی کی برائی یا کسی پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے صرف علم وادب کی باتیں کریں گے۔'' 32

قمر رئیس کا رویہ اپنے طالب علموں سے بے حد مخلصانہ ومشفقانہ رہا ہے۔ شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے سابق طالب علموں کا کہنا ہے کہ عالمی سطح پر مقبولیت اور پھر اسی نہج کی مصروفیت کے باوجود وہ کلاسز ترک نہیں کرتے تھے۔ انھیں کتنی ہی مصروفیت رہے، کلاس لینے کے لئے آجایا کرتے تھے۔ ایسا اکثر ہوا کہ انہوں نے ٹائم ٹیبل میں دئے گئے اوقات کی پابندی نہیں کی لیکن طلبہ کو کلاسز کا نقصان نہیں ہونے دیا۔ اسی دن وقت بدل کر یا دوسرے تیسرے دن وقت نکال کر کلاس لے لیتے تھے۔ کلاس میں طلبہ کے ساتھ بہت بے تکلف رہتے اور دوستانہ ماحول میں پڑھاتے تھے۔ ان کے کلاس میں آتے ہی ''باادب باملاحظہ'' والی احتیاط یا خوف نہیں بلکہ خوشگوار کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی کیفیت نے طلبہ کے دلوں میں ان سے عقیدت اور محبت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ ان کی ایک طالبہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں:

''کلاس روم ہو یا کلاس روم سے باہر طلباء کے ساتھ استاد کا تعلق نہایت بے تکلفانہ اور مخلصانہ ہوتا ہے۔ وہ لکچر دیتے یا گفتگو کرتے ہوئے لطیفے اور چٹکلے بھی سناتے ہیں، حسن وعشق کی نفسیات بھی بتاتے ہیں، شعر وادب کی تشریح وتعبیر میں ان کا رویہ ہمیشہ بہت شگفتہ، وسیع اور پہلو دار ہوتا ہے۔ اس طرح کے طلبا کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور جب محفل

برخاست ہوتی ہے تو ہمیشہ ہم سوچتے ہیں کہ کچھ لے کر اٹھے ہیں، کچھ بدل گئے ہیں۔" 33

ریسرچ اسکالروں کے ساتھ بھی ان کا بڑا غیر معمولی رویہ رہا ہے اور انہیں ایک پسندیدہ نگراں کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے دور میں جب بھی ایم فل یا پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کا وقت آتا طلبا و طالبات کی بڑی تعداد ان کے تحت رجسٹریشن کرانے کی خواہش مند ہوتی تھی۔ کتنے ہی طلبا پہلے ہی سے ان سے ربط پیدا کرنا شروع کر دیتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ہر سال محدود تعداد ہی کو وہ قبول کرتے تھے۔ ایک بار جب رجسٹریشن ہو جائے تو پھر اس طالب علم کو قمر رئیس کی طرف سے تمام تر رہنمائی، تربیت اور مواد وغیرہ ملنا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ مہینوں طالب علم کو اس کے موضوع پر لکچر دیتے تھے۔ شعبے میں بھی اور اکثر اپنے گھر پر بلا کر۔ اتوار یا دیگر چھٹی کے دنوں میں اگر انہیں کہیں جانا نہیں ہو تو کئی ریسرچ اسکالر ان سے وقت طے کر کے ان کے گھر پہنچتے تھے۔ ان اسکالروں کی چائے وغیرہ سے ضیافت بھی ہوتی رہتی تھی اور گھنٹوں گھنٹوں وہ طلبا کے مسائل حل کرتے رہتے تھے۔ اسکالروں کو اپنی نجی لائبریری سے کتابیں بھی دیتے تھے۔ بعض اسکالروں نے ان کی نادر قسم کی کتابیں واپس نہیں کیں۔ اکثر اس کی شکایت کرتے اور کہتے کہ اب کسی کو کتاب نہیں دوں گا۔ جسے پڑھنا ہے یہیں پڑھ لے یا پھر یہیں کہیں زیراکس کرالے مگر وہ اپنے اس عہد پر کبھی قائم نہیں رہ پائے۔ ہر دور میں ان کے دو چار اسکالر بہت قریب ہوا کرتے تھے۔ وہ انہیں اپنی کتاب دے دیتے تھے اور پھر انہیں میں سے کسی طالب علم سے ان کی کتاب "گم" ہو جاتی تھی۔ وہ پھر توبہ کرتے کہ اب کسی کو کتاب نہ دوں گا۔ اور پھر دے دیتے............ یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ قمر رئیس کی رہائش دہلی یونیورسٹی کیمپس اور قدیم شہر دہلی سے کافی دور مشرقی علاقے میں واقع ایک عالیشان کالونی دویک وہار میں ہے۔ طلبا عموماً بسوں سے ان کے یہاں جایا کرتے تھے۔ اس ضمن میں قمر صاحب اکثر ایسا طے کرتے تھے کہ طالب علم کو وہ ایک طرف سے اپنی کار میں لفٹ دیتے تھے۔ یعنی اگر کیمپس سے گھر جا رہے ہیں اور کسی طالب علم کو ان کے یہاں پہنچنا ہے تو وہ اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے۔ یا انہیں اگر چھٹی کے دن شام میں شہر کی طرف آنا ہے تو وہ اپنے طلبہ کو اس مناسبت سے اپنے یہاں بلاتے تھے کہ بات چیت یا جو بھی کام ہو وہ مکمل ہونے کے بعد ان کے اپنے گھر سے

چلنے کا وقت ہو جائے اور وہ اسے اپنے ساتھ شہر کے کسی موزوں مقام پر drop کر دیں۔طلبہ کے ساتھ اس رویے سے ان کی شرافت نفسی اور طلبہ سے ان کی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مقالوں کی اصلاح کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ بڑا حوصلہ افزا ہوا کرتا تھا۔ڈاکٹر سلمٰی شاہین لکھتی ہیں:

> ''وہ کسی طالب علم پر اپنے نظریات نہیں ٹھونستے۔ صرف اس پر اصرار کرتے ہیں کہ طالب علم اپنے ذہن کے دروازے بند نہ کرے۔ ہر طرح کے خیالات اور نظریات کے لئے اپنے دل ودماغ کی کھڑکیوں کو کھلا رکھے۔ تاکہ گھٹے گھٹے بند ماحول کے بجائے ایک آزاد اور کھلی فضا میں طلباء کے ذہن اور کردار کا نشوونما ہوسکے۔''34

اگر انہیں کبھی ریسرچ اسکالر کی کسی بات کو رد کرنا ہوتا تو وہ کبھی بھی راست طور پر نہیں کہتے تھے اور نہ ہی اس کے لکھے کو یکسر کاٹ دیتے۔وہ اس بات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے کہ طلبا کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔بہت گھما پھرا کر، ادھر اُدھر کی باتیں کر کے، بعض دوسرے طالب علم کی مثال دے کر، کسی کتاب، کسی مصنف، کسی مضمون کا ذکر کر کے اپنے طالب علم کو اس بات کا احساس دلاتے تھے کہ انہیں یہ متن یا مواد پسند نہیں آ رہا ہے اور وہ اس میں تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔طالب علم ان کا منشا سمجھ جاتے تھے اور استاد کے اشاروں کے مطابق اس میں تبدیلی کر لیا کرتے تھے۔اصلاح کے سلسلے میں ان کا یہ بھی طریقہ رہا ہے کہ وہ طالب علم کی موجودگی میں ہی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ بعض اوقات حالات کے سبب وہ مقالے کا کوئی باب خود ہی چیک کر کے واپس کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے لیکن ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ جب وہ مقالہ دیکھ رہے ہوں تو اسکالر وہاں موجود رہے تا کہ کسی بھی غلطی یا کمی پر وہیں تبادلہ خیال کر لیا جائے۔اکثر وہ طالب علم کو پڑھ کر سنانے کے لئے کہتے تھے۔درمیان میں مخرج اور الفاظ کی ادائیگی کی بھی تصحیح کرتے جاتے تھے۔ان کے طلبا کو بعد میں احساس ہوتا ہے کہ پڑھنے کی اس تربیت کا انہیں کتنا فائدہ ہوا ہے۔اس تربیت سے ریسرچ اسکالر اپنے بزرگوں کے آگے بات چیت کرنے، سمیناروں اور جلسوں میں مضامین پیش کرنے یا اظہار خیال کرنے میں زیادہ بے باک اور پر اعتماد ہو جاتے ہیں۔

قمر رئیس اپنے تمام ریسرچ اسکالروں سے محبت تو یکساں کرتے ہیں لیکن سب کی ایک ہی انداز سے تربیت نہیں کرتے۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو انہوں نے اپنے اسکالروں کو خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ جب کوئی طالب علم ایم فل یا پی ایچ ڈی کی منزل تک پہنچ جائے تو اس کی شخصیت، صلاحیت اور رجحان کو یکسر نہیں بدلا جاسکتا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے طلبا کا ذہن پختہ ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر مشق، تربیت اور نصیحت سے شخصیت میں محض معمولی تبدیلی ہی ممکن ہے۔ وہ جس اسکالر کو جس لائق تصور کرتے تھے اس کی اتنی ہی اور اس سمت میں حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مثلاً کئی ریسرچ اسکالروں کو انہوں نے چھوٹی ملازمت لینے کا مشورہ دیا۔ بعض اسکالروں کو اس طرح کی ملازمت ملی بھی تو اسے جوائن نہ کرنے کے لئے کہا اور کہا کہ جلد بازی سے کام نہ لیجئے۔ محنت کرتے جائیے۔ آپ کی منزل ابھی نہیں آئی ہے۔ کئی خواتین اسکالرس کو انہوں نے بی ایڈ کی طرف مائل کیا بلکہ ان کے داخلوں میں معاونت بھی کی۔ قمر رئیس کی نگرانی میں ریسرچ کرنے والوں کی اور غالباً سبھی ریسرچ اسکالروں کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ وہ سمیناروں میں مقالے پڑھیں۔ ایسے دور میں اساتذہ کی سرپرستی کافی کام آتی ہے۔ مگر قمر رئیس اپنے اسکالروں کے لئے یکساں طور پر سفارش نہیں کرتے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ ان کا کون سا اسکالر کس سطح کا سمینار پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ سبھوں کو ان کی استطاعت کے مطابق حق دیتے تھے۔ ریسرچ کی تکمیل کے بعد بھی وہ اپنے طلبا کی رہنمائی اور مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نگرانی میں ریسرچ مکمل کرنے والے کم و بیش سبھی طلبا آج ملک کی اہم یونیورسٹیوں اور دیگر اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ ان سبھی کی ملازمتوں میں قمر رئیس کی تربیت اور رہنمائی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

قمر رئیس مخصوص انداز میں زندگی گزارنے کے قائل ہیں۔ جتنی یافت ہو اسے جوڑنے جمع کرنے کے بجائے زندگی کی ضرورتوں اور آسائشوں پر خرچ کر دینا ان کی عادت رہی ہے۔ وہ ایک خوش لباس انسان ہیں۔ ان کا بنگلہ دہلی کی ایک شاندار کالونی میں واقع ہے جہاں وہ پرسکون زندگی گزارتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیقہ فرحت لکھتی ہیں:

> ”مکان عالی شان موڈرن جو ضرورت اور آرائش کی
> چیزوں سے بھرا پڑا ہے اور جو بقول اقبال مجید اردو والے کے
> نہیں بلکہ سمگلر کا مکان لگتا ہے۔“35

کسی اسمگلر کا نہ سہی مگر ان کا گھر کم از کم کسی عام استاد کا تو بالکل نہیں لگتا ہے۔ میں ان بعض اساتذہ کی بات نہیں کر رہی ہوں جنہیں وراثت میں بہت کچھ مل گیا۔ ورنہ عام طور پر ہمارے اساتذہ کو ایسا بنگلہ، گاڑی اور آسائش زندگی کی دوسری چیزیں میسر نہیں ہوتیں۔ قمر رئیس اپنے اسٹڈی روم میں تو لیے دیے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کتابیں بکھری ہوئی بھی ہوتی ہیں۔ مگر اس کمرے کے علاوہ ان کی زندگی میں بے حد سلیقے اور نفاست کی جلوہ گری معلوم ہوتی ہے۔ دراصل وہ خوبصورتی کو پسند کرنے والی شخصیت ہیں۔ انہیں ہندوستان کی مختلف تہذیبوں اور دنیا کے مختلف علاقوں کی نمائندہ قسم کی پینٹنگز اور فنون لطیفہ سے لگاؤ ہے۔ وہ خوبصورت تصویروں کو اپنے ڈرائنگ روم میں سجاتے ہیں۔ جہاں کہیں جاتے ہیں بڑے انہماک اور دلچسپی سے وہاں کے کلچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں لکچرر اور قمر رئیس کے شاگرد ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> ''قمر صاحب بنیادی طور پر ایک حساس اور جمال پرست انسان ہیں، دوستداری ان کے خمیر میں شامل ہے۔ مزید برآں فطرت کے مختلف النوع مظاہر میں خوبصورتی، خوشبو، رنگ اور نور تلاش کرکے ان کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان جیسے خوش باش اردو دنیا میں کم ہیں، جنہوں نے بغیر کسی کا دل دکھائے، بغیر سازشیں وجوڑ توڑ کئے زندگی کی ہر مسرت اور آسائش سے لطف اندوزی کی ہے۔'' 36

قمر رئیس ایک حق گو اور بے باک انسان ہیں۔ عموماً مصلحتوں سے کام نہیں لیتے۔ اگر کوئی خیر کا پہلو یا کسی شخص یا کاز کی جائز پاسداری کا معاملہ ہو تو کبھی کبھی مصلحت آڑے آجاتی ہے ورنہ ان کا وطیرہ یہی رہتا ہے کہ وہ سچ کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس کے اظہار میں بے باکی سے کام لیتے ہیں۔ دوہری پالیسی اختیار کرنا بھی ان کا شیوہ نہیں ہے۔ اگر وہ کسی بات کو درست تصور کرتے ہیں تو ہر موقع اور ہر محفل میں اسے درست ہی قرار دیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی بات انہیں مناسب نہ معلوم ہو تو وہ اس کی حمایت کبھی نہیں کریں گے۔ اس بارے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر اور قمر رئیس کے قریبی دوست ڈاکٹر نصیر احمد خاں کا بیان ہے:

> ''قمر رئیس کی حق گوئی کا میں اس وقت قائل ہوا جب

انہوں نے چالیس سال کی دوستی کی پرواہ کئے بغیر ایک سازش پر سے پردہ اٹھا دیا ...... اردو حلقوں میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چند لوگ قمر رئیس سے صرف اس لئے خفا ہوگئے کہ انہوں نے چوری کیوں پکڑوادی۔ ان میں سے ایک صاحب وہ بھی تھے جو خود قمر رئیس کے ہاتھوں یونیورسٹی میں تقرر پاچکے تھے۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے قمر رئیس سے اپنے تعلقات منقطع کرلیے تھے۔ رسمی سلام ودعا تو کجا وہ محفلوں میں قمر رئیس کو دیکھ کر اب بھی منہ پھیر لیتے تھے۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے اور شرمندگی کہ میری وجہ سے قمر رئیس کی چالیس سالہ دوستی ختم ہوگئی لیکن ان کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں دیکھی۔ جب بھی یہ بات چھڑی انہوں نے مجھ سے یہی کہاکہ انصاف، سچائی اور حق گوئی کی خاطر میں چالیس سال کی دوستی کیا ساٹھ سال کی زندگی بھی قربان کرسکتا ہوں۔ میں ہر طرح کے رشتے کے آگے ضمیر کی آواز کو ترجیح دیتا ہوں۔" 37

نامور دانشور اصغرعلی انجینئر نے اپنے ایک مضمون میں قمر رئیس کی انہیں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک پر مذہب مخالف ہونے کا الزام زور پکڑنے لگا تھا۔ مذہبی رہنما اور انتہائی دولت مند شخصیت سیدنا بھی اس الزام تراشی کو ہوا دینے والوں میں شامل تھے۔ اصغرعلی انجینئر نے اس پروپگنڈے کے خلاف ایک دستخطی مہم چلائی۔ اس بیان پر یہ وضاحت کی گئی تھی کہ ترقی پسند تحریک کسی مذہب کے خلاف نہیں بلکہ مذہب کے نام پر استحصال کئے جانے اور مذہب کو بعض افراد کے مفاد کے لئے استعمال کئے جانے کے خلاف ہے۔ بیان پر دستخط حاصل کرنے کے لئے وہ شہر شہر گھومے اور دانشور، ادیبوں اور خاص طور پر ترقی پسندوں سے دستخط کراتے رہے۔ اسی سلسلے میں دہلی بھی وہ پہنچے جہاں قمر رئیس نے نہ صرف اس پر دستخط کردیئے بلکہ کئی دوسروں لوگوں سے دستخط حاصل کرنے میں مدد بھی کی البتہ بعض بڑے اہم لوگوں نے دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ یہ واقعہ مکمل بیان کرنے کے بعد اصغرعلی انجینئر لکھتے ہیں:

" اس بات کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم اس بات کو اس پس منظر میں دیکھیں کہ اپنی اپنی مصلحت کی بنا پر بعض بڑے نامور ترقی پسند ادیبوں نے جن کا نام لینا یہاں مناسب نہیں، ہماری حمایت میں بیان دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔ میں ان کی بات نہیں کررہا ہوں جو سیدنآ صاحب کے قریبی تھے اور ان کی نوازشوں سے فائدہ اٹھارہے تھے۔ میں ان کی بات کررہا ہوں جو ان کی نوازشوں سے بہرہ اندوز نہیں تھے لیکن کسی نہ کسی مصلحت کی وجہ سے دستخط کرنے سے کترارہے تھے .... میں نے یہ واقعہ کچھ تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ اس سے قمر صاحب کی شخصیت کا جو ہرابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اپنے نظریے اور کمٹ منٹ کی خاطر اپنی ذاتی مصلحتوں کو قربان کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"38

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قمر رئیس ایک بے باک، حق وانصاف پسند، صاف گو، انسان دوست، دوست نواز اور پرخلوص شخصیت کا نام ہے جس کا شیوہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لئے بھی چین وسکون اور خوشیاں فراہم کرنا ہے۔ ایسے لوگ ہمارے سماج کے لئے سودمند اور مثالی ثابت ہوتے ہیں جن کی تعلیم وتعلیمات اور نظریات وافکار سے نسلوں کی تربیت ہوتی ہے۔ جناب سید عاشور کاظمی، قمر رئیس کی زندگی ان کی شخصیت ان کے کردار ان کے نظریات اور ان کی انسان دوستی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ۔

آگ سے کھیل کا انجام برا ہوتا ہے

مصاحب علی خاں نے آگ سے کھیلنا شروع کیا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ جل کر راکھ ہوجاتے لیکن لذت دائم کے معیار بدلنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پروفیسر قمر رئیس آگ کے شعلوں سے گزرے تو کندن ہوگئے۔

بھاری بھرکم شخصیت ، پیشانی پر مضبوط ارادوں کی

لکیریں، ہونٹوں پر سکوت۔ ایسا سکوت جو ان ساحلوں پر ہوتا ہے جن سے طوفان ٹکراٹکرا کر واپس لوٹتے رہتے، کبھی کبھی ہلکی ہلکی مسکراہٹ۔ جیسے بھاری پتھروں کا جگہ چیر کر کوئی نازک کلی سرابھاررہی ہو، بوجھل آنکھوں میں نیند کی سی کیفیت، جیسے چلچلاتی دھوپ میں تپتے بدن مسافر کی آنکھوں میں دور کوئی درخت دیکھ کر، نیند کے خواب مچلنے لگتے ہیں ...... شاید یہ اس آنے والی سحر کی توقع کا اثر ہو جس کے خواب پروفیسر قمر رئیس ایسے شرفا برسوں سے دیکھتے چلے آئے ہیں اور نہ جانے کتنی صدیاں اور دیکھتے رہیں گے۔

نظریاتی حوالے سے مارکسسٹ۔ کردار کے اعتبار سے شریف النفس انسان ...... فکری طور پر غریب ،نادار، کچلے ہوئے اور پسے ہوئے لوگوں کے ساتھی ...... ارادوں میں کہساروں سے ٹکرانے کا حوصلہ ...... ہمتوں میں مصاحب علی خاں، رویے میں قمر رئیس، مذہب سے لاتعلق لیکن ان تمام اقدار کے حامل جو مذاہب نے متعین کی ہیں۔ حقوق اللہ، سے قدرے لاپرواہ لیکن حقوق العباد میں محتاط اور چوکس ...... اپنا کام ہو تو برسوں وقت نہ ملے، دوسروں کی بہبود ہو تو صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کرنے کے لئے پریشان۔ ایسے شخص کا کیا خاکہ بنے گا۔ جو بنے گا وہی پروفیسر قمر رئیس کا خاکہ ہوگا، یعنی محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، صبر کا ہمالہ۔ آنے والی سحر کا حوالہ۔ ڈاکٹر قمر رئیس ...... قمر رئیس جو آداب محبت اور رسم وفا نبھانا جانتے ہیں، قمر رئیس جن کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو نہ صرف رفیقوں کے لئے بلکہ اپنے دشمنوں کے لئے بھی دھڑکتا ہے۔"

حواشی و حوالے

1۔ سید عاشور کاظمی ''میرے میر صاحب'' مشمولہ ''قمر رئیس: ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 122

2۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ''پروفیسر قمر رئیس۔ سوالات کے آئینے میں'' مشمولہ ''قمر رئیس: ایک زندگی'' ص 455

3۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 19

4۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 20

5۔ راقم الحروف نے یہ شجرہ نسب ڈاکٹر قمر رئیس کے بڑے بھائی جناب مبارک شمیم کے مضمون کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ م ج

6۔ احمد جمال پاشا ''قمر رئیس'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 38

7۔ عصمت اللہ خاں ''مصاحب علی بنام قمر رئیس'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 29

8۔ عصمت اللہ خاں ''مصاحب علی بنام قمر رئیس'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 29-30

9۔ عصمت اللہ خاں ''مصاحب علی بنام قمر رئیس'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 28-29

10۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 20-21

11۔ رتن سنگھ ''مکمل شخصیت کی ادھوری کہانی'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 71

12۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 23-24

13۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 26

14۔ رتن سنگھ ''مکمل شخصیت کی ادھوری کہانی'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 70-71

15۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 25

16۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 25

17۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 26

18۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 22

19۔ مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہد طفلی ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 23

20۔ و 21۔ پروفیسر غوث انصاری ''قمر رئیس میرے عزیز دوست'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ص 144

22۔ پروفیسر غوث انصاری ''قمر رئیس: میرے عزیز دوست'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ص 144, 145

23۔ عصمت اللہ خاں ''مصاحب علی بنام قمر رئیس'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 30-31

24۔ رتن سنگھ ''مکمل شخصیت کی ادھوری کہانی'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 75

25 اقبال مجید قمر بھائی' مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی' سلمٰی شاہین ص 62

26 نگار عظیم ایک شفاف شخصیت' قمر رئیس: ایک زندگی' سلمٰی شاہین ص 171

27 مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہدِ طفلی' ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 26

28 مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہدِ طفلی' ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 27

29 مبارک شمیم ''قمر رئیس کا عہدِ طفلی' ماحول اور مشغلے'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 26-25

30 اقبال مجید ''قمر بھائی'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 62-61

31 ڈاکٹر تنویر احمد علوی ''چالیس سالہ دوستی کے اجالے'' مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی۔ ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 47

32 ' 33 و 34 سلمٰی شاہین ''عرضِ مرتب'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 14

35 ڈاکٹر شفیقہ فرحت ''پریم چند کی ٹروکا پی'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 150

36 ڈاکٹر خالد اشرف ''اردو دنیا کا سکندر'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 167

37 پروفیسر نصیر احمد خاں ''ہمارے قمر صاحب'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 9-158

38 اصغر علی انجینئر ''انسان دوست اور ترقی پسند نقاد'' مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ڈاکٹر سلمٰی شاہین ص 259

☆☆☆

باب دوم

قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات : مختلف جہتیں

(الف) تصانیف کا اجمالی تعارف

(ب) صحافت

(ج) ترجمہ اور ترجمہ نگاری

(د) ترتیب و تدوین

(ہ) تنقید

(و) شاعری

تصانیف کا اجمالی تعارف

قمر رئیس کی علمی وادبی زندگی اپنے کئی ابعاد اور کئی جہتیں رکھتی ہے۔ اُن کی زندگی کی دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت کی خبر کو نظر عطا کرتے ہوئے ہوا۔ ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں جس زمانے میں قمر رئیس علی گڑھ میں مقیم تھے انہوں نے جامعہ اُردو کے ترجمان درس کی ادارت سنبھالی اور اسی اداریہ نویسی سے اُن کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور 1957ء سے تا حال' اُنہوں نے تحقیق' تنقید' ترجمہ' تدوین وترتیب کے وسیلہ سے کم وبیش پچیس کتابیں اُردو ادب کے بہترین ذخیرے میں اضافہ کی ہیں۔

قمر رئیس کی پہلی تصنیف ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' 1959ء میں شائع ہوئی جو اُن کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ قمر رئیس کی اس تصنیف کو شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھوں لیا گیا' سراہا گیا اور انعام سے بھی نوازا گیا۔ قمر رئیس نے مقالہ تحریر کرنے کی غرض سے پریم چند اور اُن کے فن کا مطالعہ بڑی باریک بینی اور وسیع پیمانے پر کیا تھا۔ پریم چند کی زندگی اُن پر آئینہ ہوگئی تھی جس میں انہوں نے پریم چند کے فن کو آنکا اور جانچا۔ مطالعہ پریم چند کے سلسلے میں قمر رئیس نے پریم چند کی تقریباً تمام تحریروں کا مطالعہ کیا۔ اُن کے ناول' اُن کے افسانے' اُن کے مضامین سبھی کچھ انہوں نے پڑھا۔ اس مطالعہ کے دوران قمر رئیس کو یہ احساس ہوا کہ پریم چند نے مختلف موضوعات پر مضامین سپرد قلم کئے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ قمر رئیس نے ادبی نقطہ نظر سے اہمیت کے حامل مضامین کو جمع کیا اور 1960ء میں مضامین پریم چند کے نام سے کتابی شکل میں اپنے مختصر مقدمے کے

ساتھ شائع کیا۔ مضامین پریم چند اُن کے چاہنے والوں کے لیے ایک سوغات سے کم نہیں تھی۔ قمر رئیس کے تحقیقی مقالے کی طرح اُن کی اس دوسری ادبی نگارش کو بھی سراہا گیا۔

قمر رئیس نے ڈاکٹریٹ کے لیے پریم چند کے ناولوں کو اپنا موضوع بنایا تھا اور اپنی دوسری ادبی تخلیق میں انہوں نے مضامین پریم چند کو پیش کیا تھا۔ 1961ء میں ایک پاکستانی طالب علم کے استفسار پر انہوں نے ''پریم چند کی کہانیاں'' 1۔ کے عنوان سے ایک طویل و بسیط مضمون سپرد قلم کیا جس میں پریم چند کے افسانوں کا مختلف نقاط نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں قمر رئیس نے تحقیق کی خوب خوب داد دی ہے اور حقیقت کی بازیافت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پریم چند کی تخلیقات کا ذکر اُن کی اپنی تحریروں میں مکمل اور مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ قمر رئیس نے اس مختصر مقالے میں پریم چند کے افسانوں پر منضبط اور مستند انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ان تخلیقات کی اشاعت کی بنا پر قمر رئیس کو ماہر پریم چند کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی چنانچہ مدیر ''نگارش'' (2) امرتسر کی فرمائش پر انہوں نے ایک اور مضمون پریم چند کی تنقید کے عنوان سے سپرد قلم کیا جس میں پریم چند کے فن کا مجموعی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد ازاں پریم چند سے متعلق قمر رئیس کی مندرجہ ذیل تصانیف شائع ہوئیں:

۱۔ پریم چند فکر و فن 1980ء

۲۔ پریم چند (کتابچہ) 1981ء

۳۔ منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے 1983ء اور

۴۔ پریم چند کے نمائندہ افسانے 1991ء 3

قمر رئیس کی تیسری تصنیف ''اُردو ڈرامہ'' ہے جو 1961ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں مغربی اور مشرقی مصنّفین کے شاہکار ڈرامے شائع کئے گئے ہیں۔ ابتداء میں ڈرامے کی تاریخ، روایت اور فن سے متعلق مرتب نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔

1968ء میں قمر رئیس کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''تلاش و توازن'' کے نام سے شائع ہوا جس میں مختلف موضوعات پر شائع شدہ گیارہ مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں۔ ان مضامین کے بیشتر موضوعات فکشن سے تعلق رکھتے

ہیں۔اس مجموعہ میں ایک طویل مقالہ ''جدید ازبیکی شاعری'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ازبیکستان سے متعلق قمر رئیس کی اُردو میں شائع ہونے والی یہ پہلی تحریر ہے۔

تلاش وتوازن کے بعد قمر رئیس کے مضامین کے مزید دو مجموعے شائع ہوئے۔''تنقیدی تناظر'' 1978ء میں منظر عام پر آیا اور ''تعبیر وتحلیل'' (4) 1996ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ان مجموعوں میں بھی فکشن پر لکھے گئے مضامین کا غلبہ ہے اس کے بعد ترقی پسند تحریک سے متعلق مختلف نقاط نظر کو مضامین میں بیان کیا گیا ہے۔

قمر رئیس کے ان مجموعوں میں شامل بیشتر مضامین اُن کی تصانیف کو سمجھنے میں مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔گویا یہ مضامین اُن کی تصانیف کے پیش لفظ ہیں یا خلاصے کی حیثیت رکھتے ہیں۔مثلاً ''تلاش وتوازن'' میں شائع شدہ مضمون ''پریم چند کی کہانیاں'' اُن کی تصانیف پریم چند فکر وفن، پریم چند اور منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے کا لاحقہ معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح اسی مجموعہ میں شامل مضمون ''جدید ازبیکی شاعری'' ازبکستان اور قمر رئیس کے تعلق خاطر اور بعد ازاں ازبیکستان اور ازبیکی شاعری پر اُن کی شائع ہونے والی چھ تصانیف کو سمجھنے میں مدومعاون ثابت ہوتا ہے۔یہی صورت حال فکشن (ناول وافسانہ) پر لکھے جانے والے مضامین کی ہے۔''تلاش وتوازن'' میں اُردو ناول سے متعلق دو مضامین شامل ہیں ''اُردو ناول کا تشکیلی دور'' اور ''جدید اُردو ناول''۔ان مضامین کا تسلسل ہمیں ''تنقیدی تناظر'' میں شامل مضامین ''جدید اُردو ناول میں اظہار واسلوب کے تجربے'' اور ''ترقی پسند تحریک اور اُردو ناول'' میں ملتا ہے جس کا سلسلہ اُن کے مجموعہ ''تعبیر وتحلیل'' کے مضامین پر منتہی ہوتا ہے۔گویا قمر رئیس کے مضامین کے یہ تین مجموعہ مضامین مشترک موضوعات کی بنا پر ایک قدر مشترک رکھتے ہیں جس سے مقالہ نگار کے فکر کا ارتقاء سامنے آتا ہے۔

1961ء میں قمر رئیس کی ایک منفرد تصنیف ''اُردو ڈرامہ'' (انتخاب مع مقدمہ) شائع ہوئی۔انہوں نے یہ کتاب جامعہ اُردو علی گڑھ کی تحریک وفرمائش پر جامعہ کے امتحان ''ادیب کامل'' کے نصاب میں شامل کرنے کی غرض سے لکھی تھی۔اس کتاب میں قمر رئیس کا مقدمہ شامل ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں اُردو کا پہلا ڈرامہ سے متعلق بحث کرنے کے بعد فن ڈرامہ کی ہیئت واجزائے ترکیبی کا بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اُردو

ڈرامے کی روایت مختصراً بیان کی گئی ہے۔اس کے بعد ڈراموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔جن ڈراموں کا انتخاب کیا گیا ہے اُن میں سوفوکلیز کا ڈرامہ انٹی گونی اور کالی داس کا شکنتلا بھی شامل ہے۔انٹی گونی یونانی ڈرامے کا اور شکنتلا سنسکرت ڈرامے کا شاہکار ہے۔ان ڈراموں کو شاہد احمد دہلوی اور ساغر نظامی نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

قمر رئیس نے بحیثیت پروفیسر اُردو، تاشقند میں مختلف ادوار میں خدمات انجام دیں۔پہلی مرتبہ انہوں نے 1962ء میں تاشقند کا سفر اختیار کیا اور وہاں چار برس رہے اور دوسری مرتبہ 1970ء میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔حالانکہ اس سفر میں انہوں نے صرف دو برس تاشقند میں گزارے لیکن یہ دو برس ازبیک اور اُردو شاعری کے لئے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔انہیں دو برسوں میں قمر رئیں نے ازبیک زبان کے شعرأ کے کلام کو اُردو میں منتقل کیا اور خود قمر رئیس کے کلام کا ترجمہ ازبکی میں کیا گیا۔

قمر رئیس کی اولین مترجم تصنیف ''ناول اور داستان'' ہے جو کہ امرتسر سے شائع ہونے والے رسالے نگارش نمبر 3 ناولٹ نمبر میں شائع ہوئی ہے۔(5) اسکاٹ لینڈ کے مصنف جان بوچن نے داستان سے ناول کو ملنے والی وراثت کے موضوع پر ''ناول اور داستان'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس نے اپنی تصنیف میں داستانوں کے فنی اور امتیازی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ یہ تمام اوصاف ناول کو وراثت میں حاصل ہوئے ہیں۔قمر رئیس نے جان بوچن کی اس تصنیف کا ترجمہ مدیر نگارش کی فرمائش پر ''ناول اور داستان'' کے نام سے کیا جو کہ رسالہ نگارش میں شائع ہوا (6) ''ناول اور داستان'' کے بعد قمر رئیس نے 72ء میں ازبیک ادب سے متعلق دو ترجمہ شائع کئے۔ایک ''شعرائے ازبکستان'' ہے جو کہ دو جلدوں میں غفور غلام پبلشنگ ہاؤس تاشقند سے شائع ہوئی اور دوسری تصنیف ''ارمغان تاشقند'' ہے۔

قمر رئیس نے ازبکی ادب کو اُردو میں منتقل کرنے کے بعد ترجمہ کے عمل اور اُس کی فنی ضروریات کو شدت سے محسوس کیا اور جب دہلی یونیورسٹی میں اُردو ترجمہ بحیثیت مضمون شامل کیا گیا تو انہوں نے طلبا اور اساتذہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ''ترجمہ کا فن اور روایت'' 1976ء میں مرتب کی جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''ترجمہ کا فن'' سے متعلق ہے جس میں دس مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں۔دوسرا حصہ ترجمہ کی روایت سے

متعلق ہے جس کے تحت آٹھ مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ قمر رئیس نے یہ کتاب درسی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی تھی لیکن فن ترجمہ اور ترجمہ کی روایت سے متعلق مضامین کا انتخاب جس احتیاط سے کیا گیا ہے اُس کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر ایک منفرد تصنیف ہے۔

اس کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر قمر رئیس نے ترجمہ کے فن کی مبادیات کا بیان کرنے کے بعد اُردو میں ترجمہ کی روایت کا بیان بھی کیا ہے۔ فن ترجمہ پر تصنیف شائع کرنے کے دوسرے ہی برس انہوں نے ترجمے کا عملی نمونہ ''آزاد ہند فوج کی کہانی'' کی شکل میں پیش کیا۔

جنگ آزادی کے عظیم مجاہد سبھاش چندر بوس نے ہندوستان کو بزور بازو آزاد کرانے کی غرض سے آزاد ہند فوج کے نام سے ایک فوج تشکیل دی تھی۔ جس نے مختصر وقت میں عظیم کارنامے انجام دیے۔ گو کہ اس فوج نے ہندوستان کو آزاد کرانے میں کوئی اہم رول ادا نہیں کیا لیکن اس فوج کا وجود بذات خود ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ قمر رئیس نے ایس۔ اے۔ ایئر کی انگریزی میں لکھی ہوئی تصنیف .Story of I.N.A کا ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ' انڈیا کے لئے ''آزاد ہند فوج کی کہانی'' کے عنوان سے 1977ء میں انجام دیا۔

قمر رئیس نے 72ء میں اپنے قیام تاشقند کے موقع پر غفور غلام کے ادارۂ اشاعت سے ازبیکستان کے ادب سے متعلق دو مترجم تصانیف ''شعرائے ازبیکستان'' اور ''ارمغان تاشقند'' شائع کی تھیں۔ 1991ء میں ازبیکستان نے آزادی حاصل کی۔ قمر رئیس نے ازبیکستان کی آزادی کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ازبیکستان سے متعلق 1994ء اور 2002ء کے درمیان چار تصانیف اُردو میں شائع کیں جن میں سے تین تصانیف میں ازبیک شعر و ادب کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ تصانیف حسب ذیل ہیں:

ا۔ ازبیکستان اور علی شیر نوائی 1994ء

۲۔ بیسویں صدی کی ازبیک شاعری 2001ء

۳۔ ظہیر الدین محمد بابر: شخص، شخصیت اور شاعری 2002ء

قمر رئیس نے بحیثیت مترجم اُردو ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اُن کی ادبی شخصیت کا یہ

پہلوانھیں اپنے ہم عصر ادیبوں میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

''آزاد ہندفوج کی کہانی'' کے بعد قمر رئیس کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ''تنقیدی تناظر'' 1978ء میں شائع ہوا۔ 1979ء میں انہوں نے اُردوئے معلّیٰ سیریز کے سلسلے میں ''اقبال کا شعور وفن عصری تناظر میں'' شائع کی۔ یہ کتاب دراصل جشن صد سالہ اقبال کے موقع پر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

''فسانۂ آزاد'' اُردو ادب کا شاہکار ہے۔ یہ فسانہ 1878ء میں لکھا گیا۔ اسے داستان اور ناول کی درمیانی کڑی قرار دیا جاتا ہے اور ناول بھی بیان کیا جاتا ہے۔ فسانۂ آزاد تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مبنی ناول ہے۔ بیسویں صدی میں اس طویل ناول کو پڑھنا اس لئے مشکل قرار دیا جانے لگا کہ قاری کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں قصہ کے ساتھ ساتھ بہت ساری غیر ضروری لوازمات شامل کردیے ہیں جس کی وجہ سے قصہ کے صفحات میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور خود قصّہ پس منظر میں چلا گیا۔ علاوہ ازیں لکھنؤ کی جس معاشرت کے بیان کے لئے سرشار نے یہ فسانہ قلمبند کیا تھا وہ بھی طوالت کے بوجھ تلے روپوش ہوگئی۔

قمر رئیس نے اُردو فکشن کے اس شاہکار کی تلخیص 1980ء میں شائع کی۔ انہوں نے فسانہ آزاد سے غیر ضروری تفصیلات کو قلم زد کیا اور اہم نکات کو اس طرح یکجا کیا کہ آزاد کا مکمل فسانہ 1/8 ڈیمائی کتاب کے 453 صفحات میں سمٹ آیا ہے۔ قمر رئیس نے تلخیص میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس میں لکھنؤ کی معاشرت کے تمام اہم نقوش شامل ہوجائیں۔ اسی کے ساتھ فسانہ آزاد کے اہم کردار اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ قمر رئیس کی یہ تلخیص اُردو ناول کو ایک اہم تحفہ ہے۔

قمر رئیس نے فسانہ آزاد کے خالق رتن ناتھ سرشار کی سوانح اور فن پر ایک کتابچہ ساہتیہ اکیڈمی کے ''ہندوستانی ادب کے معمار'' سیریز کے لئے ''رتن ناتھ سرشار'' کے نام سے 1983ء میں تصنیف کی۔ 90 صفحے کے اس کتابچہ میں سرشار اور لکھنؤ کا بیان قمر رئیس نے تیس صفحات میں کیا ہے اور 49 صفحات میں سرشار کے فن کو بیان کیا ہے۔ اپنی پہلی تصنیف ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' میں جس نقطہ نظر سے انہوں نے پریم چند کے ناولوں کا مطالعہ کیا

ہے اُسی فکری سطح کو اس کتابچہ میں سرشار کے ناولوں کو پرکھنے کے لئے اپنایا ہے۔ ''تلخیص فسانہ آزاد'' اور ''رتن ناتھ سرشار'' اس لحاظ سے قمر رئیس کی منفرد کاوشیں ہیں کہ ان دونوں میں لکھنؤ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے جہاں قمر رئیس نے اپنا عہد شباب بتایا ہے۔ ان دونوں ہی تخلیقات میں قمر رئیس کا اسلوب سادہ' سبک' رواں لیکن پُر کار نظر آتا ہے۔

قمر رئیس نے تلخیص فسانہ آزاد 1980ء میں شائع کی تھی۔ تین ہزار پانچ سو صفحات کی تلخیص کسی طرح معمولی کام نہیں تھا لیکن اسی برس اُن کی ایک اور تصنیف ''پریم چند فکر و فن'' شائع ہوئی۔ 1981ء میں ''پریم چند'' کے نام سے اُن کی ایک اور تصنیف منظر عام پر آئی اور 1983ء میں انہوں نے ''منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے'' جیسی مبسوط کتاب شائع کی۔ پریم چند سے متعلق ان تصانیف کے بعد 1991ء میں قمر رئیس نے ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' شائع کی جس پر اُن کا طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔

اُردو ادب میں پریم چند اور قمر رئیس اسم بامسمّٰی ہوگئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پریم چند کو اُن کے حقیقی روپ میں قمر رئیس ہی نے پیش کیا ہے۔ انہیں کی تحریروں سے پریم چند کے فن کا ادراک صحیح معنی اور سطح پر ہوا ہے۔ پریم چند پر ان تصانیف کے علاوہ قمر رئیس نے متعدد مقالات بھی قلمبند کئے ہیں جو اُن کے مجموعہ ہائے مضامین میں شامل ہیں۔

اسی زمانے میں جامعہ اُردو علی گڑھ کی فرمائش پر قمر رئیس نے خلیق انجم کے اشتراک سے ایک مختصر کتاب ''اصناف ادب اُردو'' تالیف کی جس میں اصناف کی تاریخ بیان کرنے کے بجائے ان کے منفرد اوصاف و عناصر اور فنی نشو و نما کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ تالیف غالباً پہلی دفعہ 1982ء میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ تا حال پندرہویں ایڈیشن کا راقمۃ الحروف کو علم ہے۔

1986ء میں قمر رئیس نے اُردو اکیڈمی دہلی کی فرمائش پر ''اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات'' تحریر کی۔ اُردو طنز و مزاح کی تاریخ اور روایت کو انہوں نے مبسوط انداز میں بیان کیا ہے' ہر زمانے کے اہم عناصر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور کتاب کے آخری باب میں اُردو طنز و مزاح کے ہم عصر رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ ہم عصر ادب پر غیر جانبدارانہ اظہار خیال کرنا عموماً مشکل ہوتا ہے لیکن قمر رئیس نے ہم عصر رجحانات کا تجزیہ

بڑے بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔طنز ومزاح قمر رئیس کی ادبی زندگی کا کبھی محور نہیں رہا لیکن اس تصنیف کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی دریا کے شناور ہیں۔

قمر رئیس کی ایک اہم مرتبہ تصنیف ''اُردو میں لوک ادب'' ہے۔اُردو ادب میں یہ اپنی طرز کی واحد تصنیف ہے جس میں اُردو کے عوامی ادب کو'سمیٹنے' یکجا کرنے اور اکھٹا کرنے کی سعی وکوشش سنجیدگی سے کی گئی ہے۔اُردو ادب کو جاگیردارانہ تہذیب کی دین بتایا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اُردو کے رشتے کو عوام کے بجائے شاہوں سے جوڑا جاتا ہے۔''اُردو میں لوک ادب'' ایسے معترضین کے سامنے آئینہ پیش کرتا ہے۔

''اُردو میں لوک ادب'' میں قمر رئیس نے 22 مضامین یکجا کئے ہیں۔ یہ مضامین وہ ہیں جنھیں مقالہ نگار حضرات نے شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ''اُردو کے لوک ادب'' سیمنار 1988ء میں پیش کئے ہیں۔قمر رئیس سیمنار کے کنوینر تھے اور یہ سیمنار انہوں نے یو.جی.سی کی مالی اعانت سے منعقد کیا تھا۔سیمنار کے مقصد اور اُس کی کامیابی کا اندازہ مقالات کے متنوع موضوعات سے ہوتا ہے۔قمر رئیس کی یہ تصنیف اُن کی ادبی خدمات میں ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔یہ اُردو میں اپنے موضوع پر منفرد نوعیت کی تصنیف ہے۔۔۔جو کہ اُردو ادب کے عظیم عوامی رشتے کی ضامن ہے۔1986ء میں قمر رئیس نے عاشور کاظمی کے اشتراک سے لندن میں ترقی پسند تحریک کا پچاس سالہ جشن منعقد کیا جس میں برصغیر کے اہم ادیب وشعرانے شرکت کی۔اس جشن کے موقع پر پیش کئے گئے مقالات کو''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' کے عنوان سے کتابی شکل میں 1987ء میں شائع کیا گیا۔یہ تصنیف ترقی پسند ادب کے سفر اور اُس کی تمام جہتوں اور کاوشوں کو پیش کرتی ہے۔تحریک کا سفر' مختلف کانفرنسوں اور قراردادوں کی تاریخی روداد' اصناف ادب کو تحریک کی دین کا بیان...... سبھی کچھ اس تصنیف میں سمودیا گیا ہے۔علی سردار جعفری کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' کے مستقبل کے سفر کو اگر کوئی تصنیف بیان کرتا ہے تو وہ یہی ہے۔

قمر رئیس نے 1990ء میں ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' اور 1992ء میں ''نیا افسانہ مسائل اور میلانات'' مرتب کیں۔ یہ دونوں ہی تصانیف اُردو افسانہ (فکشن) کی تاریخ' روایت' مسائل میلانات' رجحانات اور ہم عصر افسانوی تنقید کے ارتقاء کا بیان کرتی ہیں۔اُردو فکشن قمر رئیس کی جولان گاہ ہے۔ان تصانیف کے مقدمے

قمر رئیس کی اسی دلچسپی کا بیان کرتے ہیں۔ یہ دونوں ہی تصانیف اُردو افسانے میں اہم اضافے سمجھے جاتے ہیں۔

1992ء میں قمر رئیس نے مشہور ترقی پسند شاعر' ڈرامہ نگار نیاز حیدر کو اپنی تصنیف ''شعلہ آوارگی'' کے ذریعہ اُردو عوام سے متعارف کروایا۔ نیاز حیدر کو اُردو والے تقریباً بھول سے گئے تھے۔ انھیں زندگی دینے کا فرض قمر رئیس نے انجام دیا اور ''شعلہ آوارگی'' میں نیاز حیدر کی سوانح اور شخصیت پر پُر اثر مقالہ لکھا۔ شعلہ آوارگی میں انہوں نے نیاز حیدر کی نظمیں اکٹھا کیں اور اس میں چند ایک غزلیں بھی شامل کی ہیں۔

قمر رئیس نے کنور نٹور سنگھ کی خواہش پر دہلی میں 17 تا 19 اپریل 1992ء کو جوش ملیح آبادی فکر و فن پر بین الاقوامی سمینار منعقد کیا اور ''جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ'' کے نام سے سمینار میں پیش کردہ مضامین کا مجموعہ ''جوش شناسی'' کے ایک نئے دور کو پروان چڑھانے کی ''ادنیٰ اور حقیر'' کوشش کے طور پر مرتب کیا۔ قمر رئیس نے اس تصنیف کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے ''افکار و اقدار'' میں جوشؔ کے فکر اور اقدار پر مشتمل مقالات جمع کئے ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان ''شعری اسلوب و آہنگ'' ہے جس میں علاوہ شعری اسلوب و آہنگ' جوش کے رسالے ''کلیم'' پر مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں۔ ہر دو حصوں میں قمر رئیس کا ایک ایک مضمون بھی شامل ہے۔ تیسرا حصہ نثری سرمایہ سے متعلق ہے جس میں سمینار میں پیش کئے گئے دو مضامین کے علاوہ جوش کے دو غیر مطبوعہ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ چوتھا حصہ ''انتخاب منظومات'' پر مشتمل ہے۔ جوش ملیح آبادی کے فکر و فن پر مبنی مقالات کا یہ مجموعہ یقیناً جوش شناسی میں اہم اضافہ متصور ہوگا۔

2002ء میں قمر رئیس نے نیاز حیدر کی غزلوں کو اکٹھا کیا اور ''نغمۂ جمال زمیں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ ترقی پسند ادب پر لکھی ہوئی تصانیف میں عموماً نیاز حیدر اور اُن کے فن کو نظر انداز کیا گیا ہے مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی تصنیف ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' میں صرف ایک مقام پر احتجاجی شاعری کے ضمن میں نیاز حیدر کا ذکر کیا ہے اور بس .... قمر رئیس نے ''شعلہ آوارگی'' اور ''نغمۂ جمال زمیں'' کے ذریعہ اُردو میں نیاز حیدر کو متعارف کرانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

1992ء سے 2002ء کے دہے میں قمر رئیس نے ازبکستان اور نیاز حیدر ہی کو اپنے مطالعہ اور مقالات کا

موضوع بنایا ہے۔ اس درمیان 1996ء میں اُن کے مضامین کا مجموعہ ''تعبیر و تحلیل'' یقیناً شائع ہوا لیکن اس مجموعہ میں عموماً وہ مضامین شامل ہیں جو 1992ء سے قبل لکھے گئے تھے اور 1993ء میں انہوں نے جوش سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں مرتب کیا لیکن یہ مقالات 1992ء میں مرتب کئے جا چکے تھے۔ دراصل ازبکستان کی تشکیل جدید کے بعد قمر رئیس نے اُردو میں ازبیک ادب کو پیش کرنے کی جانب خصوصی توجہ دی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اُردو اور ازبیک زبانوں کا تاریخی و تہذیبی ورثہ اور سرچشمہ بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ اُردو میں ازبیک ادبیات کا تعارف قمر رئیس کا امتیازی کارنامہ ہے جو ہمیشہ اُن کے نام سے منسوب رہے گا۔

قمر رئیس کی تصانیف کا یہ اجمالی جائزہ ہمارے سامنے بڑی دلچسپ صورت حال پیش کرتا ہے۔ انہوں نے پریم چند، فکشن، ترقی پسند تحریک سے اپنی وابستگی کی بنا پر تصانیف لکھی ہیں لیکن جن دوسرے موضوعات کو انہوں نے چھوا اور اپنایا ہے وہ منفرد حیثیت کے حامل ہیں جیسے ترجمہ کا فن اور اُس کی روایت، ڈرامے، اُردو کا لوک ادب، اصناف ادب اُردو۔۔۔ یہ ایسے امتیازات ہیں جو گزشتہ نصف صدی کے پس منظر میں صرف قمر رئیس ہی کے نام نامی سے ممتاز ہے۔

صحافت

اُردو میں ادبی صحافت کی تاریخ نے ایک سو پچاس برس مکمل کر لئے ہیں اور فی زمانہ ادبی صحافت کی روایت اتنی مہتمم بالشان ہے کہ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان کی کوئی دوسری علاقائی زبان اُس کی برابری نہیں کر سکتی۔ اُردو میں علمی و ادبی رسالے کی اولین اشاعت 1837ء میں عمل میں آئی جبکہ امریکن مشنری سوسائٹی نے ''مسیحی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے ایک ماہ نامہ ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے 1837ء میں مرزا پور (بنارس) سے جاری کیا۔'' (7) اُردو کا دوسرا ماہ نامہ ''گل رعنا'' قرار دیا جاتا ہے جس کو مولوی کریم الدین نے دہلی سے شائع کیا تھا۔ ''گل رعنا'' کی نوعیت گلدستہ کی تھی اس لیے کہ اس میں مولوی کریم الدین کے یہاں منعقد ہونے والے مشاعروں کی تفصیل اور دوسرے شعراً کا کلام بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ رسالہ 1845ء میں دہلی سے جاری کیا گیا

تھا۔

ماسٹر رام چندر نے (8) ستمبر 1847ء میں ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے دہلی سے ایک ماہ نامہ جاری کیا اور جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے بنارس سے بھی ایک رسالہ شائع ہو رہا ہے تو رام چندر نے اپنے پرچہ کا نام توارد سے بچنے کی غرض سے ''محبّ ہند'' کر دیا۔(9)

''تہذیب الاخلاق'' اُردو کا ایسا پہلا رسالہ ہے جو کہ نظریہ کی تبلیغ کی غرض سے شائع کیا گیا تھا۔ سر سید احمد خاں نے اپنے نظریات وخیالات کو عوام تک پہنچانے کے لئے یہ رسالہ علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ بعد ازاں نظریات یا ادبی نظریات کی نشر واشاعت کی غرض سے متعدد رسالے منظر عام پر آئے جن میں ناصر نذیر فراق کا ''تیرھویں صدی'' جوش ملیح آبادی کا رسالہ ''کلیم'' ترقی پسند مصنّفین کا ترجمان ''نیا ادب'' اور ''نیا ادب اور کلیم'' احمد ندیم قاسمی کا ''نقوش'' وزیر آغا کا ''اوراق'' محمود ایاز کا ''سوغات'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کا ''شب خون'' محمد حسن کا ''عصری ادب'' قابل ذکر ہیں۔ قمر رئیس نے بھی اپنے ادبی مسلک اور اپنے ادبی نظریات کی اشاعت کے غرض سے ''عصری آگہی'' ''نیا سفر'' جیسے ادبی رسائل شائع کئے۔

کسی ادیب کی ادبی زندگی کا آغاز اور اُس کی نشو ونما اُس کی تحریروں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ادیب کی یہ تحریریں اُس کے ذخیرہ علم کو واشگاف کرتی ہیں جہاں ادیب اپنے خیالات کو اپنے ادبی مسلک' نقطہ نظر اور نظریہ ادب کا پیکر عطا کرتے ہوئے صفحہ قرطاس پر نقوش بنا تا جاتا ہے۔ کسی بھی ادیب کی ابتدائی زندگی بہت اہم ہوتی ہے کہ اگر بنیاد میں تھوڑی سی بھی کجی آجائے تو ادبی زندگی کی تعبیر میں استواری آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نئے ادیب کے لئے یہ صورت حال اُس وقت انتہائی کٹھن ہو جاتی ہے جب وہ اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں خبر کو نظر عطا کرنے کے دشوار گزار مرحلہ کو اختیار کرتا ہے۔ خبر کو نظر عطا کرنے کا کام ادبی پل صراط پر دوڑنے کے مماثل ہوتا ہے۔ ادبی زندگی کے آغاز میں صحافت کی دنیا میں شہ سواری کی جرات وجسارت وہی ادیب کرتا ہے جس کے یہاں دیدۂ پنہاں ہو اور جو دل گرفتہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اور قمر رئیس نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں رسالوں کی ادارت کی ذمہ داریاں قبول کرتے ہوئے انتہائی حوصلہ مندی' بلند ہمتی اور اعلیٰ ادبی

ذوق وشوقِ انتقاد وانتخاب کا ثبوت بہم پہنچایا ہے جو آج اُن کی بین الاقوامی ادبی شخصیت کی اساس بن گیا ہے۔

قمر رئیس نے اُردو میں ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری روایتی طریقہ تعلیم کے تحت حاصل نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے صرف امتحان میں شرکت کرتے ہوئے خانگی طالب علم کے طور پر حاصل کی تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ انہوں نے باقاعدہ تعلیم بی۔اے کی سطح تک حاصل کی تھی جس کے بعد انہوں نے ایل۔ایل۔بی کیا تھا۔

ایم۔اے میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ خانگی طور پر ایم۔اے امتیازی نمبرات سے کامیاب کرنا اور پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے علی گڑھ کا انتخاب' نوجوان قمر رئیس کے بلند حوصلوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ وہ اپنے آہنی بلند حوصلوں کے سہارے 1955ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے۔ ایک برس یونیورسٹی کی فضا اور تحقیق کے طریقہ کار کو سمجھنے میں بیت گیا۔ اپنے مارکسی خیالات اور شاعرانہ تخیلات کی بنا پر انہوں نے اساتذہ اور طلبا میں اپنی ایک شناخت بنائی' اُن کی طبیعت کا فطری پن اُن کے تحقیقی مزاج کی بردباری میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ رشید احمد صدیقی جیسے نستعلیق وصاحب طرز ادیب کو جو اُن کے نگران' رہنما ورہبر تھے' کو قمر رئیس کے تحقیقی جنون نے متاثر کیا تب ہی تو نگراں نے یہ کہہ دیا تھا کہ ''تمہیں جو لکھنا ہے لکھو تمہارے نظریات سے مجھے کوئی سروکار نہیں''۔

قمر رئیس کی اپنے مقالے کے لئے تحقیق کی سعی وجستجو رشید احمد صدیقی کی نگاہِ دوررس اور مسلم یونیورسٹی کی روایتی ادبی فضا نے شاہجہاں پور سے لکھنؤ ہو کر آنے والے اس خاموش لیکن جوشیلے نوجوان میں پوشیدہ انتظامی وانتقادی صلاحیتوں کو تاڑا اور اپنے نونہالوں کی تدریسی زندگی کے ترجمان ''درس'' کی ادارت اُس کے ہاتھوں میں سونپی۔ اور کچھ عرصہ بعد جامعہ اُردو کے ارباب مجاز نے اپنے اس فیصلہ پر یقیناً فخر کیا ہوگا۔ جامعہ اُردو علی گڑھ کا ایک ترجمان رسالہ ''درس'' شائع ہوتا تھا جو کہ ماہنامہ تھا۔ اس رسالے میں عموماً ایسے مضامین شائع ہوا کرتے تھے جو کہ جامعہ کے طلبا وطالبات کی درس وتدریس میں مدد ومعاون ہوتے تھے۔ ''درس'' کے ذریعہ دراصل جامعہ اُردو کے طلباء کو امتحان کی تیاری میں معاونت کی جاتی تھی اور یہ رسالہ اسی مقصد کو پورا کرتا تھا۔

جنوری 1957ء (10) میں قمر رئیس کو ''درس'' کا مدیر بنایا گیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ انہوں

نے اس رسالے کی ادارت سنبھالتے ہی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ درس کو صرف طلبا کے درس وتدرس کی حد تک محدود نہیں رکھا۔ اس کے مضامین کو ادب کے مطالعہ اور انتقاد تک وسیع کیا۔ یہ تبدیلی طلبا و اہل ذوق اصحاب کو خوب بھائی' رسالے کی مانگ میں اضافہ ہوا' مدیر کو اُس کی محنت کی ستائش ملی' صلہ ملا' حوصلے بلند ہوئے تو نوجوان مدیر نے ''درس'' کے ایک کے بعد دیگر دو خصوصی شمارے ایک برس کے اندر اندر شائع کیے۔

درس کا پہلا خصوصی شمارہ ''انتقاد نمبر'' کی شکل میں شائع ہوا۔ یہاں اس امر کا اظہار بیجا نہ ہوگا کہ قمر رئیس کے پسندیدہ ادیبوں میں نیاز فتح پوری بھی شامل ہیں اور نیاز فتح پوری اُصول نقد کو' انتقاد' کے نام سے یاد کرنے پر اصرار کرتے تھے (11) اور اسی کے ساتھ لفظ ''تنقید'' انھیں پسند نہیں تھا۔ جس زمانے میں قمر رئیس نے درس کا ''انتقاد نمبر'' شائع کیا ہے اس کے کچھ ہی برس قبل نیاز فتح پوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''انتقادیات'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ درس کے تنقید نمبر کے لیے یہ نام نیاز سے اپنی ذہنی وابستگی ہی کی بنا پر قمر رئیس نے منتخب کیا ہو۔

قمر رئیس نے درس کا دوسرا خصوصی شمارہ ''اصناف سخن نمبر'' کے نام سے شائع کیا۔ تبدیل شدہ ہیئت میں درس جامعہ اُردو علی گڑھ کا مقبول رسالہ بن چکا تھا۔ مدیر کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ انتقاد نمبر کے بعد جب قمر رئیس نے اصناف سخن نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس خاص نمبر کے لئے اُن ماہرین ادب سے مضامین کی فرمائش کی جنہوں نے کسی صنفِ سخن پر تحقیق کی تھی اور اُس صنف پر مہارت رکھتے تھے چنانچہ قمر رئیس نے قصیدہ پر ابومحمد سحر سے اور رباعی پر فرمان فتح پوری سے مضامین لکھوائے۔ اس طرح اصناف سخن نمبر کو صرف طلبا و طالبات ہی کے لئے نہیں بلکہ اُردو کے عام قاری اور صاحبِ ذوق اصحاب کے لئے بھی دلچسپ بنایا۔ چنانچہ درس کے ان دو خصوصی اشاعتوں کے بارے میں سلمیٰ شاہین لکھتی ہے:

> '' ایک سال کی مدت کے اندر ہی ڈاکٹر قمر رئیس نے اس
> کے دو خاص نمبر شائع کئے ایک ''انتقاد نمبر'' دوسرا ''اصناف
> سخن نمبر'' یہ دونوں خاص نمبر نہ صرف طلباء میں بلکہ

صاحب ذوق عام قارئین میں بھی بہت مقبول ہوئے‘‘12؎

قمر رئیس کی ادارت میں ’’درس‘‘ کی شہرت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اسی کے ساتھ رسالے کی تعداد اشاعت میں بھی خاصہ اضافہ ہو چکا تھا۔ مدیر کی یہ سعی و کاوش تھی کہ اس رسالہ کو صرف تدریسی مضامین تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے ایک عام تحقیقی و تنقیدی رسالے کے طور پر پیش کیا جائے۔ اپنے اسی منصوبہ کے تحت انہوں نے رسالے کے خصوصی نمبر بھی شائع کئے اور ادب کے مقبول عام موضوعات پر ماہرین سے مضامین تحریر کروائے۔ ایک برس تک ’’درس‘‘ کو کامیابی سے شائع کرنے کے بعد قمر رئیس کو احساس ہوا کہ رسالے کو ادب کی خدمت میں جس مقام پر وہ لے جانا چاہتے ہیں اس سفر میں رسالے کا نام ’’درس‘‘ مناسب و موزوں نہیں۔ چنانچہ جنوری 1958ء میں انہوں نے رسالے کا نام ’’ادیب‘‘ کر دیا جو آج تقریباً نصف صدی بعد بھی پابندی سے جامعہ اُردو علی گڑھ سے شائع ہو رہا ہے۔

قمر رئیس نے صرف رسالے کا نام تبدیل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے رسالے کی معنوی شکل وصورت بھی بدل دی چنانچہ جنوری 1958ء کے بعد ’’ادیب‘‘ میں شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین اور طنز ومزاح کو مستقل طور پر شائع کیا جانے لگا۔ اسی کے ساتھ ’’اختیارِ ادب‘‘ کے عنوان سے ادبی انٹرویوز کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ قمر رئیس نے ’’ادیب‘‘ کی تبدیل شدہ معنوی ہیئت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے اُردو کے معروف ادیبوں، شاعروں، ناقدین اور محققین سے تخلیقات فراہم کیں۔ چونکہ ادیب کا تعلق ایک جامعہ سے تھا چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھی نوجوان ادیب و شعرا کو بھی صلۂ عام دی کہ اپنی تخلیقات ادیب میں شائع کروائیں۔

جنوری 1958ء میں ادیب کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا دوسرے شمارے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اُردو کے صحافی، بے مثال مقرر اور ہندوستان کے مثالی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ قمر رئیس نے ادیب بابت فروری 1958ء کے شمارے کو آزاد اور اُن کی تخلیقات سے مزین کیا چنانچہ مدیر قمر رئیس نے اپنے ادارتی نوٹ کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی قومی و ادبی خدمات پر ایک مفصل مقالہ شائع کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور حیات کو ایک اور مضمون میں اس طرح پیش کیا گیا کہ خود مولانا کی تخلیقات ’’غبار خاطر‘‘ اور تذکرہ سے

اقتباسات منتخب کئے گئے اور انھیں ترتیب دے کر مولانا کی خودنوشت حیات مرتب کی گئی۔

طنز ومزاح کے مستقل کالم کے لئے قمر رئیس کی نظر انتخاب اپنے جونیر ساتھی احمد جمال پاشا پر جاٹھہری چنانچہ فروری1958ء کے شمارہ میں ''بدھو کی ڈائری'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم کی ابتدا کی گئی اور احمد جمال پاشا اس کالم کے لئے مضامین لکھتے تھے۔ وہ اس وقت ایم۔اے اُردو میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ادیب کا یہ طنز ومزاح کا کالم احمد جمال پاشا کی ادبی زندگی کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوا اور ادیب کے کالم ہی کی وجہ سے انھیں بطور مزاح نگار شہرت حاصل ہوئی۔

قمر رئیس ادیب کو ایک ایسے رسالے کی شکل وصورت دینے میں مصروف تھے جس میں ہم عصر ادبی رجحانات کی بھرپور عکاسی ہو اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس رسالے میں ایسے ہی موضوعات پر مضامین ومقالات شائع کئے جو ہم عصر ادبی فن کی تعمیر وتشکیل میں ممد ومعاون ہوں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی نے مقدمہ شعروشاعری میں غزل پر ایسی سخت تنقید کی کہ غزل سے شاعر دامن بچانے لگے، جوش نے غزل کی گردن زدنی کا حکم لگایا اور کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا۔ جوشؔ ملیح آبادی اور کلیم الدین احمد کے ان جملوں کی بازگشت ابھی فضا سے تحلیل نہ ہونے پائی تھی کہ جنوری1936ء میں باضابطہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔تحریک کے مینوفیسٹو کے پیش نظر نظم کو شعرأ نے اپنایا اور غزل سے آنکھ ملانے سے گھبرانے لگے۔اس ماحول میں بھی بعض ترقی پسند شعرأ غزل ہی کو اپنی جولانیٔ طبع کی تسکین کا سامان بنائے ہوئے تھے چنانچہ حسرت، جگر، مجروح، جذبی، فانی جیسے شعرأ نے عصری حسیت کے مضامین غزل میں ڈھالتے ہوئے یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ غزل میں بھی ترقی پسند حقیقت نگاری کا بیان کیا جاسکتا ہے، اس کے باوجود بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں اُردو غزل معتوب ہی رہی۔

اس ادبی فضا میں قمر رئیس نے راہی معصوم رضا سے ''غزل کی معنوی وحدت'' کے موضوع پر منعقدہ مباحثہ کو تحریری شکل دینے کی فرمائش کی۔اس مباحثہ میں ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، خلیل الرحمٰن اعظمی اور دوسروں نے حصہ لیا تھا۔ راہی معصوم رضا نے بڑی چابکدستی سے اس تمام مباحثہ کو قلمبند کیا تھا۔

ادیب کے مدیر نے اس مباحثہ کو ادیب میں شائع کیا اور اس طرح غزل کی معنوی وحدت کو غزل کے فروغ کا ذریعہ بنایا۔

قمر رئیس نے ادیب میں نئی مطبوعات پر تبصروں کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا لیکن انہوں نے جدت یہ کی تھی کہ جس کتاب پر تبصرہ شائع ہوتا اُس تبصرہ پر اگر کتاب کے مصنف یا مولف کو اعتراض ہوتا اور وہ اپنا نقطہ نظر بیان کرنا چاہتا تو ادیب کے صفحات اُسے خوش آمدید کہتے تھے۔ ادیب میں یہ تبصرے عموماً خود مدیر محترم یعنی قمر رئیس ہی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اگست 1958ء کے ادیب میں قمر رئیس نے عمیق حنفی کے شعری مجموعہ ''سنگ پیرہن'' پر اپنا تبصرہ شائع کیا جس میں انہوں نے سنگ پیرہن پر چند بنیادی سوال اٹھائے (ان سوالات کی اشاعت کے بعد بڑی شہرت ہوئی) عمیق حنفی نے ادیب میں اپنی تصنیف پر تبصرہ پڑھنے کے بعد اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور تبصرہ نگار کے سوالات پر مشتمل ایک مضمون ادیب کے مدیر کو روانہ کیا۔ قمر رئیس نے ادیب کے شمارہ بابت نومبر 1958ء میں عمیق حنفی کا مضمون من وعن شائع کر دیا۔ ایک اچھے اور سچے مدیر کا یہی فرض ہوتا ہے۔

قمر رئیس درس کو ادیب کا درجہ دے کر اُسے کامیابی سے شائع کر رہے تھے کہ رشید احمد صدیقی نے' جو اس زمانے میں شعبہ اُردو کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے' علی گڑھ میگزین کی ادارت کی ذمہ داری بھی انہی کو سونپ دی۔

علی گڑھ میگزین کی ادارت جہاں ایک چیلنج تھی وہیں نوجوان مدیر قمر رئیس کی ادبی تنقیدی و انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف بھی تھا اور اعزاز بھی .... قمر رئیس نے علی گڑھ میگزین کی ادارت قبول کر لی اور اب وہ بیک وقت دو رسالوں کو مرتب کرنے کے فرائض انجام دینے لگے۔

قمر رئیس کی ادبی صحافت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بیشتر مقالہ نگار حضرات نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے جامعہ اُردو کے رسالے کے دو خاص نمبر ''انتقاد نمبر'' اور ''اصناف سخن نمبر'' شائع کیے۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ قمر رئیس نے جامعہ اُردو کے ترجمان رسالے کے تین خاص نمبر شائع کئے ہیں۔ مندرجہ بالا دو نمبر اور تیسرا ''انشائیہ نمبر'' جو پہلے دو خصوصی اشاعتوں سے زیادہ اہم موضوع پر شائع کیا گیا تھا۔ قمر رئیس نے انشائیہ نمبر کو دو

حصوں میں تقسیم کیا تھا حصہ اول میں انہوں نے عالمی ادبیات میں انشائیہ کی روایت کا بیان کیا تھا اور مغربی زبانوں کے انشائیوں کا ایک ایک نمونہ ترجمہ کے ذریعہ شامل اشاعت کیا گیا تھا۔ اس رسالے میں انگریزی، جرمن، فرانسیسی، روسی، ترکی، عربی اور فارسی زبانوں کے انشائیوں کو شامل کیا گیا تھا۔

انشائیہ نمبر کے دوسرے حصے میں انشائیہ پر اُردو میں لکھے جانے والے مضامین کے علاوہ اُردو کے اہم انشائیہ نگاروں کے انشائیہ اور انشائیہ سے متعلق اُن کے خیالات کو یکجا کیا گیا تھا چنانچہ اس حصے میں عبدالماجد دریا بادی، نیاز فتح پوری، اختر علی تلہری، ڈاکٹر سیدہ جعفر، سید احتشام حسین، ڈاکٹر وزیر آغا اور عبادت بریلوی کے ساتھ ساتھ نوجوان ادیبوں کے انشائیہ بھی شامل کیے گئے تھے جن میں احمد جمال پاشا بھی شامل ہیں۔ ادیب کا یہ انشائیہ نمبر ادبی دنیا میں بے انتہا مشہور ہوا اور اس خصوصی نمبر کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے قمر رئیس نے انشائیہ نمبر کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ انشائیہ نمبر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔

> ''اُردو زبان میں انشائیہ نگاری کو فروغ دینے میں ''ادیب'' کے اس خاص نمبر کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔'' 13؎

رسالہ ادیب کا ایک گوشہ ''رفتارِ ادب'' کے لئے مختص تھا۔ اس عنوان کے تحت مدیر کسی ممتاز ادیب یا شاعر یا فن کار کا انٹرویو شائع کیا کرتے تھے۔ یہ انٹرویو خود مدیر لیا کرتے تھے۔ قمر رئیس نے ادیب کی دو برس کی زندگی میں جن ادیب و شعرأ کے انٹرویوز شائع کئے اُن میں اختر انصاری، وامق جونپوری، خلیل الرحمٰن اعظمی، منیب الرحمٰن، سید احتشام حسین، لندن یونیورسٹی کے اُردو استاد اور اسکالر رالف رسل، ڈاکٹر محمد حسن، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، مولانا ضیا احمد بدایونی، مسیح الحسن رضوی اور حیات اللہ انصاری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ 14؎

ادبی رسالے کا وہ مدیر کامیاب سمجھا جاتا ہے جو اپنے رسالے کے ذریعے ادبی فضا، رجحان اور نظریہ کو فروغ دے۔ علاوہ ازیں ادب کے مستند ادیب و شعرأ کے ساتھ ساتھ نوجوان، ابھرتے upcoming ادیب و شعرأ کی تخلیقات شائع کرتے ہوئے انھیں مواقع فراہم کرے۔ قمر رئیس نے بحیثیت مدیر رسالہ ادیب، ان تمام اُمور کو بحسن خوبی انجام دیا۔ انہوں نے اُردو کے معروف و مستند ادیبوں کی تحریریں اپنے رسالے کے لئے فراہم کیں اسی کے

ساتھ اپنے ساتھی نوجوان ادیبوں کی تخلیقات کو بھی رسالے میں شائع کیا۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں:

''ادیب علی گڑھ کے توسط سے بہت سے ایسے نوجوان قلم کار متعارف ہوئے جنہوں نے بعد میں شہرت اور ناموری کی منزلیں طے کیں۔ عثمان غنی آجکل قومی آواز لکھنؤ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ وہ ادیب کی ادارتی مجلس میں شروع سے شامل تھے۔ ان کے اولین مضامین اور تبصرے ادیب، میں ہی شائع ہوئے۔ محمود ایوبی اس وقت ہفتہ وار بلٹز بمبئی کے ایڈیٹر ہیں 1958ء میں وہ علی گڑھ میں ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ان سے بعض اچھے مضامین لکھوائے جیسے ''پریم چند اور مذہب'' یہی نہیں ان سے پریم چند کے کئی ہندی مضامین کے ترجمے کراکر ادیب میں شائع کئے۔ رشید حسن خاں جو نامور محقق اور قمر رئیس صاحب کے ہموطن دوست بھی ہیں ان سے بھی ڈاکٹر قمر رئیس نے مضامین لکھوائے اور شائع کئے۔ مثلاً ''فیض کی شاعری پر ایک نظر'' غدر اور ادب پر اس کے اثرات۔''15؎

قمر رئیس نے جنوری 1957ء میں درس کی ادارت سنبھالی تھی۔ انہوں نے ایک برس کے اندر درس کے دو خصوصی شمارے ''انتقاد نمبر'' اور ''اصناف سخن نمبر'' شائع کئے جنوری 1958ء میں انہوں نے درس کا نام ادیب قرار دیا اور اس کی معنوی ہیئت میں اہم تبدیلیاں کیں۔ اور فروری 1958ء میں گوشہ ابوالکلام آزاد شائع کیا اس کے لئے ادیب کا ''انشائیہ نمبر'' مرتب کیا جس کی مقبولیت کے پیش نظر انھیں اس خصوصی شمارے کی دوبارہ اشاعت عمل میں لانی پڑی۔ قمر رئیس درس/ادیب کی ادارت سے دو برس وابستہ رہے اور اس قلیل مدت میں انہوں نے اس رسالے کو جامعہ اُردو کی چار دیواری سے نکال کر برصغیر میں مقبول عام بنا دیا۔ مزید برآں انہوں نے اپنے نوجوان ساتھی ادیبوں کی تخلیقات شائع کرتے ہوئے انہیں ادبی دنیا سے متعارف کروایا جن میں احمد جمال پاشا اور رشید حسن خاں کے نام نامی بھی شامل ہیں۔

ادیب کی ادارت کے دوران ہی رشید احمد صدیقی کے مشورے سے قمر رئیس کو علی گڑھ میگزین کی ادارت کا

منصب بھی تفویض کیا گیا۔ یہ میگزین سالانہ تھا چنانچہ سال میں صرف ایک مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا۔ قمر رئیس کو اس میگزین کے ادارت کی ذمہ داری 1957ء میں سونپی گئی۔ قمر رئیس نے اپنے سپروائزر کے حکم کی بنا پر ذمہ داری تو قبول کرلی لیکن اس رسالے کی اشاعت کی غرض سے انہوں نے ایک مجلس ادارت تشکیل دی جن میں اُن کے نوجوان احباب شامل تھے مثلاً شہریار، سید امین اشرف، محمود ایوبی، کاظم علی خاں اور انعام الحق۔ مجلس ادارت میں شامل یہ وہ نام ہیں جو آج اُردو دنیا کی آبرو ہیں۔ ان سے اُردو دنیا کی کہکشاں تابندہ ہے۔ یہ امر قمر رئیس کی دیدہ بینی پر دال کرتا ہے۔

قمر رئیس نے علی گڑھ میگزین کی ادارت سنبھالنے کے بعد اس رسالے کو سال میں دو مرتبہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی سے خصوصی اعانت حاصل کی۔ قمر رئیس کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کے صرف دو شمارے شائع ہوئے اور دونوں ہی شمارے اپنے مشمولات کی بنا پر یادگار دستاویز کی اہمیت رکھتے ہیں۔

قمر رئیس نے پہلا شمارہ 1957ء میں شائع کیا۔ اپنی ادارت میں شائع ہونے والے پہلے شمارے میں انہوں نے چند تبدیلیاں کیں۔ اس زمانے میں آزاد نظم کا چرچہ تھا حالانکہ ن۔م۔ راشد کا مجموعہ شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا لیکن آزاد نظم کی روایت ابھی مستحکم نہ ہو سکی تھی۔ قمر رئیس نے ترقی پسند تحریک کے تناظر میں اس صورت حال کا صحیح اندازہ لگایا اور اپنی ادارت میں شائع ہونے والے علی گڑھ میگزین کے پہلے شمارے میں گوشہ آزاد نظم شامل کیا۔ اس موضوع پر سمپوزیم کا انعقاد کیا اور اس کے مباحث کے علاوہ اس خصوصی حصہ میں ڈاکٹر منیب الرحمٰن، سلامت اللہ خاں، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہاب جعفری اور کنول بالی کے مقالات آزاد نظم پر شائع کئے۔ علاوہ دوسرے مضامین و مقالات قمر رئیس نے پروفیسر رشید احمد صدیقی سے اپنی سعی بلیغ و بے انتہا اصرار کے ساتھ اُن کی آپ بیتی پر مشتمل مضمون لکھوایا جس کا مسلسل سلسلہ ''آشفتہ بیانی میری'' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ قمر رئیس نے اس شمارے میں اختر انصاری سے بھی بہ اصرار آپ بیتی پر مشتمل مضمون لکھوایا جو اُن کی خودنوشت ''یادوں کے چراغ'' کی تکمیل کا باعث ہوا۔

علی گڑھ میگزین کے یہ مشمولات اپنے مدیر کی غیر معمولی جہد و جستجو ہی کا نہیں، اس کے ادبی ذوق وشوق کا

بھی پتہ دیتے ہیں۔اس سے پہلے شمارے میں قمر رئیس نے اسرار الحق مجاز کی شخصیت کو روشن کرنے کی غرض سے مرحوم کی بہن حمیدہ سالم سے مضمون قلمبند کروایا تھا جس سے مجاز کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے پیش نظر جب نظم کو فروغ حاصل ہوا تو نظیرا کبرآبادی کی بازیافت کی گئی۔نظیر اور اُس کے کلام کا مطالعہ مختلف زاویہ سے کیا جانے لگا اسی طرح حلقہ ارباب ذوق میں غزل کی بقا کی کوشش کے تئیں میر کی بازیافت کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میر کو خدائے سخن قرار دے کر اُن کے لہجۂ اُن پر مضامین اور اُن کے لہجے میں طبع آزمائی معمول بن گیا تھا۔قمر رئیس نے عصری حسیت کے تناظر میں میر کے مطالعے کی اہمیت کو سمجھا اور علی گڑھ میگزین کے دوسرے شمارہ کو ''میر نمبر'' کے طور پر شائع کرنے کا اعلان کیا لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔انسان کی ہر خواہش پوری ہو یہ ضروری تو نہیں۔اور انسان اپنی اس مجبوری کے باعث اللہ کی قدرت کاملہ پر ایمان لے آتا ہے۔قمر رئیس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی لیکن انہوں نے اپنے عزم اور ارادہ کو اس طرح شرمندۂ تعبیر کیا کہ اس شمارہ میں ''گوشہ میر'' شائع کیا جس میں ممتاز ناقدین ادب کے مقالات شامل کئے۔ان مقالات میں ایک اہم مضمون آل احمد سرور کا ''میر کے مطالعہ کی اہمیت'' شامل تھا جسے گوشہ میر میں امتیازی اہمیت حاصل تھی۔آل احمد سرور نے یہ مضمون بہ نفسِ نفیس اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا تھا بلکہ مدیر علی گڑھ میگزین کے بے حد اصرار پر انھیں کو املا کروایا تھا۔روداد خود قمر رئیس نے ایک انٹرویو میں بیان کی ہے۔اقتباس ڈاکٹر سلمٰی شاہین کی زبانی سنیے:

> ''سرور صاحب نے اپنا مضمون ''میر کے مطالعہ کی اہمیت'' نو دس قسطوں میں لکھوایا وہ دسمبر کی سرد راتوں میں قمر رئیس صاحب کو گھر بلواتے تھے اور ہر بار مضمون کے ڈیڑھ دو صفحہ املا کراتے تھے''[16]

قمر رئیس نے علی گڑھ میگزین کے دو ہی شمارے شائع کئے کہ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے باعث انھیں یونیورسٹی کو خیر باد کہنا پڑا۔1959ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا اور اسی برس دہلی یونیورسٹی کے شبینہ کالج میں بحیثیت لکچرر اُن کا تقرر عمل میں آیا۔اور قمر رئیس درس وتدریس میں ایسے مشغول ہوئے کہ 1972ء تک انہوں نے صحافت کی جانب نظر نہ اٹھائی۔اس دوران انھیں تاشقند میں بحیثیت پروفیسر اُردو خدمات انجام دینے کا

بھی موقع ملا۔

1972ء میں قمر رئیس کو کل ہند انجمن اساتذۂ اُردو جامعات ہند کا معتمد (جنزل سکریٹری) منتخب کیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ 1982ء تک متمکن رہے۔ اس عہدہ کی ذمہ داریوں نے انھیں خبر کو نظر بنانے کے ہنر کو پھر ایک بار اپنانے پر مجبور کیا چنانچہ قمر رئیس نے اس انجمن کا ایک ترجمان شائع کیا جو دس برس تک برابر جاری ہوتا رہا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری انھیں کے سر تھی جسے انہوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ اس ترجمان کی کامیاب اشاعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ رسالہ دس برس تک مسلسل جاری رہا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

قمر رئیس کی زندگی میں ادبی صحافت کو اُس وقت شباب نصیب ہوا جب مئی 1979ء میں انہوں نے ''عصری آگہی''، دہلی سے شائع کیا۔ اس رسالے کی غرض وغائیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سلمٰی شاہین لکھتی ہیں:

> ''اس زمانہ میں قمر صاحب ترقی پسند تحریک کی تنظیم نو کے لئے بھی کوشاں تھے۔ یہ پرچہ نکال کر اس کی ایک قرار داد کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس کے لکھنے والوں میں بزرگ ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اجتماعی شعور رکھنے والے نوجوان ادیب بھی شامل تھے۔ ابتدأ ہی سے اس کے قارئین اور معاونین کا ایک وسیع حلقہ ملک میں بن گیا۔ اس سے تحریک کو بھی تقویت ملی اور جدیدیت کے سیاہ بادل آہستہ آہستہ تحلیل ہونے لگے۔''[17]

عصری آگہی میں علاوہ مضامین ومقالات بعض مستقل عنوانات مخصوص تھے جیسے ''نقد ونظر''، ''تخلیق وتجزیہ''۔ ''نقد ونظر'' عنوان کے ذیل میں عالمی اورقومی صورت حال پر اہل نظر کے تجزیاتی مضامین شائع کئے جاتے اور ''تخلیق وتجزیہ'' کے ضمن میں جدید لیکن اہم افسانوں کی عملی تنقید پر مشتمل مضامین شائع کئے جاتے تھے۔

''عصری آگہی'' میں قمر رئیس بڑی پابندی سے عصری حسیت پر مشتمل اداریہ بنام چہرہ لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے میں لکھے گئے ان کے اداریہ مضامین ومقالات سے زیادہ اہم اور زود اثر ہوا کرتے تھے۔ قمر رئیس نے مئی 1979ء میں پہلا شمارہ شائع کیا تو چہرہ کے عنوان سے اداریہ لکھا۔ اقتباس دیکھئے:

''آج کا قاری جب نذیر احمد اور حالی کی تخلیقات کا مطالعہ کرتا ہے تو ان کی شدید اخلاقی حسیت کے ادبی اور معنوی اظہارات کو خاموشی سے رد کردیتا ہے لیکن ان کی سماجی بصیرت ' واقعیت پسندی اور زبان وبیان کی شفاف نقش گری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں رہتی کہ تخلیق میں کہاں استعارات اور علامتیں آگہی کی تہ داری کی ترسیل کا ذریعہ ہیں اور کہاں آگہی کی ناداری کے اخفا کا۔ جوادیب' قاری یا اس کی قوت تمیز کو نظر انداز کرکے تخلیق کاری میں مصروف ہیں وہ یا تو اپنی آگہی سے قطعی ناآسودہ ہیں یا قاری کی آگہی سے خوف زدہ۔''18؎

اس اداریہ کی افادیت اُس وقت پوری طرح قاری پر واشگاف ہوتی ہے جب اس کا مطالعہ جدید ادب کے تناظر میں کیا جائے۔ جب ادب میں علامت نگاری کے نام پر مہمل واقعات کو کہانی قرار دیا جارہا تھا جہاں افسانہ چیستان بن گیا تھا' جب علامتوں کی تعبیر یا تو افسانہ نگار بتا سکتا تھا یا پھر خدا۔ ایسے میں قمر رئیس نے اس ''چیستان'' کے خلاف اپنے اداریوں میں اظہار خیال شروع کیا۔

قمر رئیس نے مئی 1979ء میں ''عصری آ گہی'' کا پہلا شمارہ شائع کیا تھا۔ بدقسمتی سے اسی ماہ جمشید پور میں بھیانک فسادات پھوٹ پڑے۔ ان فسادات کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ اشرار نے اسکول کے معصوم بے گناہ بچوں کو بھی نہیں بخشا تھا چنانچہ اسکولی بچوں سے بھری ہوئی ایک بس کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ UNESCO نے 1979ء کو بچوں کا سال قرار دیا تھا۔ قمر رئیس کا انسان دوست دل ان واقعات سے خون کے آنسو رونے لگا اور انہوں نے عصری آ گہی کے دوسرے ہی شمارے میں اداریہ لکھتے ہوئے ان وحشیانہ فسادات پر کاری ضرب لگائی۔ اداریہ کا آغاز اور اس کا عنوان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

''دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف...... ...... ہم نے دیکھا بڑے بڑے کارخانوں بڑی بڑی بھٹیوں سے نکلنے والے دھوئیں کے شہر میں اچانک زیادہ گھرے زیادہ سفاک' زیادہ

زہریلے دھوئیں کے مرغولے منڈلانے لگے۔ دم گھٹنے لگا۔ دماغ تپنے لگے۔ گھر مرگھٹ بن گئے۔ بھیڑیے انسانوں کی بربریت پر روپڑے۔ آہنی شہر کی گلیاں بھٹیوں کی طرح بھڑک اٹھیں۔ بچوں ' نوجوانوں اور بوڑھوں کے کورے اور زندہ جسموں کے جلنے کی بو فضا میں بس گئی۔ نفرت کے اژدھے نے امن اور محبت کے سورما سپاہی زکی انورؔ کو نگل لیا۔ شعلوں کی زبان نے سہمے ہوئے کمسن بچوں کو ایک آن میں خاکستر کے ڈھیر میں بدل دیا۔ اور اس طرح دنیا میں 'بچوں کے سال' کی عالمی تقریبات کا آغاز ہوا۔"19ؔ

جدیدیت کے نقاد ادب میں غیر جانبداری کی حمایت کرتے ہیں اور اس سلسلے میں یہاں تک لکھ دیتے ہیں کے تخلیق کار رفنکار کو اپنے فن پارہ سے بالکل غیر جانبدار ہونا چاہیے۔قمر رئیس نے اپنے عہد کی اس آواز کو بھی بغور سنا' دیکھا پرکھا اور پھر ستمبر 1979ء یعنی عصری آ گہی کے پانچویں پرچہ میں اداریہ لکھا تو اس غیر جانبداری ہی کو اداریہ کا موضوع بنایا۔اقتباس دیکھئے۔

"فی الحقیقت یہ ممکن نہیں ہے۔ ان جرائد کی ایک ایک سطر ان کی طرفداری کی چغلی کھاتی ہے اور اگر ان کے اس دعوے کو درست مان لیا جائے تو بھی اس سے کم از کم یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ وہ موجودہ حالات' موجودہ نظام میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں وہ اس نظام کو بحالت موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ظالمانہ اونچ نیچ' بے انصافیوں ' بے رحمیوں اشتعال انگیزیوں' خوں ریزیوں ' استحصال' پیکار' کشیدگی' عدم تحفظ اور خون ووحشت پر قائم اس نظام سے گویا وہ مطمئن ہیں۔ ہم ایسی طرفداری کو نہ صرف پرفریب مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں بلکہ اسے طرفداری کا نہایت گھناؤنا اور بزدلانہ روپ جانتے ہیں۔"20ؔ

"عصری آ گہی" میں مضامین مقالات' افسانے' تجزیاتی مطالعے اور انٹرویو ادبی نقطہ نظر سے بڑے اعلیٰ

درجہ کے ہوا کرتے تھے لیکن اس رسالے کی اہم خصوصیت اس کے اداریہ ہوتے تھے جسے قمر رئیس لکھا کرتے تھے۔

''عصری آ گہی'' ماہنامہ تھا۔ اس رسالے کے آٹھویں شمارہ میں مدیر نے پریم چند کی کہانی ''پوس کی رات'' کے ایک اقتباس کو محور بنا کر اداریہ لکھا جو عصری حسیت میں بڑا معنی خیز اداریہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح پریم چند صدی تقاریب کے انعقاد کے موقع پر جب بعض ادبی گوشوں نے پریم چند کو دبی زبان میں فرقہ پرست قرار دینے کی سعی کی تو قمر رئیس نے عصری آ گہی میں ''پریم چند اور فرقہ واریت'' کے عنوان سے مسلسل چھ اداریے لکھے جو بقول ڈاکٹر علی احمد فاطمی:

''وہ ان کی ترقی پسندی ' علم دوستی اور انسان دوستی کے زبردست مظہر ہیں ''21

اسی طرح جب قمر رئیس نے ''عصری آ گہی'' کا افسانہ نمبر شائع کیا تو اس کا اداریہ ''افسانے کی شناخت'' کے عنوان سے لکھا جو اداریہ کم ایک مبسوط مقالہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ قمر رئیس کے اس اداریہ کو شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون ''افسانے کی حمایت میں'' کے ساتھ پڑھنا چاہئے تا کہ دونوں نقادانِ ادب کے نقاط نظر کا واضح انداز میں علم ہو سکے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کے نقطہ نظر سے لکھا تھا جس میں پلاٹ اور وحدت تاثر کے بجائے کہانی کہنے کے اسلوب کو ترجیح دی گئی ہے جبکہ قمر رئیس نے افسانے کے فن' ہیئت' کہانی میں علامت کی ضرورت وافادیت' کہانی میں جدید حسیت اور وحدت تاثر کو افسانے کے بنیادی عناصر قرار دیا ہے۔

قمر رئیس نے علی گڑھ میں دو برس درس اور پھر ادیب کی ادارت کے فرائض بحسن خوبی انجام دئے اور ایک برس علی گڑھ میگزین کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے اپنے ذوق وشوق اور اداریوں کے ذریعے انمٹ نقوش چھوڑے۔ اسی طرح انہوں نے عصری آ گہی 1979ء سے 1982ء تک شائع کیا اور تقریباً ان تین برسوں میں انہوں نے رسالے کے مشمولات اور اپنے اداریوں سے اُردو ادب کے بدلتے بلکہ بگڑتے ہوئے رجحان کو روایت کا پاسدار بنایا اور چیستان بنتی ہوئی علامت نگاری کو'' علامتی حقیقت نگاری'' کا پیکر عطا کیا۔ 1982ء میں حکومت روس کی دعوت پر بحیثیت مہمان پروفیسر قمر رئیس تاشقند روانہ ہوئے اور ''عصری

آ گہی'' کی اشاعت محدود ہوگئی۔ڈاکٹرعلی احمد فاطمی عصری آ گہی کی ان تین برس کی مجموعی ادبی وسماجی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قمر صاحب یہ رسالہ صرف تین سال ہی نکال پائے لیکن اس مختصر سے عرصے میں انہوں نے مضامین کے تعلق سے بالعموم اور اپنے اداریوں کے توسط سے بالخصوص گمراہ کن جدیدیت کا بھر پور مقابلہ کیا اور اس کے مقابلے میں ترقی پسندی کی عصری اور فکری معنویت پر زور دیا اور حقیقت نگاری اور علامت نگاری کے درمیان ''علامتی حقیقت نگاری'' کی اصطلاح استعمال کی۔''22

قمر رئیس کو رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کرنے میں شروع ہی سے ملکہ حاصل رہا ہے چنانچہ ادبی صحافت کی دنیا میں قدم رکھنے کے پہلے ہی سال انہوں نے درس کا ''انتقاد نمبر'' اور ''اصناف سخن نمبر'' شائع کیا تھا پھر ''ادیب'' کا ''انشائیہ نمبر'' شائع کیا۔قمر رئیس نے عصری آ گہی کے بھی دو خصوصی شمارے شائع کئے ''افسانہ نمبر'' اور ''راجندر سنگھ بیدی نمبر''۔''عصری آ گہی'' کی ادبی قدر و منزلت کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''قمر رئیس نے ''عصری آگہی'' کے ذریعے بعض حیرت انگیز باتیں لکھیں.......... تلاش وتوازن سے ''عصری آگہی'' کے بعض اداریوں اور مضامین تک قمر رئیس نے اچھی خاصی ادبی مسافت طے کی ہے۔23

ڈاکٹر علی احمد فاطمی ''عصری آ گہی'' کا تقابل ''شاہراہ'' اور ''نیا ادب'' سے کرتے ہوئے عصر حاضر میں اس رسالے کی شناخت کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر دو چار سال ''عصری آگہی'' اور چل جاتا تو ''شاہراہ'' اور ''نیا ادب'' کی صف میں کھڑا ہوجاتا۔ پھر بھی نئی ترقی پسندی نئی حسیت کی شناخت میں ''عصری آگہی'' کا رول ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔24

تاشقند سے لوٹنے کے بعد قمر رئیس نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کا جشن زرین لندن اور پھر ہندوستان میں

منایا۔ پھر کچھ عرصہ دم سادھ کر انہوں نے 1991ء میں ''عصری آ گہی'' کو دوبارہ شائع کیا لیکن اس بار سہ ماہی مجلّہ کی حیثیت سے۔ دور ثانی کے پہلے شمارہ میں اداریہ سپرد قلم کرتے ہوئے ادبی مجلّہ کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

> ''ادبی مجلوں کا بڑا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ نئے تخلیقی رجحانات اور نظریاتی سوالوں پر سنجیدہ بحث کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ نئے تجربوں کی حوصلہ افزائیں کرتے ہیں۔ ادب اور قاری کے درمیان اعتبار اور ابلاغ کے نازک رشتے کو روشن اور مضبوط بناتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کام ہمارے یہاں نہیں ہورہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر لکھنے والے گھٹن اور بے چینی محسوس کررہے ہیں۔ اُردو کے بہت سے نوجوان ادیب مستقلاً ہندی میں لکھنے لگے ہیں اور کچھ نے بیزار ہوکر لکھنا ترک کردیا ہے۔ دوسری جانب سنجیدہ قارئین اچھی اور معیاری تخلیقات میسر نہ ہونے پراداسی اور ناآسودگی کا شکار ہیں۔''25؎

''عصری آ گہی'' کا دور دوم مختصر ثابت ہوا اور چند ہی اشاعتوں کے بعد 1993ء میں طباعت کے سلسلے میں بشیر احمد سے نزاع پیدا ہو جانے کی بنا پر قمر رئیس نے ''عصری آ گہی'' کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔

قمر رئیس نے عصری آ گہی کو بند کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مارچ 1993ء میں ''نیا سفر'' کے نام سے ایک اور سہ ماہی رسالہ شائع کیا۔ جون 1993ء میں نیا سفر کا دوسرا شمارہ ''جوش ملیح آبادی نمبر'' کی صورت میں شائع ہوا۔ جوش نمبر کے بارے میں ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔

> ''یہ خاص نمبر بھی اہل ذوق میں داد وتحسین طلب رہا۔ اس میں جوش کی شاہکار نظموں کا ایک انتخاب بھی ہے۔ اس کے علاوہ جوش کی شخصیت ' فنی اسالیب اور افکار واقدار کے بارے میں سترہ مضامین شامل ہیں۔ جس میں دو مضامین مدیر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ بعد میں یہ شمارہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔26؎

1994ء میں نیا سفر کا چوتھا شمارہ ''ہم عصر زندگی اور ادب نمبر'' کے طور پر شائع ہوا۔ یہ رسالہ دراصل اسی موضوع پر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار میں پیش کئے گئے ''فکر انگیز'' مقالات پر مشتمل ہے۔ اس خاص نمبر کا اداریہ قمر رئیس نے ''نئی پیڑھی کی شناخت اور جدیدیت'' کے عنوان سے لکھا تھا۔

مارچ 1995ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس ایک عرصہ بعد حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ قمر رئیس نے اس کانفرنس میں پیش کئے گئے مقالات اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا تحریر کردہ رپورتاژ بنام 'یاترا' نیا سفر کے پانچویں شمارہ میں شائع کیا۔ اسی شمارہ میں قمر رئیس کی ترک وسفر نامہ اُزبکستان کی پہلی قسط ''نو آزاد جمہوریۂ ازبکستان: تاثراتِ سفر'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ قمر رئیس نے 1997ء میں اپنا سفر نامہ مکمل کیا اور ''ازبکستان انقلاب سے انقلاب تک'' کے نام سے شائع کیا۔(27)

نیا سفر کا چھٹا شمارہ 1996ء میں شائع ہوا۔ اس شمارہ کے اداریہ میں قمر رئیس نے رسالے کے تاخیر سے شائع ہونے کے اسباب بیان کئے ہیں جس میں ایک وجہ قمر رئیس کی ناسازی طبیعت بھی تھی۔ اسی شمارے سے نیا سفر کو بجائے سہ ماہی ششماہی کردئے جانے کی اطلاع بھی قارئین کو دی گئی ہے۔

مارچ 1997ء میں حکومت ہند نے قمر رئیس کو ڈائریکٹر انڈین کلچرل سنٹر' تاشقند نامزد کیا۔ قمر رئیس نے ازبکستان روانگی سے قبل اپنے رسالے ''نیا سفر'' کو انجمن ترقی پسند مصنّفین کے سکریٹری علی احمد فاطمی کے حوالے کیا جو تا حال اس رسالے کو پابندی سے شائع کررہے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی اپنے ایک مضمون میں ''نیا سفر'' کے ادبی سفر پر اظہار خیال کرتے ہوئے قمر رئیس کے نظریات کی بابت لکھتے ہیں:

> ''نیا سفر کے اداریوں میں' اپنی دوسری تقریروں وتحریروں میں نئی حقیقت پسندی (New Realism) کی معرفت اور تہہ دار معنویت پر پرزور طریقے سے لکھتے رہے۔ اپنے رسالہ میں نئے افسانہ نگاروں ' شاعروں کو شائع کرتے رہے۔ انہیں تخلیقی ایوارڈ بھی دیتے رہے۔ لیکن ان سب کا یہ مقصد نہیں کہ انہوں نے کہیں اپنی بنیادی فکر سے سمجھوتا کرلیا ہو یا وہ اپنی راہ سے ہٹ گئے ہوں۔ انہوں نے ان سب کے ذریعہ اپنی

نظریاتی وسعت کا ثبوت دیا اور ثابت کرنا چاہا کہ ترقی پسندی ایک وسیع نظام فکر کا نام ہے' انہوں نے بار ہا کہا کہ ترقی پسندی تبدیلیوں کا استقبال کرتی ہے جو لوگ زمانے کی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتے وہ زمانے کا ساتھ بھی نہیں دے سکتے۔ مارکسزم سماجی ومعاشی تبدیلیوں کا تو نام ہے ہی' خود احتسابی کا بھی نام ہے اور قمر رئیس ہمیشہ محاسباتی عمل سے دو چار رہے ہیں۔ ان کی فکر میں ' ان کی شخصیت میں ایک خوشگوار قسم کی لچک ہے۔ وہ انجمن میں ہمیشہ ہردلعزیز رہے اور نئے لوگ ان سے وابستہ ہوتے رہے۔ ''28

قمر رئیس کی صحافت کا مطالعہ' اُردو کے ایک نظریہ ساز ترقی پسند ادیب وشاعر کی ادبی شخصیت کے ایسے پہلو کو روشن کرتا ہے جسے عموماً نظر انداز کیا گیا ہے۔ قمر رئیس کی ادبی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے عموماً سرسری انداز میں اُن کے زیر انتظام واہتمام شائع ہونے والے رسائل کے نام گنادئے جاتے ہیں اور بس۔

قمر رئیس نے صحافت کے ذریعے از ابتداً تا انتہا (درس سے نیا سفر تک) عصری حسیت کے تقاضوں کے مطابق اداریہ ہی نہیں لکھا بلکہ ارباب قلم سے مضامین ومقالات قلمبند کروائے اور خود خصوصی نمبر بھی شائع کئے۔ انشائیہ نمبر' افسانہ نمبر' پریم چند نمبر اور جوش نمبر اُن کی صحافتی خدمات کے بولتے نمونے ہیں۔ اُردو ادب کی دنیا کا یہ کامیاب مدرس' صحافت کی دنیا کا بھی بہترین شہسوار قرار پاتا ہے۔

ترجمہ اور ترجمہ نگاری

ترجمہ اور ترجمہ نگاری کے تعلق سے قمر رئیس کی خدمات کا دو زاویے سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلا زاویہ یہ ہوسکتا ہے کہ اُن کے تراجم پر گفتگو کی جائے۔ دوسرا زاویہ یہ ہوسکتا ہے کہ اُنہوں نے ''ترجمہ کا فن اور روایت'' کے نام سے جو کتاب ترتیب دی ہے اُس کا محاسبہ کیا جائے۔ قمر رئیس کے تراجم پر ازبکستان سے متعلق مقالے کے چھٹے باب میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی اس لیے کہ اُنہوں نے زیادہ تر ازبکی شاعری کے ترجمے کیے ہیں۔ البتہ اس ضمن

میں اُن کی ایک کتاب ''آزاد ہندفوج کی کہانی'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

ترجمہ اور ترجمہ نگاری کے حوالے سے قمر رئیس کی کتاب ''ترجمہ کا فن اور روایت'' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اُنہوں نے یہ کتاب اپنے دوست جناب بہار الہ آبادی کی فرمائش اور پیہم اصرار پر مرتب کی ہے۔ دراصل بہار الہ آبادی کا اصرار تو ایک عرصہ سے جاری تھا لیکن جب دہلی یونیورسٹی میں ترجمہ کا ایک سندی مضمون پڑھایا جانا شروع ہوا تو قمر رئیس نے اپنے دوست کی خواہش کو شرمندہ تعبیر کرنے کا بہترین موقع متصور کیا اور ترجمہ کے فن پر دس مقالات اور ترجمہ کی روایت پر آٹھ مقالات یکجا کرتے ہوئے اپنے مقدمہ کے ساتھ 1976ء میں ''ترجمہ کا فن اور روایت'' شائع کی۔

قمر رئیس نے اپنے مقدمہ میں ترجمہ کی ضرورت وافادیت' ترجمہ کے ذریعہ تہذیبی وتمدنی علوم کی ترسیل وابلاغ' ترجمہ کے ذریعہ عالمی ادب سے واقفیت پر روشنی ڈالنے کے بعد اُردو میں ترجمہ کی ابتدأ پر اظہار خیال کیا ہے۔ ادبی تصنیفات کے ترجمہ کے سلسلے میں مترجم کو جن اُمور پر دسترس ہونی چاہئے ان کا بیان کرتے ہوئے مترجم کے لئے قمر رئیس نے پانچ بنیادی شرطیں بیان کی ہیں۔ اقتباس دیکھئے۔

> ''ادبی تصنیفات کے ترجمہ کے سلسلہ میں کچھ بنیادی ضرورتیں اور شرطیں ایسی ہیں جن کی تکمیل بہرحال ضروری ہے۔ مترجم کو دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے کسی بھی زبان کی تصنیف کو کامیابی سے اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لئے پہلی شرط یہی ہے کہ اصل تصنیف کی زبان ' اس کے ادب اور اس کی قومی تہذیب سے نہ صرف واقفیت بلکہ دلچسپی اور ہمدردی ہو۔ دوسری اہم شرط اپنی زبان پر اس کی قدرت اور نئے خیالات کے اظہار کے لئے نئے الفاظ ' ترکیبیں اور اصطلاحیں وضع کرنے کی استعداد ہے۔ تیسری ضرورت اصل تصنیف کی زبان سے ایسی گہری واقفیت ہے کہ وہ اس کی باریکیوں ' نفاستوں اور تہ داریوں کو بخوبی سمجھ سکے۔ چوتھی یہ کہ

اصل تصنیف جس عہد اور جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس عہد کی زندگی اور زبان اور اس موضوع کی اہم تفصیلات سے مترجم کی واقفیت ہو۔ اور آخری لیکن سب سے اہم شرط ادبی ترجمہ کی صلاحیت ' دلچسپی اور شوق وانہماک ہے۔ اگر یہ نہیں تو دوسری تمام شرطوں کی تکمیل بھی کامیاب ترجمہ کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ تمام ضرورتیں تو ترجمہ کے سلسلہ میں مبادیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔''34؎

ڈاکٹر قمر رئیس نے ترجمہ کی مبادیات' ترجمہ کی مشکلات اور ترجمہ کے تقاضوں کا بیان مشرق ومغرب کے مختلف ادیب ومفکرین کے حوالے سے کیا ہے چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر جانسن' فرانسیسی شاعر پال ویلری' ڈاکٹر بچن' شری کانت ورما' اور روسی نقاد بلنسکی کے اقوال نقل کرتے ہوئے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔

قمر رئیس نے اُردو ترجمہ کی روایت پر اظہار خیال کے دوران قدیم اُردو نثر میں موجود ترجموں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''قدیم کلاسیکی عہد میں اُردو شاعری کے سرمایہ سے قطع نظر ' نثر کی بیشتر کتابیں فارسی ادب کا ترجمہ ہیں۔ سب رس' کربل کتھا' نوطرز مرصّع' باغ وبہار' گنج خوبی' آرائش محفل اور انیسویں صدی کی دوسری بے شمار داستانیں' سب ترجمہ ہی سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ کس نوعیت کا ہے؟ اس کے پیچھے اگر کچھ اُصول کچھ مقاصد کارفرما رہے ہیں تو وہ کیا ہیں؟ مترجم نے کہاں تک اصل سے دیانت داری برتی ہے۔ کہاں متن سے انحراف کیا گیا ہے؟ اگر آزاد ترجمہ ہے تو مترجم کے ذہن میں آزادی کا کیا مفہوم اور مقصود تھا؟ان ترجموں نے کس طرح اور کس حد تک اُردو زبان اور اُردو نثر کے اسالیب کو متاثر کیا؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات پر کسی عالم نے سنجیدگی سے غور وخوض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ نہ ہی اس مقصد سے اصل متن اور ترجمہ کی عبارت کا تقابلی

مطالعہ کیا گیا۔ یہ کام ملک کی دوسری زبانوں میں ہوا ہے اور ہورہا ہے لیکن اُردو میں کیا افراد اور کیا ادارے کسی نے بھی اس موضوع کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔'' 35ء

قمر رئیس نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ سب رس' کربل کتھا' نوطرز مرصّع اور آرائش محفل کو ترجمہ سمجھنے کے باوجود تا حال ان نثری تصانیف کا تقابلی مطالعہ اصل ماخذ سے نہیں کیا گیا ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس بات کا ضرور علم ہوتا کہ مترجم نے کہاں تک اصل کتاب سے لفظی ترجمہ کیا ہے اور کس حد تک آزاد ترجمہ سے کام لیا ہے۔ اسی کے ساتھ مترجم کے ترجمہ کی خوبیاں بھی سامنے آجاتیں لیکن ہمارے محققین نے صرف اصل ماخذ کی نشاندہی پر عموماً اکتفا کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی موقر تصنیف ''اُردو کی نثری داستانوں'' میں یقیناً ماخذ کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اُن اجزا کی بھی نشاندہی کی ہے جو کہ مترجم کی طبع زاد ہیں یا پھر دوسری تصانیف سے ماخوذ ہیں مثلاً باغ و بہار یا سب رس۔ لیکن انہوں نے مترجم کے ترجمہ کی خوبی یا خامی' اُس کی تشکیل شدہ اصطلاحات' اُس کی شعریات پر اظہار خیال نہیں کیا ہے۔

قمر رئیس اپنے مقدمہ میں مغرب میں لفظی اور آزاد ترجمہ کے تقاضوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مغرب میں ترجمہ کے جن دو نظریوں پر زور دیا جاتا رہا ہے انھیں آزاد اور لفظی ترجمہ کا نام دیا گیا ہے۔ دونوں کا مقصد اصل تخلیق کو دوسری زبان کے قارئین تک اس طرح پہنچانا ہے کہ اس کی معنوی اور ظاہری ہئیت میں وحدت قائم رہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اول الذکر میں اصل تصنیف کے تخلیقی اور جمالیاتی عناصر پر زور دیا جاتا ہے اور موخر الذکر میں اس کی معنویت پر۔ حقیقت میں لفظی ترجمہ کو دیانت دارانہ ترجمہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یعنی یہاں اصل مصنف اور اس کی تصنیف سے وفاداری ترجیحی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زبان اور الفاظ اساسی طور پر خیال کے ابلاغ کا ذریعہ ہیں اور ترجمہ میں بھی توجہ اس خیال کو منتقل کرنے پر ہوتی ہے' جس کی علامت اصل متن میں کوئی لفظ ہوتا ہے لیکن دشواری یہ ہے

کہ تخلیقی ادب میں کم وبیش ہر لفظ خیال کے ساتھ ساتھ تاثر کیفیت اور ایک مخصوص فضاء کے اظہار کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہی وصف اس کی ایمائی قوت اور تخلیقی حسن کی دلیل ہوتا ہے۔ اسے نظر انداز کرکے الفاظ کے صرف لغوی معنیٰ پر اصرار کو دیانت داری کے بجائے کوئی اور نام دیا جانا چاہئے۔ لیکن اس کا جو حل آزاد ترجمہ کے حامیوں نے (بالخصوص شاعری کے ترجمہ میں) تلاش کیا ہے اسے بھی تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ترجمہ کو تخلیقی بازآفرینی کا عمل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ اصل تخلیق سے پیدا ہونے والے تاثرات میں اس طرح ڈوب جائے کہ وہ اس کا اپنا تجربہ معلوم ہوں۔ پھر وہ تخیل کی مدد سے اُن تاثرات کو اپنی ہی زبان کے ایسے پیکر میں ڈھالے کہ اس زبان کے قارئین کبھی اس کے تاثرات سے اسی طرح محفوظ ہوں جس طرح وہ خود ہوا تھا۔'' 36

اصل متن کی بازآفرینی کا مطالبہ مترجم سے مناسب معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ اس طرح تو مترجم اپنے تاثرات کے ذریعہ ایک نئی تخلیق نہیں کرے گا۔ضروری نہیں کہ مترجم کا تاثر کسی فن پارے کو پڑھتے اور ترجمہ کرتے ہوئے ویسا ہو جو کہ اصل فنکار کا رہا ہے' زمان ومکان کے فرق اور زبان کے مزاج کے فرق کی وجہ سے تاثر کی بازآفرینی اصل فن پارہ کی روح کو مجروح کردیتی ہے۔قمر رئیس نے مغرب کے اس تقاضے پر اظہار خیال کرتے ہوئے بڑی اچھی بات لکھی ہے۔اقتباس دیکھئے:

''ظاہر ہے کہ زمان ومکان کے مختلف نقطوں سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد پر اصل تخلیق کے تاثرات بھی مختلف ہوں گے۔ ہر مترجم اپنے مخصوص تجربات اور اپنی ذہنی اور جذباتی افتاد کے آئینہ میں ہی اصل تخلیق کے تاثرات قبول کرے گا اور پھر ان کی تخلیقی صورت گری میں اس کے تخیل کی منفرد کائنات اثر انداز ہوگی۔ اس طرح وہ ترجمہ کے نام پر جو کچھ پیش کرے گا ضروری نہیں کہ وہ اصل تخلیق سے مطابقت رکھتا

ہو۔"37

قمر رئیس نے مقدمہ میں اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ اُردو کو مقبول عام بنانے میں "یورپی بالخصوص انگریزی علوم وادب کے تراجم نے اہم رول ادا کیا ہے" (38) اُردو میں ترجمہ کی روایت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُردو کے ابتدائی تراجم کا احوال انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

> "ان ترجموں کا آغاز یوں تو مشنری اداروں اور بعض افراد کے ہاتھوں اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہوگیا تھا لیکن اس کی رفتار ومعیار میں تیزی اور نتیجہ خیزی انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی پیدا ہوئی۔ جہاں تک انگریزی سے ترجمہ کا تعلق ہے فورٹ ولیم کالج کا کارنامہ صرف چند لغات کی تدوین تک محدود ہے یا پھر چند کہانیوں اور ڈراموں کے اقتباسات کے ترجمے ہیں جو جان گلکرسٹ نے نمونے کے طور پر کئے یا کرائے تھے۔ دلی کالج میں اس کے پرنسپل بوترد کی رہنمائی میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام 1841ء میں عمل میں آیا۔ لیکن اس سے تین سال قبل حیدرآباد میں نواب فخر الدین خاں شمس الامرائی سائنسی علوم کے انگریزی رسائل کے ترجمہ اور طباعت کا انتظام کرچکے تھے۔"39

ڈاکٹر محمد انورالدین نے اپنی تصنیف "حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل" میں شمس الامرأ کے مطبع کے ذریعے شائع ہونے والے سائنسی رسالے کی تفصیل پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں مولوی عبدالحق نے بھی اپنے ایک مضمون میں نواب شمس الامرأ کے مطابع کی اشاعتوں کا تذکرہ کیا ہے جس کا بیان قمر رئیس نے بھی کیا ہے۔

قمر رئیس نے نواب شمس الامرأ کے مطبع کے تراجم کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اودھ کے نواب محمد علی شاہ، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ کشمیر کے مطابع میں ہوئے تراجم کا بیان کرتے ہوئے انجمن ترقی اُردو اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد اور جامعہ ملیہ کی ترجمہ کی بابت خدمات کا بیان کیا ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''دارالترجمہ کے اراکین نے ان اصولوں' اصطلاحوں اور نمونوں سے پورا فائدہ اٹھایا جو اُن کے پیشرو افراد اور اداروں کی محنت اور اختراعی قوت کا ثمرہ تھے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مغربی علوم کے ترجمے اور اصطلاح سازی کے ذریعہ دارالترجمہ حیدرآباد نے اُردو کو دانشِ جدید سے مالا مال کرنے میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اُن کی مثال ہندوستانی زبانوں کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔'' 40

ترجمہ کا فن اور اُردو میں ترجمے کا آغاز بیان کرنے کے بعد قمر رئیس نے اُردو میں تخلیقی تراجم کی ابتدا پر اظہار خیال کیا اور پھر عالمی ادب کے اُردو میں تراجم اور اُن کے مترجمین کی طویل فہرست درج کی ہے۔ قمر رئیس نے مشینی تراجم پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور انہوں نے مشینی تراجم کو 'خام ترجمے' لکھا ہے۔ قمر رئیس نے ''ترجمہ کا فن اور روایت'' 1976ء میں مرتب وشائع کی ہے لیکن یہ اُن کے دانش کی دلیل ہے کہ ترجمہ کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے ترقی یافتہ ممالک میں ترجمے کی بابت ہونے والی سائنسی ترقی پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ درس وتدریس میں ضروری ہوتا ہے کہ طالب علم کو فن کے ہر پہلو سے واقف وباخبر کرایا جائے۔ جو مدرس ایسا کرتا ہے وہی تدریس میں کامیاب ہوتا ہے۔ قمر رئیس نے ترجمہ فن اور روایت پر یہ کتاب طلبا کی تدریسی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے مرتب کی ہے۔ غالباً اس بات کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ قمر رئیس نے اپنے مقدمہ کو Sumup کرتے ہوئے موجودہ عہد میں ترجمہ کی ضرورت وافادیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

''ترجمہ کے بغیر آج کوئی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی اور ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے شوق وصلاحیت ہی نہیں مشق ومزاولت اور اصولی واقفیت بھی درکار ہے۔ اصطلاح سازی کے اصول اور طریقے' ترجمہ کے مختلف نظرئیے' ترجمہ میں زبان واسلوب کے مسائل' ترجمہ کے اقسام... ان تمام پہلوؤں سے

واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی زبان میں ترجمہ کی روایت، اس کے رجحانات اور مختلف اداروں اور افراد کے ذریعہ اس کی نشوونما کا علم بھی ضروری ہے۔" 41

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب میں ترجمہ کا فن کے تحت ذیل کے مصنّفین کے مضامین یکجا کئے ہیں۔

1۔ وحیدالدین سلیم	اصول وضع اصطلاحات
2۔ پروفیسر آل احمد سرور	تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل
3۔ پروفیسر محمد حسن	ترجمہ، نوعیت اور مقصد
4۔ڈاکٹر ظ انصاری	ترجمے کے بنیادی مسائل
5۔ڈاکٹر جمیل جالبی	ترجمے کے مسائل
6۔نصیر احمد	ترجمہ اور لسانیات
7۔ڈاکٹر عنوان چشتی	منظوم ترجمے کا عمل
8۔تھیوڈر سلوری / آصفہ جمیل	آزاد اور لفظی ترجمہ
9۔ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	اُردو میں تراجم کے مسائل
10۔شہباز حسین	ترجمہ کی اہمیت

مندرجہ بالا دس مضامین ترجمے کے فن پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس فہرست کا پہلا مضمون "اُصول وضع اصطلاحات"، مولانا وحیدالدین سلیم کا تحریر کردہ ہے جو کہ اُن کی تصنیف افادات سلیم سے اخذ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے وضع اصطلاحات سے متعلق اس مضمون کو اپنی مرتبہ کتاب میں اولیت عطا کرتے ہوئے اس بات کا ثبوت پیش کیا ہے کہ وہ اُردو میں ترجمہ کی اہمیت وافادیت پر گہری نظر رکھتے ہیں اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ترجمہ کے سلسلے میں وضع اصطلاحات پہلی منزل ہوتی ہے جسے سمجھے بغیر ترجمہ کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ترجمہ کی روایت کے تحت ڈاکٹر قمر رئیس نے حسب ذیل مصنفین کے مندرجہ ذیل مضامین اپنی کتاب میں شامل کئے ہیں۔

1۔ سید احتشام حسین — اُردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب

2۔ میر حسن — اُردو میں وضع اصطلاحات کے مسائل

3۔ ڈاکٹر اصغر عباس — سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم

4۔ ڈاکٹر عبدالحق — مذہبی تصنیفات کے اُردو تراجم

5۔ ڈاکٹر اطہر پرویز — اردو میں بچوں کے ادب کے تراجم

6۔ عبدالقادر سروری — مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ

7۔ سید ضمیر حسن — دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

8۔ ڈاکٹر امیر عارفی — دارالترجمہ عثمانیہ

ڈاکٹر قمر رئیس کی مرتبہ کتاب ''ترجمہ کا فن اور روایت'' کا مطالعہ ختم کرنے سے پیشتر دو باتوں کی جانب اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اول یہ کہ قابل مرتب نے کتاب کے حصہ دوم ترجمہ کی روایت میں میر حسن کا لکھا مضمون ''اُردو میں وضع اصطلاحات کے مسائل'' شامل کیا ہے۔ اس مضمون میں میر حسن نے وضع اصطلاحات کے دوران درپیش مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے اُردو ادب کی تاریخ کے پس منظر میں وضع اصطلاحات کی روایت قلمبند نہیں کی ہے۔ اس نسبت کے تحت میر حسن کا یہ مضمون مولانا وحید الدین سلیم کے مضمون ''اُصول وضع اصطلاحات کے ساتھ'' ترجمہ کا فن میں شامل کیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر امیر عارفی نے اپنے مضمون کا عنوان ''دارالترجمہ عثمانیہ'' تجویز کیا ہے۔ 1948ء سے قبل یعنی آزادی سے قبل موجودہ عثمانیہ یونیورسٹی کو جامعہ عثمانیہ کے نام نامی سے یاد کیا جاتا تھا اور اسی مناسب سے قدیم کتب میں (جیسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تصنیف عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی) میں دارالترجمہ کو ہمیشہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عارفی اگر اپنے مضمون کا عنوان ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ'' قرار دیتے تو مناسب ہوتا۔

ترتیب وتدوین

قمر رئیس کی علمی وادبی خدمات میں، اُن کی مرتب کردہ تصانیف کی جداگانہ اہمیت ہے۔ انہوں نے اپنی تدریسی زندگی کے ابتدائی زمانے ہی سے تصانیف کی ترتیب وتدوین کا فرض بہ احسن وخوبی انجام دیا ہے۔ قمر رئیس کی مرتبہ، ترتیب شدہ اور تدوین کردہ تصانیف کی تعداد سولہ 16 ہے۔ انہوں نے جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی وہ مضامین پریم چند ہے جو کہ 1960ء میں شائع ہوئی۔ ان تصانیف کو حسب ذیل چار مختلف زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) تدریسی نقطہ نظر سے مرتبہ تصانیف

(ب) مختلف سمینار میں پیش کئے جانے والے مقالات کی ترتیب پر مشتمل تصانیف

(ج) کسی اکیڈیمی/ادبی ادارہ کی خواہش پر یا اپنی دلچسپی کی بنا پر مرتبہ تصانیف اور

(د) تحقیقی نقطہ نظر سے تدوین کی گئی تصانیف

ذیل میں قمر رئیس کی ترتیب وتدوین کی گئی تصانیف کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

قمر رئیس کی مرتبہ کتاب ''اُردو ڈرامہ'' 1961ء میں ''جامعہ اُردو علی گڑھ کی تحریک'' (29) پر مرتب وشائع ہوئی۔ قمر رئیس ''اُردو ڈرامہ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> ''یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اُردو زبان وادب کی اعلیٰ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں اب تک ڈرامہ کو کوئی نمائندہ یا نمایاں حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے جامعہ اُردو مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اُردو ڈرامہ کا یہ نمائندہ لیکن مختصر انتخاب اپنے سب سے اعلیٰ امتحان 'ادیب کامل' کے لئے منظور کیا ہے۔'' (30)

قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب ''اُردو ڈرامہ'' پر ایک مبسوط و مدلّل مقدمہ لکھا ہے جو کتاب کے صفحہ 7 سے 48 تک محیط ہے۔ اپنے مقدمہ کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں فن ڈرامے اور اُس کے اجزائے ترکیبی کا بیان کیا ہے۔ یہ حصہ مقدمہ کے ابتدائی اکیس صفحات یعنی 7 تا 28 پر محیط ہے۔ مقدمے کے دوسرے حصے میں مرتب نے اُردو ڈرامہ نگاری کے عنوان کے تحت اُردو میں ڈرامے کی ابتدا اور عصر حاضر تک اُس کی روایت کا بیان کیا ہے۔ قمر رئیس، نے مقدمہ کے پہلے حصے میں فن ڈرامہ، ڈرامے کے مختلف اسالیب، ڈرامے کی اقسام، بیان کرنے کے بعد ڈرامے کی ہیئت/اجزائے ترکیبی کا تفصیل سے بیان کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ڈرامے کا ہر جز و قاری کو بہ آسانی سمجھ میں آجائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مندرجہ ذیل ضمنی و ذیلی عنوانات قائم کئے ہیں:

(1) فن ڈرامہ

(2) ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی۔ اس سرخی کے تحت انہوں نے (الف) قصہ اور پلاٹ، (ب) اشخاص اور کردار نگاری، (ج) مکالمہ، (د) موضوع اور مقصد پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں انہوں نے ڈرامے کی قسمیں (1۔ ناٹک، 2۔ پرکرن، 3۔ بھان، 4۔ دیالوگ، 5۔ رہامرگ، 6۔ پیرہن) بیان کی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ڈرامے کے موضوع المیہ و طربیہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایکانکی ڈرامہ و نشری ڈرامہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایکانکی ڈرامے سے قمر رئیس کی مراد ایک بابی ڈرامہ ہے۔

''اُردو ڈرامہ'' پر لکھے گئے مقدمہ کا دوسرا حصہ ''اُردو ڈرامہ نگاری'' 20 صفحات پر مشتمل ہے اور صفحہ 29 تا صفحہ 48 پر محیط ہے۔ قمر رئیس نے اس حصے میں اُردو ڈرامے کی تاریخ و روایت پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے لیکن انہوں نے اُردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق بحث کرنے کے بعد اُردو ڈرامے کی تاریخ و روایت کے ہر اہم موڑ کو مقدمہ میں سمولیا ہے۔ ہم عصر فنکاروں پر لکھنا عموماً مشکل ہوتا ہے لیکن اس مختصر مقدمہ میں بھی قمر رئیس نے اپنے ہمعصر ڈرامہ نگاروں، امتیاز علی تاج، عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، فضل الرحمٰن، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، مرزا ادیب، جاوید اقبال، محمد حسن کے ڈراموں کے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور جدید ڈرامہ نگاروں میں حبیب تنویر، ریوتی سرن شرما، کرتار سنگھ دُگل اور ابراہیم یوسف کا صرف ذکر کیا ہے۔

قمر رئیس نے اپنے مقدمہ میں اُردو ڈرامے کی ترقی میں پارسی تھیٹر کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ اُردو ڈرامے کے آغاز پر پارسی تھیٹر نے سرپرستی کرتے ہوئے روایت کے فروغ میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ لیکن ایکبابی اور نشری ڈراموں کے ذکر میں قابل مرتب نے منٹو، کرشن چندر کے ہمراہ روبندر ناتھ اشک کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ 1958ء میں قمر رئیس کے دوست ڈاکٹر محمد حسن نے جب ''نئے ڈرامے''(31) کے نام سے اُردو کے جدید ڈراموں کا انتخاب کیا تو اُس میں روبندر ناتھ اشک کا ڈرامہ ''جونک'' بھی شامل کیا ہے۔ قمر رئیس اشکؔ کے ڈراموں کا مقدمہ میں تذکرہ ہی کر دیتے، غالباً یہ روح کے اندر متلاطم خیالات کی بنا پر چھوٹ گیا ہوگا۔ اس لئے کہ ایسے میں تحریر کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا۔ قمر رئیس نے اپنے مقدمہ میں اسی تصنیف میں شامل ڈراموں پر بھی اظہار خیال کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''چونکہ ڈرامہ کی روایات کا سرچشمہ قدیم یونان اور ہندوستان رہے ہیں اس لئے جامعہ کی نصاب کمیٹی کی سفارش پر ان ملکوں کے دو قدیم کلاسیکی ڈراموں کے تراجم (انتخاب) بھی شامل کئے جارہے ہیں۔''32

ڈرامے کی روایت اور تاریخ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم یونانی اور سنسکرت ڈرامے کی تاریخ اور روایت کو پہلے سمجھ لے تاکہ اُردو ڈرامے کی تعبیر و تفہیم میں آسانی ہو۔ قمر رئیس نے اسی غرض سے یونانی ڈرامہ نگار سوفوکلیز کا ڈرامہ انٹی گونی اور سنسکرت ڈرامہ نگار کالیداس کا ''شکنتلا'' منتخب کیا ہے۔ سوفوکلیز کے بارے میں ناٹک ساگر کے مولفین محمد عمر و نورالہی لکھتے ہیں کہ اُس نے یونانی اسٹیج کے سلسلے میں بنیادی اُمور متعین کئے اور ''اُس نے تقریباً ایک سو تیس ڈرامے لکھے۔''33

سوفوکلیز شاہد احمد دہلوی کا مترجم ہے اور شکنتلا کا ساغر نظامی نے ترجمہ کیا۔ ان دو ڈراموں کے بعد اُردو ڈرامے کی اولین کڑی ''اندر سبھا'' از سید آغا حسن امانت کو شامل کیا ہے اور پھر چھ ڈرامے اس طرح منتخب کئے ہیں کہ اُردو ڈرامے کی روایت امانت سے آغا حشر کاشمیری، سید امتیاز علی تاج سے ڈاکٹر سید عابد حسین تک پہنچتی ہے اور پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے ڈراموں کو شامل کیا ہے جن میں منٹو کا ''خودکشی''، کرشن چندر کا

''دروازہ'' اور ڈاکٹر محمد حسن کا ڈرامہ ''فٹ پاتھ کے شہزادے'' شامل کرتے ہوئے اُردو ڈرامے کی 1960ء تک کی تاریخ اور روایت کو اس کتاب کے ذریعے پیش کیا ہے۔

قمر رئیس نے بحیثیت یونیورسٹی ٹیچر بڑی فعال زندگی گزاری۔ انہوں نے درس وتدریس کے علاوہ شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کی روایت کے مطابق متعدد قومی اور بین الاقوامی سمینار منعقد کئے۔ قمر رئیس نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد عمومی کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے اس انجمن کے زیر اہتمام بھی مختلف اہم موقعوں پر سمینار منعقد کئے۔ شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر قمر رئیس کے پیش رو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے یہ روایت قائم کی تھی کہ شعبہ کے تحت جو سمینار منعقد کیا جاتا اُس میں پڑھے جانے والے مقالات کو وہ اُردو معلیٰ سیریز کے تحت کتابی شکل میں شائع کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے پیشرو کی اس روایت کو اپنے عہد صدارت میں بڑی استواری کے ساتھ قائم و برقرار رکھا چنانچہ انہوں نے شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سمیناروں میں مقالہ نگاروں کی جانب سے پیش کردہ مقالات کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قمر رئیس نے پانچ کتابیں مرتب کی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

1. اقبال کا شعور وفن (1979ء)
2. ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر (1987ء بہ اشتراک سید عاشور کاظمی)
3. اُردو میں لوک ادب (1990ء)
4. نیا افسانہ مسائل اور میلانات (1992ء بہ یاد عصمت چغتائی) اور
5. جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ (1993ء)

شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی نے جشن صد سالہ اقبال تقاریب کے سلسلے میں ایک سمینار 2 مئی 1979ء کو منعقد کیا تھا جس کا عنوان ''اقبال اور ان کا عہد'' تھا۔ قمر رئیس اس وقت شعبہ اُردو کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس سمینار کا انعقاد، انتظام و انصرام انہوں نے ہی کیا تھا۔ زیر مطالعہ کتاب ''اقبال کا شعور وفن عصری تناظر

میں'' اسی سمینار میں پیش کئے گئے مقالات پر مشتمل ہے جسے قمر رئیس نے اُردوئے معلیٰ سیریز کے تحت شائع کیا ہے۔ انہوں نے سمینار میں پڑھے گئے مقالات سے قبل حسب دستور ایک مختصر سا مقدمہ کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس مقدمہ پر 24 مئی 1979ء کی تاریخ درج ہے یعنی سمینار کے صرف 22 دن بعد یہ کتاب طبع ہوگئی تھی۔

سمینار کی تاریخ اور مقدمہ کی تاریخ ڈاکٹر قمر رئیس کے وسائل کی جانب تو اشارہ کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ اُن کی حرکیاتی ادبی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مقدمہ میں سمینار کے موضوع اور اس کتاب میں شائع ہونے والے مقالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''یہ مذاکرہ 'اقبالؔ اور ان کا عہد' کے عنوان سے 2 مئی 1979ء کو ہوسکا۔ کوشش اس بات کی کی گئی کہ اس مذاکرہ میں اقبالؔ کی کثیر الجہت فکری بساط اور فنی کمالات کا مطالعہ ان کے عہد کے تناظر میں کیا جائے۔ اقبالؔ نے اپنے عہد سے کیا لیا' کیا ردکیا اور کیا دیا؟ اپنے عہد کے مسائل' اس کے تمدنی اداروں' ذہنی رویوں' سیاسی نظریوں اور فنی جہتوں سے ان کا کیا رشتہ تھا' اس رشتے کے احساس وعرفان کو انھوں نے اپنی حکیمانہ بصیرت اور تخلیقی فکر کی کس سطح پر' کیسے جمالیاتی پیکروں میں ادا کیا؟ یہی اس مذاکرہ کا موضوع تھا۔

مقالات پڑھے گئے۔ فکر انگیز نکتے اور سوالات اٹھائے گئے۔ مقالہ نگار حضرات کے علاوہ خوش ذوق حاضرین نے بھی بحث میں حصہ لیا اور اسطرح موضوعِ بحث کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض حالات اور مجبوریوں کی بنا پر اس مجموعہ میں پروفیسر عبدالودود اظہر' ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر عبید اللہ ہاشمی کے مقالات شامل نہ ہوسکے۔ علی سردار جعفری صاحب نے بھی وعدہ کیا تھا کہ بحث میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں وہ ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر بھیج دیں گے لیکن افسوس ہے کہ ان کا مضمون بھی ہمیں دستیاب نہ ہوسکا۔'' 42

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ سمینار کا موضوع اقبال اوران کا عہد تھااوراسی موضوع کے متنوع جہتوں پر مقالہ نگار حضرات نے مقالے تحریر کئے ہیں۔ حقیقتاً یہ موضوع اور مقالات اقبال اور اُن کے عہد کو سمجھنے میں مدومعاون ہیں لیکن نجانے کیوں مرتب، نے کتاب کا عنوان سمینار کے موزوں سے جداگانہ تجویز لیا ہے۔ کتاب کا عنوان ہے ''اقبال کا شعور وفن عصری تناظر میں''۔ یہ صحیح ہے کہ یہ عنوان اقبال کے عہداوراُن کے فن ہی سے متعلق ہے لیکن اس بات سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ بہرحال سمینار کے عنوان سے علاحدہ جداگانہ ایک عنوان مرتب نے تجویز کیا۔اس کتاب کا عنوان ''اقبال اوراُن کا عہد'' اگر ہوتا تب بھی موضوع کی ترسیل وتبلیغ میں فرق نہ آتا۔

اس کتاب میں حسب ذیل مقالہ نگار حضرات کے مضامین شامل ہیں۔

حصہ (1)	پروفیسر آل احمد سرور	اقبال اور جمہوریت
	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اقبال اوراُس کا عہد
	پروفیسر مشیر الحق	اقبال: آوازِ شکست
	ڈاکٹر نورالحسن انصاری	اقبال اور معاصرین ایران
	جناب اصغر علی انجنیئر	اقبال اور تیسری دنیا
	ڈاکٹر وہاب اشرفی	اقبال کا عہداوراُن کی رومانیت
حصہ (2)	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	اقبال شاعر مشرق
	پروفیسر محمد حسن	اقبال اور عہداقبال
	جناب شبیر احمد غوری	اقبال اور زروان
	ڈاکٹر عنوان چشتی	اقبال اوراُس کا عہد: فنی جہات
	ڈاکٹر ابن فرید	اقبال کا عمرانیاتی مطالعہ

شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے منعقدہ سمینار کے مقالات کو شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھااوراسے اُردوئے معلیٰ سیریز کا نام دیا تھا۔ڈاکٹر قمر رئیس نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی اس

روایت کو باقی و برقرار رکھا بلکہ مزید پروان چڑھایا چنانچہ زیرِ مطالعہ قمر رئیس کی مرتبہ کتاب کو اُردوئے معلّٰی سیریز 2 قرار دیا گیا ہے۔ روایت کی پاسداری' استواری سے کی جائے تو وہ عین ایمان بن جاتی ہے!

ڈاکٹر قمر رئیس نے 1987ء میں "ترقی پسند ادب ۔ پچاس سالہ سفر" جیسی ضخیم کتاب سید عاشور کاظمی کے اشتراک سے مرتب کی۔ یہ کتاب کسی ایک سمینار یا کانفرنس میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کتاب کو مرتب کرنے کی تحریک لندن میں منعقدہ ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی تقاریب 1985ء اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد کردہ گولڈن جوبلی تقاریب سے ہوئی۔

لندن میں ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی تقاریب کا انعقاد اچانک کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے محرکات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد فاطمی پروفیسر قمر رئیس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "1984ء میں وہ فیض سمینار میں شرکت کرنے لندن گئے۔
> وہاں ان کی ملاقات سید عاشور کاظمی اور فارغ بخاری وغیرہ
> سے ہوئی۔ اچانک لندن میں گولڈن جوبلی تقریبات منانے کا
> خیال آیا........." 43

دراصل فیض سمینار کے منتظمین نے لندن میں اُردو دانشوروں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 15 جولائی 1984ء کو "یادِ سجاد ظہیر" منانے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر عاشور کاظمی نے ڈاکٹر قمر رئیس سے گولڈن جوبلی تقاریب لندن میں منانے کی بابت مشاورت کی۔ تفصیل سید عاشور کاظمی کی زبان سنئے۔ لندن کانفرنس منعقدہ اگست 1985ء کی رپورٹ میں وہ لکھتے ہیں:

> "15 جولائی 1984ء کا دن لندن کانفرنس کے حوالے سے
> ایک یادگار دن ہے۔ اس تاریخ کو ہم نے بیاد سجاد ظہیر ایک شام
> منائی تھی جس میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر شبیہ
> الحسن' جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حسن'
> پاکستان کے ڈاکٹر ایوب مرزا اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر
> قمر رئیس نے شرکت کی۔
>
> اس دن میں صبح صبح ڈاکٹر قمر رئیس سے ملنے گیا تو

میں نے ان سے ایک سوال کیا۔ قمر رئیس صاحب اگر ہم لندن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی منائیں تو آپ ہماری کیا مدد کریں گے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صوفے پر دراز تھے' میرے سوال پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''بھئی واللہ ہمارے ذمہ جو خدمت ہوگی ہم اُسے پورا کریں گے۔'' انھوں نے چاق وچوبند ہوکر کہا۔

.... ڈاکٹر قمر رئیس کے لیے میرا سوال یقینا غیر متوقع تھا۔ وہ مزید بولے ''عاشور صاحب ! لندن کے حوالے سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کی اہمیت بہت زیادہ ہوگی اگر آپ یہ بڑا کام کرلیں تو نہ صرف ہندوستان کے ادیب بلکہ پوری ترقی پسند تحریک آپ کی شکر گزار ہوگی۔

.... قمر رئیس صاحب میری بات سے متفق تھے کہ برصغیر میں یہ تحریک تنظیمی بحران کا شکار ہے۔ قمر رئیس صاحب بار بار اسی بات پر اصرار کررہے تھے کہ لندن میں گولڈن جوبلی کا انعقاد اس تحریک میں ایک نئی روح پھونک دینے کا موجب ہوسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ لندن کے بعد ہندوستان میں 1986ء میں گولڈن جوبلی تقریبات کا انعقاد ہوگا۔ مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ پروفیسر قمر رئیس نے ہماری خواہش کو ''عزائم'' میں بدل دیا۔'' 44

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی بنیاد ملک راج آنند' سید سجاد ظہیر وغیرہ نے لندن ہی میں 1935ء میں رکھی تھی۔اس مناسبت سے 1985ء میں لندن ہی میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کا انعقاد جدیدیت کے بڑھتے ہوئے حملوں کے تناظر میں فال نیک بھی تھا اور انجمن کو ازسرنو منظّم کرنے کا اچھا اور سنہرا موقع بھی۔لندن میں یہ کانفرنس 3 و 4 اگست 1985ء کو جی ایل سی ہال میں منعقد ہوئی۔کانفرنس کس نوعیت کی تھی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید عاشور کاظمی لکھتے ہیں:

''3 اگست کو کانفرنس کے پہلے دن صبح ساڑھے نو بجے سے رات کے ساڑھے دس بجے تک۔ اور 4 اگست 85ء کو صبح

سے شام تک۔ تا اختتام اجلاس تقریباً پانچ سو افراد ہمہ وقت کانفرنس میں شریک رہے جو لندن کی تاریخ میں انوکھا واقعہ ہے لندن کی مصروف مشینی زندگی میں جہاں بظاہر خشک موضوعات پر گفتگو ہورہی ہو اتنے افراد کا مسلسل دو دن جمع رہنا اس بات کی دلیل تھی کہ یہاں کے بورژوا ماحول میں زندگی گذارنے والوں کے دل بھی انسانیت کے لیے دھڑکتے ہیں اور وہ انسانی بہبود کے لیے بنائے جانے والے ہرپروگرام میں شریک ہوسکتے ہیں، ہر آواز پر لبّیک کہہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ آواز صداقت اور نیک نیتی سے بلند کی جائے۔ 45

لندن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کامیابی سے منائی گئی جسے ڈاکٹر قمر رئیس نے ''نیا سفر'' سے تعبیر کیا:

''آج کی بین الاقوامی کانفرنس سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کا ایک ''نیا سفر'' شروع ہورہا ہے۔'' 46

سید عاشور کاظمی نے بھی ڈاکٹر قمر رئیس کے اس خیال کی تائید کی اور اس کانفرنس کو تحریک کا نیا سفر قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

''لندن کانفرنس کا اختتام ترقی پسند تحریک کے نئے سفر کا آغاز تھا۔'' 47

لندن میں کانفرنس کی کامیابی کے بعد 1986ء میں ہندوستان میں گولڈن جوبلی تقاریب منائی گئیں چنانچہ الہ آباد، لکھنؤ، حیدرآباد، دہلی وغیرہ میں سمینار منعقد کئے گئے۔ لندن کانفرنس میں بیشتر مقالہ نگار حضرات نے انگریزی میں اپنے مقالے پیش کئے تھے جسے بقول ڈاکٹر قمر رئیس (48) انگریزی ہی میں ''کمٹ منٹ'' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا گیا۔

گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلے میں جو مقالات لندن اور ہندوستان کے سمیناروں میں اُردو میں پیش کئے گئے تھے ان تمام مقالات کو قمر رئیس نے سید عاشور کاظمی کے اشتراک سے ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' میں

مرتب کیا ہے۔ اپنی مرتبہ کتاب پر پیش گفتار کے تحت اظہار خیال کرتے ہوئے کتاب میں شامل مقالات کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''لندن کانفرنس میں زیادہ مقالے انگریزی میں پڑھے گئے۔ یہ مقالے ''کمٹ منٹ'' کے نام سے 1986ء کے اوائل میں لندن سے شائع ہوچکے ہیں۔ ہم نے فیصلہ یہ کیا کہ اُردو کے مقالے ایک سال بعد اس وقت شائع کئے جائیں جب پاکستان اور ہندوستان میں جشن زرّین کی تقریبات اور مذاکرے ہوجائیں تاکہ ان میں پڑھے جانے والے اہم مقالے بھی ''نیا سفر'' سلسلہ کے مجلہ میں شامل ہوسکیں۔اور اس کے مباحث کو بھی اس میں جگہ دی جاسکے۔ لندن کانفرنس کے موقع پر اس علمی' سلسلۂ مطبوعات ' کا اعلان بھی کردیا گیا تھا۔ بعد میں ہم نے باہمی مشورے سے اس مجلہ کا ایک جامع خاکہ مرتب کیا اور اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا (جو آپ کے پیشِ نظر ہے) مقصد یہ تھا کہ اس کے پہلے حصے میں عمومی حیثیت سے ترقی پسند ادب اور ادبی تحریک کا معروضی جائزہ سامنے آجائے۔ دوسرے حصے میں تحریک کے حوالے سے ان مسائل پر گفتگو ہو جو ہم عصر ادیبوں کو درپیش ہیں۔ تیسرے حصے میں ہم نے ایسے فکر انگیز مقالات کا انتخاب پیش کیا ہے جو تحریک کے فکری اور نظریاتی نشوونما میں نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک ملک گیر تحریک رہی ہے اور ہر خطے میں اس کے رسمی یا غیر رسمی مرکز قائم تھے جن سے اس تحریک کے ہمہ گیر فروغ کے امکانات پیدا ہوئے۔ اس لیے ایسے علاقوں یا مرکزی شہروں کے بارے میں بھی مضامین شامل کئے گئے ہیں جہاں یہ تحریک فعال رہی۔ اس کے بعد اُردو شعر و ادب کی مختلف اصناف اور اسالیبِ فن کے میدان میں ترقی پسند اہل قلم کا جو عطیہ رہا ہے اس کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں ترقی پسند

ادبی سرمایہ اور ترقی پسند فنکاروں کے بارے میں شائع شدہ کتب ورسائل (خاص نمبروں) کی وضاحتی کتابیات شامل ہے۔"49

قمر رئیس نے اس کتاب کے خاکہ کا مفصل بیان کر دیا ہے اور اسی مناسبت سے کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب کو مرتبین نے چھ عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔

پہلا عنوان ''افکار و آثار'' ہے جس کے تحت پانچ ایسے مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں جس میں ترقی پسند تحریک اور ادب کے رہنمایانہ اصول و نظریات کا بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا عنوان ''مسائل ومباحث'' ہے جس میں چار مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ تمام مضامین عنوان سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تیسرا عنوان ''فکری سفر کے نشانات'' ہے۔ اس عنوان کے تحت تاریخ کے اوراق سے ایسے مضامین منتخب کئے ہیں جس میں انجمن ترقی پسند تحریک کی تاریخ اور روایت بھرپور انداز میں سامنے آتی ہے۔ چوتھا عنوان ''جن دیاروں سے کارواں گذرا'' ہے۔ اس عنوان کے ذیل میں پاکستان اور ہندوستان میں مختلف اوقات میں متعدد شہروں میں تحریک کی خدمات اور موجودہ صورتحال پر مشتمل مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان مقالات میں پاکستان میں صوبہ سرحد، کراچی اور ہندوستان میں لکھنؤ، کشمیر، علی گڑھ، الہ آباد، حیدرآباد، کلکتہ، بہار اور بمبئی.......... میں انجمن ترقی پسند تحریک کے کارناموں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پانچواں عنوان 'عمر گذشتہ کی کتاب'' ہے اس عنوان کے تحت اُردو کے مختلف اصنافِ ادب مثلاً افسانے، ناول، ڈرامے، نظم، غزل، گیت، رپورتاژ، طنز ومزاح، تنقید اور لسانی مسائل میں ترقی پسند رجحانات کے نقوش تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ ان اصناف کو ترقی وارتقاء میں اس تحریک کی خدمات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چھٹا عنوان ''ترقی پسند ادب کی وضاحتی کتابیات'' ہے جسے ڈاکٹر توقیر احمد خاں اور ارتضیٰ کریم نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے آخر الذکر دونوں ابواب کتاب کا حاصل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز، شباب اور ارتقاء ان دونوں ابواب میں سمٹ آیا ہے۔

علی سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کے نصف صدی کے ادب پر مشتمل رسالہ گفتگو کا ایک خاص شمارہ شائع کیا تھا جب ہم متذکرہ بالا مرتبہ کتاب کے ہمراہ اس خصوصی شمارے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قمر

رئیس اور سید عاشور کاظمی کی مرتبہ کتاب ترقی پسند ادب کے پچاس سالہ سفر کو سمجھنے میں زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

قمر رئیس نے سید عاشور کاظمی کے اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی تقاریب میں پیش کئے گئے مقالات کو 1987ء میں کتابی شکل میں مرتب و شائع کیا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس میں تحریک کے پچاس سالہ ادبی اقدار و روایت پر مشتمل مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ لندن میں منائی جانے والی کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر قمر رئیس سخت بیمار ہو گئے تھے اور اپنی بیماری ہی کی حالت میں انہوں نے کانفرنس کے تمام انتظامات بحسن خوبی انجام دئے تھے۔ قمر رئیس کی بیماری لندن سے اُن کے واپس ہونے کے بعد مزید ترقی کر گئی اور کچھ عرصہ وہ سخت بیمار رہے۔ لیکن اپنے فرائض سے انہوں نے کبھی منہ نہیں موڑا اور............اُن کے فرائض منصبی ہی کا حامل اُن کی مرتبہ کتاب ''اُردو میں لوک ادب'' ہے جو کہ 1990ء میں شائع ہوئی۔ 88-1987ء میں شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام .U.G.C کے مالی تعاون سے ''دکنی سمینار'' اور ''اُردو لوک ادب'' پر دو روزہ سمینار منعقد کیا۔ قمر رئیس نے اس سمینار میں پیش کردہ 22 مقالات کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس سمینار کے محرکات اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''حال ہی میں ہندی کے ایک ممتاز ادیب نے اپنی ایک کتاب میں اُردو کو ایک آزاد اور علیحدہ زبان کا درجہ دئے جانے کے خلاف جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اُردو کا کوئی لوک ادب نہیں ہے اور یہ محض شہری اشرافیہ کی زبان ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندی، پنجابی، بنگلہ یا ملک کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو کی عوامی جڑیں نہیں ہیں اور اُردو کا دامن عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے والے لوک ادب کی روایت سے خالی ہے۔
>
> ظاہر ہے کہ جس زبان کی تشکیل ہی مختلف قوموں کے باہمی میل جول اور اجتماعی ارتباط کا نتیجہ ہو اس کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے۔'' 50

قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب ''اُردو میں لوک ادب'' میں جو پیش لفظ لکھا ہے اس کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مندرجہ بالا بیان اور اسی طرح کے بیانات جو کہ ہندی کے دانشور اور ادبا نے اُردو کے تعلق سے دئے ہیں نے ''اُردو میں ترقی پسند ادب و تحریک کے اس مرد آہن'' کو اس سمینار کے انعقاد اور اس سمینار میں پیش کردہ مقالات کی تدوین واشاعت پر راغب ہی نہیں مجبور کیا ہے۔انھوں نے پیش لفظ میں ہندی ادبا کے ایسے دعویٰ کی بابت بڑا اچھا سوال کیا ہے۔اقتباس دیکھئے کہ قمر رئیس اُردو میں لوک گیت کی روایت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:

''ان کے اس دعوے کو مان لیا جائے تو کہا جائے گا کہ اُردو بولنے والوں نے اپنی ماؤں کی لوریاں نہیں سنیں۔ ان کی ولادت پر گیت نہیں گائے گئے۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں ان کی دادیوں یا نانیوں نے کہانیاں نہیں سنائیں۔ ان کی گھریلو تقریبات پر ڈھولک کی تھاپ پر کنواریوں اور بیاہیوں نے گیت نہیں الاپے۔ ڈومنیوں نے ان کی شادی بیاہ پر شادیانے نہیں گائے۔ البیلے موسموں سے کبھی ان کے دلوں میں ترنگ پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے ساون میں جھولا نہیں جھولا۔

ظاہر ہے صدیوں سے اُردو سماج میں یہ سب ہوتا آیا ہے' شہروں میں بھی' دیہات اور قصبات میں بھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند میں اُردو اور ہندی کا علاقہ مشترک رہا ہے۔ دونوں ایک زمین ایک جیسی تہذیب' مشترک آب وہوا اور مشترک لسانی کنبہ کی پروردہ ہیں۔ اُردو اور ہندی بولنے والوں کی آبادیاں بھی اکثر ملی جلی رہی ہیں۔ اس لیے یہ ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اُردو اور ہندی کے لوک گیتوں' لوک قصوں اور لوک کہاوتوں کا بہت بڑا سرمایہ مشترک ہے۔ اظہر علی فاروقی (مرحوم) نے اترپردیش کے جو عوامی گیت جمع کیے ہیں' ان کے مطالعہ سے بھی یہ سچائی واضح ہوجاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر علاقے کے لوک گیتوں کو اُس علاقہ کی

بولیوں اور اس کے تہذیبی اور تاریخی حقائق نے متاثر کیا ہے۔'' 51

انسانی فطرت میں جس طرح گانا اور رونا لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح کہانیاں کہنا اور سننا' لوریاں گانا اور سننا' برکھارت کی خنکی آمیز ہواؤں کے البیلے پن سے متاثر ہوکر ترنگ میں گنگنانا بھی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اور انسانی فطرت رنگ و نسل' زبان و بیان یا زمین پر کھینچی گئی سرحدوں کی تابع نہیں ہوسکتی' یہ تو فطرت سے اس طرح ہم آہنگ ہوتی ہے کہ بادل کے چھاتے ہی موسم برسات میں جیسے مور رقص کرنے لگتے ہیں انسان بھی گیت گانے لگتا ہے۔ الغرض گیت ہو یا لوک گیت یہ انسانی فطرت میں شامل ہے۔ قمر رئیس نے ہندی کے مذکورہ بالا ادیب کے اعتراض کا مدلّل جواب دینے کے بعد (جو کہ مندرجہ اقتباس میں موجود ہے) یہ سوال اٹھایا ہے کہ لوک ادب کیا ہے؟ پھر خود انہوں نے ہی اس کی تعریف بھی بیان کی ہے۔ اور لوک گیتوں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کے محرکات و ماخذ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''لوک ادب اور لوک گیتوں کی چند مابہ لامتیاز خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کا مصنف گمنام ہوتا ہے۔ یہ گیت زیادہ تر اجتماعی اور کم تر انفرادی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکثر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی محنت کے عمل میں خلق ہوتے ہیں اور گائے جاتے ہیں' ان کا آہنگ کسی عروضی قاعدے کے بجائے' عوام کے احساس موسیقی کا تابع ہوتا ہے۔ عوامی قصوں کے مآخذ بھی یا تو عوام کے تلخ وشیریں تجربات ہوتے ہیں یا پھر مصائب حیات سے نجات پانے کی ازلی خواہش اور ایک بہتر زندگی کے خواب ہوتے ہیں۔ لوک ادب المیہ اور حزنیہ بھی ہوتا ہے اور طربیہ بھی۔ یہ عوام کی ذہانت کا تخلیقی اظہار بھی ہوتا ہے اور ان کی تفریح وتفنن کا ذریعہ بھی۔ اس میں ہنسی مذاق' ٹھٹھول' طنز وتعریض' مذہبی عقیدت' دشمنوں سے نفرت' وطن دوستی' مظاہر فطرت سے محبت' جنسی جبلت الغرض ہر طرح کے

جذبات ' احساسات اور واردات کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ڈوم' ڈومنیاں' میراثی' ڈفالی اور بھانڈ گھریلو اور سماجی تقریبات پر لوک گیت گاتے آئے ہیں اور لوک کہانیاں' نقلیں اور چٹکلے سناتے آئے ہیں۔'' 52

قمر رئیس نے لوک گیتوں کے عروضی قاعدے اور آہنگ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر حبیب نثار نے اپنے مقالے ''دکن کی مخصوص شعری اصناف' ہیئت و ماخذ'' (53) میں اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور انہوں نے یہ محاکمہ درج کیا ہے کہ دکن کی مخصوص اصناف سخن کو فن عروض کے اوزان پر جانچا نہیں جا سکتا اس لیے کہ ان کا آہنگ سروں پر مبنی ہوتا ہے اور لفظ کا ہر حرف بجائے خود ایک سُر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حبیب نثار' ہندوستانی موسیقی میں خاصہ درک رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُردو ادب اور موسیقی کے موضوع پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی تحریر کیا ہے۔ یہ اُن کا اپنا اختصاص (Specialization) ہے لیکن قمر رئیس کے قلم سے جب یہی ماہرانہ جملے نکلتے ہیں تو قلم خود بخود داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

قمر رئیس نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں مختلف موضوعات پر مشتمل لوک گیتوں کی مثالیں نقل کی ہیں جن میں 1857ء سے متعلق عوامی لوک گیت بھی ہیں' گاندھی جی کے چرخہ کو موضوع بنا کر لکھے گئے گیت بھی ہیں' علی برادران کی والدہ محترم کی جانب سے کیا گیا گیت ع

''بولیں اماں محمد علی کی ' جان بیٹا خلافت پر دے دو''

بھی ہے' اور امیر خسرو کے کئے ہوئے گیت بھی شامل ہیں۔ اُردو کے لوک گیتوں کی مثالیں درج کرنے کے بعد قمر رئیس لکھتے ہیں:

''یہ سارے گیت عوام کی گہری عقیدت' جذباتی بھولپن اور سیدھے سادے روشن تخیل کا کرشمہ ہیں۔ ان میں صرف اللہ میاں کا ہی نہیں' پنج پیروں' حضرت علی' غازی میاں' حضرت نظام الدین اور دوسرے بزرگانِ دین کا ذکر بھی ایسی ہی والہانہ عقیدت سے ہوتا ہے۔

اور پھر شادی بیاہ کے ہزاروں گیت ہیں۔ ہر موقع محل کے گیت۔ ہر تقریب کے گیت۔ ہر رسم کے گیت۔ یہ گیت ہمارے جذباتی رشتوں اور تہذیبی قدروں کا شفاف آئینہ ہیں۔ ان میں اُردو بولنے والے عوام کی رُوح رقص کرتی نظر آتی ہے۔ ان میں عام انسانوں کی آرزوؤں ' ارمانوں اور اُمنگوں کے ایسے نغمے ہیں جن کی تخلیق پر بڑے سے بڑا شاعر بھی قادر نہیں ہوسکتا۔ یہاں لڑکی کو مائیوں بٹھانے کے گیت الگ ہیں۔ سہاگ گھوڑیاں الگ ہیں' سمدھن کے حصے کی گالیاں الگ ہیں اور پھر شادیانے' رخصتی کے گیت۔ اور بابل کے گیت' جن میں ''کاہے کو بیاہی بدیس رے'' جیسے خوبصورت اور معروف گیت بھی ہیں جو سارے ملک کے لیے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ ان کی تفصیل دیکھنا ہو تو اظہر علی فاروقی' بسم اللہ نیاز احمد' سید احمد دہلوی اور بشیر الدین (اقبال دلہن) کی تصانیف پر نظر ڈالیے۔'' 54ے

نقاد ہو کہ محقق، تحقیق کا تقاضہ کہتا ہے کہ بغیر حوالہ وسند اپنی بات کی تفہیم نہ کرے یعنی دعویٰ بے دلیل نہیں ہونا چاہیے۔قمر رئیس نے اس اقتباس میں بھی اپنے ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک اچھے نقاد کے علاوہ اعلیٰ محقق کا فرض بھی ادا کیا ہے۔ ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قمر رئیس نے اُردو میں لوک ادب کے موضوع پر یونہی سمینار منعقد نہیں کیا تھا بلکہ ایک اچھے اسکالر کی طرح انہوں نے اس موضوع پر خاصہ مطالعہ بھی کیا ہے (یہ کہا جاسکتا ہے کہ قمر رئیس کا پیش لفظ ان مقالات کے مواد پر مشتمل ہے جو کہ اُن کی مرتبہ کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔لیکن پیش لفظ اس بات کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جن ماخذات کا انہوں نے حوالہ دیا ہے اُن میں سے چند ایسے بھی ہیں جن کا ذکر شامل مقالات میں نہیں ہوا ہے مثلاً حضرت امیر خسرو والا گیت ''اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا'' یا حیات اللہ انصاری اور بشیر الدین احمد کے ناول ''اقبال دلہن'' کا تذکرہ وغیرہ) اور اس موضوع کے علاقائی عنصر پر بھی اُن کی گہری نظر معلوم ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے اپنے پیش لفظ میں بار بار اتر پردیش کے لوک گیت کا ذکر وتذکرہ کیا ہے۔

اُردو تحقیق اور اُردو لوک گیت کے تعلق خاطر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ اُردو کے اہل علم اور محققین اس عوامی ادب کی درستی اور معیار بندی کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

"ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اُردو کے اہلِ علم اور محققوں کا مزاج کلاسک زدہ ہے۔ وہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو قدما اور اساتذہ کے کلام یا خیالی داستانوں کے خطّی نسخے تلاش کرتے ہیں۔ خواہ وہ نہایت پوچ' تقلیدی سطحی اور عامیانہ قسم کا لٹریچر ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بڑی دیدہ ریزی سے پرانے نسخوں کا تقابل کرتے ہیں اور ایک مستند نسخہ تیار کرتے ہیں (بعد میں دوسرے نسخے دستیاب ہونے کی وجہ سے وہ بھی غیر مستند ٹھہرتے ہیں) لیکن یہ محقق غیر تحریری روایت Oral Tradition کے ادب کو ضبطِ تحریر میں لاکر اس کے متن کی درستی اور معیار بندی کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوک ادب فکر وتخئیل کی وسعت' تازگی' قوت اور تاثیر میں اُس تیسرے درجے کے تحریری ادب سے زیادہ وقیع ہوتا ہے۔ اس ذہنیت کے پیچھے غیر تحریری ادب کے تئیں وہی تحقیر آمیز رویہ ہے جس نے اُردو زبان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ....
دوسری ہندوستانی زبانوں کے لوک ادب کا سرمایہ سیکڑوں جلدوں میں شائع ہوچکا ہے۔ کراچی یونیورسٹی نے چودہ جلدوں میں سندھی کے لوک ادب کو جمع کرکے اور مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ لیکن اُردو والوں کے لیے اُردو کا لوک ادب چنداں قابلِ التفات نہیں۔ اس لیے کہ اس کے مصنف کا پتہ نہیں۔ اس کی زبان گنوارو ہے۔ اس میں فارسی کے نظام عروض کی پابندی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی حال نثر کا ہے۔ ہمارے یہاں فارسی داستانوں کے چربہ کو یا پھر 'فسانہ عجائب' جیسی مخرب مذاق کتابوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے' لیکن ان لوک کہانیوں کی تحقیق کا بیڑہ کوئی نہیں اٹھاتا جو صدیوں سے ہندوستانی

عوام سنتے سناتے آئے ہیں اور جن کا ماخذ اور مخزن خود اُن کی بھری پُری زندگی ہے۔'' 55

اُردو میں لوک ادب کی تحقیق کے سلسلے میں محققین کی کم مائیگی پر اظہار خیال کرنے کے بعد قمر رئیس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو کے لوک ادب کی تحقیق وتدوین کے لیے ہمیں نوجوانوں کو خاص تربیت دینا ہوگی۔ انھیں لوک ادب کی اہمیت، اس کی معنویت اور فنی محاسن سے مانوس بنانا ہوگا۔ 56

''اُردو میں لوک ادب'' میں 22 مقالات یکجا کئے گئے ہیں جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوک گیتوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور مختلف اصناف سخن کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے موضوعات اور ماخذات کی بھی حتی الامکان نشاندہی کی گئی ہے۔ 57

قمر رئیس کی مرتبہ کتابوں میں ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' جس ادبی قدر واہمیت کی حامل ہے ''اُردو میں لوک ادب'' کی قدر ومنزلت بھی اس سے کچھ کم نہیں بلکہ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب اُردو ادب میں اپنی انفرادیت میں یکتا وتنہا معلوم ہوتی ہے۔ اُردو اکیڈمی دہلی کے زیر اہتمام 10 تا 12 جنوری 1992ء کو اُردو کی ممتاز ومعروف افسانہ نگار عصمت چغتائی کی یاد میں سہ روزہ سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کے انعقاد کی ذمہ داری اکیڈمی کے ارباب مجاز نے پروفیسر قمر رئیس کو سونپی تھی۔ انھیں اس سمینار میں پیش کردہ مقالات کو مرتب کرنے کی بھی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی۔ ''نیا افسانہ، مسائل اور میلانات'' یادِ عصمت چغتائی منعقدہ سمینار میں پیش کئے گئے مقالات ہی کا مجموعہ ہے جسے سمینار کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے پروفیسر قمر رئیس نے مرتب کیا ہے۔

یادِ عصمت چغتائی سمینار میں ڈائریکٹر نے سمینار کے افتتاح کے موقع پر کلیدی خطبہ پڑھا تھا۔ مرتب کتاب نے اسی کلیدی خطبہ کو اپنی مرتبہ کتاب میں بطور ''پیش گفتار'' شامل کیا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ چونکہ سمینار اُردو کی اہم افسانہ نگار عصمت چغتائی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا اسی وجہ سے قابل مرتب نے کتاب کے پہلے حصہ کو ''گوشہ عصمت چغتائی'' قرار دیا ہے جس میں اُن کی شخصیت اور فن پر چار مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ ''نیا افسانہ: مسائل اور

میلانات'' کے عنوان کے تحت رکھا گیا ہے۔ جس کے تحت 17 مضامین جمع کئے گئے ہیں۔

اس سمینار کے ڈائریکٹر پروفیسر قمر رئیس نے سمینار کو کامیاب بنانے اور موضوع سے انصاف کی غرض سے اُردو ادب کی تین نسلوں سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کو مدعو کیا تھا اور اس طرح پریم چند کی روایت کے حامل افسانہ نگار، ترقی پسند افسانہ نگار، جدید افسانہ نگار اور مابعد جدید افسانہ نگاروں کا اجتماع یکجا ہوگیا تھا۔ ایسے اجتماع میں جو مباحث بطور مقالات پیش کئے جائیں گے ظاہر ہے کہ موضوع کے تمام ابعاد کو روایت کے تناظر میں پرکھنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہی کچھ اس سمینار میں ہوا جو کہ افسانے کی بدلتی ہوئی صورتحال میں اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا سہرا یقیناً ڈائریکٹر سمینار کو جاتا ہے۔

قمر رئیس ترقی پسند تحریک سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ اُن کی زندگی کے شب و روز اس تحریک سے عبارت ہے۔ لیکن جب ان سے نئے افسانہ پر سمینار منعقد کرنے کی خواہش و درخواست کی گئی تو انہوں نے اپنے کمٹ منٹ اپنے نظریہ حیات و نظریہ ادب سے اوپر اٹھ کر سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا تا کہ موضوع سے صحیح معنوں میں انصاف ہو۔ علی احمد فاطمی نے اس سمینار کا رپورتاژ ''جڑیں اور کونپلیں'' کے عنوان سے لکھا اور شائع کیا ہے۔ سمینار کے دعوت نامے اور سمینار میں شرکت کا بیان کرتے ہوئے ڈائریکٹر سمینار سے ہونے والی اپنی گفتگو کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> ''اشتیاق عابدی سکریٹری اُردو اکادمی کا خط اور شرکت کی دعوت۔ الگ سے پروفیسر قمر رئیس صاحب جو اس سمینار کے ڈائریکٹر تھے ان کا بھی خط اور پھر ٹیلی فون بھی کہ اس سمینار میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔ یہ بہت اہم سمینار ہے۔ عصمت اور نئے افسانے کے نام پر تین دن کے اس سمینار میں تین نسلیں ایک ساتھ جمع ہورہی ہیں۔ نئے لوگوں کو اپنی بات کہنے کا ایک اچھا موقع ملے گا۔
>
> ''کیا ترقی پسندی کی بات؟ میں نے استفسار کیا۔
>
> نہیں۔ نہیں ہرگز نہیں! یہ ترقی پسندی کا سمینار نہیں

ہے۔ یہ دلّی اُردو اکادمی کا سمینار ہے جس کا اتفاق سے میں ڈائریکٹر ہوں۔ تم لوگ ان سب سے اوپر اٹھ کر جو سوچتے ہو وہ کہو اور نئے افسانے کی کسی جہت پر اچھا سا مقالہ لکھ کر آؤ۔ سلام بن رزاق، ساجد رشیدؔ، سید محمدؔ اشرف۔ غضنفرؔ وغیرہ آرہے ہیں اور دلّی کے نوجوان تو ہوں گے ہی۔ تمہارے بہت سے دوست ہوں گے۔ بس تم کو آنا ہے۔ دس کی صبح ہی آجانا اور وہاں اس سمینار کی رپورٹنگ بھی تمہیں کرنی ہے۔ اکادمی کے لیے۔ اپنے لیے کہ لندن کانفرنس کارپورتاژ تم نے اچھا لکھا تھا۔'' گفتگو کا تار ٹوٹ گیا لیکن قمر رئیس صاحب کے مشفقانہ جملے کانوں میں گونجتے رہے۔ تین نسلوں کا اجتماع۔ نئے لوگوں کی شرکت زیادہ۔ اپنی بات کہنے کا خوبصورت موقع۔ اپنی بات۔'' 58

قمر رئیس کا اپنے ایک ایسے جونیر ساتھی کو جو ہم عصر ترقی پسند ادب کا مضبوط ستون ہے، سے یہ کہنا کہ ''تم لوگ ان سب سے اوپر اٹھ کر جو سوچتے ہو وہ کہو۔'' ہمیں ایک ایسے اُردو نقاد سے متعارف کرواتا ہے جس کا مقصدِ حیات ادب اور اُردو ادب کی خدمت ہے، جو انسان دوستی اور ادب دوستی کو اپنے نظریے سے زیادہ اہم سمجھتا اور قرار دیتا ہے۔ ''نیا افسانہ مسائل اور میلانات'' اُردو افسانے کی گزشتہ صدی کے تمام رجحانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ صدی کے آخری دہے میں رونما ہونے والے افسانوی میلانات کو بھی روشن کرتا ہے۔

قمر رئیس نے افسانوی ادب کو بیسویں صدی کی معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا زیادہ معتبر اور معنی خیز ترجمان قرار دیا ہے۔ اپنے پیش گفتار میں انہوں نے بیسویں صدی کے افسانے، اس کے موضوع اور بدلتی ہوئی روایت کا بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ افسانوی ادب، بیسویں صدی کی معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا زیادہ معتبر اور معنی خیز ترجمان رہا ہے۔ تبدیلی اور ترجمانی کے اس عمل میں وہ اپنے فنی اسلوب اور ہئیت کو بھی بدلتا آیا ہے۔ روایت کے نرم آنچل سے انحراف بھی ہوا اور سرکشی کی نئی کونپلیں بھی

پھوٹی ہیں۔ ان سے اُردو افسانہ میں تخلیقی اظہار کی نئی جہتیں، نئی سطحیں سامنے آئی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ کچھ لوگوں نے ارادی کوشش سے افسانہ کی تکنیک میں علامتی اور تجریدی اظہار کے تجربے کیے جو اندرونی قوت اور روایت کے احساس سے محروم تھے۔ اس لیے وہ کامیاب نہیں ہوئے اور بہتر ادب کی تخلیق کے لیے کھاد بن گئے۔ اس رجحان کی حوصلہ افزائی میں ماہنامہ 'شب خون' کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ لیکن ایسے تجربے بھی کثرت سے ہوئے جو روایت کی آنچ اور تخلیقی توانائی سے معمور ہیں اور جن کے اثر سے اُردو افسانہ میں نیا خون دوڑتا محسوس ہوتا ہے۔

برصغیر ہند وپاکستان میں، نئی پیڑھی کے باضمیر اور روشن خیال ادیب کسی سکہ بند نظریہ یا عقیدہ سے وابستہ نہ ہوکر انسان دوستی کے وسیع تر تصور کو سینے سے لگائے ہیں۔ وہ انسانی وحدت اور امن واخوت کی طاقتوں میں یقین رکھتے ہیں اور انسانی استحصال کے، خواہ وہ کسی شکل میں ہوں حریف ہیں۔ کہانی، ان کے یہاں فلسفیانہ یا تجریدی فکر کو نہیں، سماجی حقیقتوں کو پیش کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس لیے وہ کہانی سے کہانی پن کو جدا کرنے کے حق میں نہیں، اس لیے کہ اس طرح کہانی میں ایک مرکزیت قائم رہتی ہے جو کردار، فضا تاثر ہر چیز کا تعین کرتی ہے۔ یہ مرکزیت قاری کے حواس کو یکجا اور اس کے احساس جمال کو متحرک رکھتی ہے۔ لیکن ان کی کہانی ماضی کی کہانی کی طرح یک رخی بھی نہیں۔ نوجوان ادیب اظہار کے نئے پیرائے وضع کرکے بیانیہ کو جو نئی وسعت دے رہے ہیں اس میں کئی جہتیں شامل ہوجاتی ہیں۔'' 59

یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ یہ یاد عصمت چغتائی منعقدہ سمینار کے ڈائریکٹر کے کلیدی خطبہ کا اہم ترین حصہ ہے اور اسی نکتہ کے محور پر اس سمینار کے بیشتر موضوعات اور مباحث ہوتے ہیں۔

قمر رئیس کی ادبی خدمات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اُس میں کئی امتیازیات نظر آتے ہیں۔ ہم نے ان امتیازیات کا ذکر مقالے کے پیش لفظ میں کیا ہے اور اختتامیہ میں بھی ان امتیازیات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ قمر رئیس کے امتیازیات میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے پریم چند صدی تقاریب کا اہتمام کیا' اقبال صدی تقاریب منائی اور ان تقاریب کے یادگاری مجموعے مرتب وشائع کئے۔ اسی طرح قمر رئیس نے شاعر انقلاب شبیر حسن خاں' جوش ملیح آبادی کی خدمات سے موجودہ نسل کو روشناس کروانے کی غرض سے پاکستان میں ہندوستانی سفیر کنورنٹور سنگھ کی خواہش پر 17 تا 19 اپریل 1992ء کو دہلی میں بین الاقوامی سمینار منعقد کیا۔ اور اس سمینار میں پڑھے گئے مقالات ومضامین کو ''جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ'' کے نام سے 1993ء میں مرتب وشائع کیا۔

قمر رئیس نے بحیثیت مرتب مختصر پیش لفظ ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اس ابتدائیہ میں جوش ملیح آبادی سے متعلق چند سوالات بھی اٹھائے ہیں مثلاً:

> ''پاکستان کی اسلامی مملکت میں جوش کی قدر ناشناسی کے کچھ اسباب سمجھ میں آتے ہیں لیکن ہندوستان میں ان کے ساتھ جس سرد مہری کو رواں رکھا گیا ....'' 60

قابل مرتب نے جملہ 30 مقالات کو اس مجموعہ میں تین عنوانات کے تحت یکجا کیا ہے۔ پہلا عنوان ہے ''افکار واقدار'' جس کے تحت آٹھ مضامین ہیں جن میں جوش کے افکار' اُن کے اعتقادات اور اُن کے رویوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ''شعری ادب و آہنگ'' ہے جس کے تحت اٹھارہ مضامین اکٹھا کئے گئے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات متنوع ہیں اور ممکنہ حد تک جوش کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کا خطاب دیا گیا تھا جو کہ اُن کی شاعری کی بنیاد پر تھا۔ جوش نے نثر میں بھی کئی شہ پارے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اُن کے پہلے مجموعہ کلام ''روح ادب'' میں بھی چند نثر پارے موجود ہیں۔ رسالہ کلیم میں لکھے گئے اُن کے مقالات اور اس رسالے کے اداریے اُن کی نثر کے یادگار مرقع ہیں۔ ان اداریوں کو بعد ازاں اشارات کے نام سے شائع کیا گیا جس کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے شائع کیا

ہے۔متذکرہ بالا نثری نگارشات کے علاوہ جوش کی سوانح عمری ''یادوں کی برات'' اُن کی نثر کا شاہکار قرار دی جاتی ہے۔

جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری کے پیش نظر ڈاکٹر قمر رئیس نے سمینار کے چند مندوبین سے جوشؔ کی نثر پر بھی مقالے لکھنے کی خواہش کی جواُن کی مرتبہ کتاب، کے تیسرے حصہ ''نثری سرمایہ'' کے تحت یکجا کئے گئے ہیں۔اس حصہ میں خود جوش کے تحریر کردہ دو نگارشات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔کتاب کے چوتھے حصہ میں جوش ملیح آبادی کی منظومات کا انتخاب ''انتخاب منظومات'' کے عنوان سے کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے اُن کے کلام کی اہم خصوصیات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس نے کتاب کے ''ابتدائیہ'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے:

> ''یہ مجموعہ مضامین جوشؔ کے ساتھ انصاف کرنے اور
> ''جوش شناسی'' کے ایک نئے دور کو پروان چڑھانے کی ادنیٰ
> اور حقیر کوشش ہے۔''61؎

''جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ'' یقیناً جوش شناسی کے خواہش مندوں کے خصوصی مطالعہ میں مدو معاون ثابت ہوگی اور اقبالؔ کے بعد بیسویں صدی میں برصغیر کے سب سے بڑے اُردو شاعر کی قدر و منزلت کے تعین میں مددگار ہوگی۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے بعض ایسی کتابیں بھی مرتب کی ہیں جو سمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کسی ادبی ادارہ یا اُردو اکیڈمی کے ارباب مجاز کی خواہش پر مرتب کی گئی ہیں یا پھر انہوں نے خود اپنے ذوق سلیم کی تسکین و تعبیر کے لئے مرتب کیں۔ڈاکٹر قمر رئیس کی اس طرح مرتب کی گئی کتابیں حسب ذیل ہیں:

1. مضامین پریم چند (1960ء)
2. آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ (1990ء)
3. پریم چند کے نمائندہ افسانے (1991ء)
4. شعلۂ آوارگی (1992ء) اور
5. نغمۂ جمال زمیں (2002ء)

پریم چند اور اُن کا فن اور نیاز حیدر کی بازیافت' قمر رئیس کے امتیازیات ہیں' اُردو کے ان خدمت گزاروں سے انصاف کی غرض سے مقالے میں دو باب مختص کئے گئے ہیں چنانچہ ''مضامین پریم چند'' اور ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' پر ''پریم چند اور قمر رئیس'' کے عنوان سے لکھے جانے والے باب میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے گا اور ''شعلہ آوارگی'' اور ''نغمۂ جمال زہیں'' کا مطالعہ ''نیاز حیدر اور قمر رئیس'' والے باب میں پیش کیا جارہا ہے۔ اسی لئے یہاں تکرار سے بچنے کی خاطر قمر رئیس کی ان مرتبہ تصانیف پر اظہار خیال سے اجتناب کیا گیا ہے۔

''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' قمر رئیس نے دہلی اُردو اکادمی کی خواہش پر مرتب کی ہے جو 1990ء میں شائع ہوئی۔ اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی اس کتاب پر حرفِ آغاز کے عنوان سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(اکادمی نے) آزادی کے بعد دہلی میں ادب کی مختلف اصناف پر کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اُسی سلسلہ پیش کش کا ایک حصہ ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' ہے 'جسے پروفیسر قمر رئیس صاحب نے ترتیب دیا ہے اور اپنے فاضلانہ مقدمہ میں آزادی کے بعد بالخصوص دہلی میں اُردو افسانے کی رفتار و مقبولیت پر روشنی ڈالی ہے۔'' 62

قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب میں ''دہلی میں اُردو افسانہ کی روایت'' (63) کے عنوان سے ایک طویل مقالہ بطور پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ ''دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب'' میں افسانے کی روایت کا بیان کرتے ہوئے انہوں نے مقالہ کی ابتدا ''بعض شہروں کی تاریخی اہمیت اور تہذیبی مرکزیت'' (64) کے مسلم ہونے کے بیان سے کی ہے اور پھر دہلی کے اجڑنے کا بیان کیا ہے۔ 1947ء کی گرم ہواؤں کے جھکڑ کے تا حال چلنے کا بیان کرتے ہوئے ''جامع مسجد' لال قلعہ اور قطب مینار جیسی تاریخی یادگاروں'' (65) کو ایسی مستحکم عمارتوں کی حیثیت قرار دیا ہے ''جو کسی عظیم زلزلہ میں محفوظ رہ گئی ہوں''۔ (66)

قمر رئیس کے ان منتخب جملوں کی روشنی میں ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''کچھ ایسی ہی صورتحال فنون و ادب کے دوسرے

میدانوں کی ہے جہاں چند روایات ماضی کے شکوہ ووقار کی گواہ بن کر زندہ رہنے کی تگ ودو کررہی ہوں۔ عہد پارینہ کے ان آثار میں دلّی کی ٹکسالی زبان بھی شامل ہے۔''67

قمر رئیس نے دہلوی اسلوب کے امتیازات بتانے کے بعد'' دہلوی نثر کا اصل نمونہ'' عجائب القصص اور باغ وبہار'' ہی کو قرار دیا ہے۔اقتباس دیکھئے:

''لیکن دہلوی نثر کا اصل نمونہ عجائب القصص' اور باغ وبہار ہی ہیں۔ ان میں بول چال کی جو صاف اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ محاکاتی انداز سے جو منظر کشی اور ماحول آفرینی کی گئی ہے وہی فن قصہ گوئی کی بنیاد ہے۔'' 68

قمر رئیس نے دہلی میں مختصر افسانے کے اولین نقوش راشد الخیری کی کہانیوں کو قرار دیا ہے۔دہلی میں راشد الخیری کے ذریعہ پروان چڑھنے والی مختصر افسانے کی اس روایت کا بیان کرتے ہوئے مرتب نے خواجہ حسن نظامی' میر ناصر علی' آغا شاعر قزلباش' اسعد الاشرفی دہلوی' ناصر نذیر فراق' رازق الخیری' اشرف صبوحی اور صادق الخیری کے ذریعہ دہلی میں اُردو افسانے کے فروغ کا بیان کیا ہے۔اس روایت کی تشکیل میں صادق الخیری کی خدمات کا بیان کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں کہ انہوں نے پہلی مرتبہ دہلی میں مختصر افسانے کو انشائیہ کے اسلوب سے آزادی دلانے کی کوشش کی اور اجتماعی زندگی کی تبدیلیوں اور عام معاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اُن کے ساتھ احمد علی نے بھی انفرادی طور پر انہی موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔اقتباس دیکھئے:

''اگرچہ اخر الذکر کو چھوڑ کر ان سب ادیبوں کے یہاں افسانہ میں انشا پردازی کا رنگ غالب ہے۔ عصری حقائق کے بجائے وہ تاریخ کے واقعات کو موضوع بناتے ہیں اور افسانہ میں تہذیبی مرقع کشی پر زور دیتے ہیں۔ تازگی ' تنوع اور افسانویت کے عناصر ان کی کہانیوں میں کم نظر آتے ہیں۔ عام طور پر وہ دہلی کی تہذیبی زندگی کے حصار سے باہر نہیں نکلتے۔ صادق الخیری اور احمد علی نے پہلی بار ملک کی اجتماعی زندگی کی تبدیلیوں اور عام معاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع

بنایا۔ ان کے یہاں افسانہ کے فن کا جدید رنگ بھی نمایاں ہوکر سامنے آیا۔'' 69

قمر رئیس نے دہلی میں اُردو افسانے کے آغاز اور دہلوی روایت کا بیان کرنے کے بعد، دہلی میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں کا ذکر کیا ہے اور پھر اس روایت سے انحراف کی نشاندہی کرنے کے بعد جدید افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے عصر حاضر میں دہلی میں اُردو افسانے کی صورتحال کو واضح کیا ہے۔

قمر رئیس نے آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ مرتب کرتے ہوئے سات عنوانات کے تحت جملہ 35 افسانہ نگاروں کے 35 افسانے منتخب کئے ہیں۔ دہلی میں اُردو افسانے کی روایت کی نشاندہی کے لئے مرتب نے درج ذیل عنوانات لکھے ہیں۔ انھیں سلسلہ وار ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو:

1. دہلوی روایت کی توسیع
2. ترقی پسند رجحان
3. ترقی پسند روایت کی توسیع
4. انحراف کی لکیریں
5. جدیدیت کی لہر
6. ملی جلی روایت
7. نئی آوازیں

اُردو میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ چند ایسے نقاد وفنکار موجود ہیں جو ترقی پسند تحریک کے زوال یا اس تحریک سے انحراف کے بارے میں کچھ لکھنا تو بہت بڑی بات ہے ایک حرف سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن قمر رئیس ایسے ترقی پسند ہیں جو حقیقت کو ہی سب کچھ قرار دیتے ہیں۔ اس کا عین ثبوت یہ ہے کہ دہلی میں اُردو کی روایت کا بیان کرتے ہوئے انہوں نے ترقی پسند افسانوی روایت سے انحراف کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور پھر جدیدیت کے تحت لکھے جانے والے

افسانوں کی خامیوں کے ساتھ ساتھ خوبیوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''جدیدت نے سطحی حقیقت نگاری بے معنی رومانویت اور بیانیہ کی مجہول اور فرسودہ روایات سے کھل کر انحراف کیا اور جرات آزما تجربے کیے جو افسانہ کو تخلیقی اور معنوی طور پر زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بناسکیں۔ اس جوش اجتہاد میں اکثر ادیبوں کے ہاتھ سے اگر ایک طرف افسانہ کا دامن چھوٹ گیا تو دوسری طرف فلسفہ طرازی انہیں معروضی حقیقتوں سے پرے اٹھالے گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو افسانہ عام اور اوسط قاری کے لیے اپنی دلچسپی اور معنویت کھو بیٹھا۔'' 70

اس مختصر تحریر میں قمر رئیس نے جدیدیت کے تحت پروان چڑھنے والی افسانوی روایت اور اُس کے موضوعات کا بیان کیا ہے اور پھر جدید افسانے کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جو کہ قمر رئیس کے اُردو فکشن پر عمیق مطالعے اور نظر کا غماز ہے۔ قمر رئیس نے جن افسانہ نگاروں کے افسانے منتخب کئے ہیں اُن تمام کی انفرادیت پر فرداً فرداً اظہار خیال کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

''اُمید ہے کہ اس انتخاب میں شامل افسانوں کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ کے نشوونما اور میلانات کی ایک تصویر ضرور بنے گی اور یہی اس انتخاب کا مقصد ہے۔'' 71

تحقیق کی ایک شاخ تدوین متن ہے جس میں ادیب وشاعر کے اصل متن کی بازیافت کی جاتی ہے۔ اور اس متن کو مرتب کرتے ہوئے مرتب متن مقدمہ لکھتا ہے جس میں متن کی خصوصیات' ماخذ' موضوع' اہمیت وافادیت' لسانی خصوصیات پر اظہار خیال کرتا ہے۔ قمر رئیس کی ادبی خدمات میں چند ایسی تصانیف بھی ہیں جو اس ضمن میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ حسب ذیل ہے:

1. مرزا محمد ہادی رسواؔ 2. امراؤ جان ادا

3. شعلۂ آوارگی اور 4. نغمۂ جمال زیں

ڈاکٹر قمر رئیس کے پہلے مجموعہ مضامین تلاش وتوازن کے صفحہ 4 پر جہاں مصنف اور اُس کی تصانیف کی تفصیل درج کی گئی ہے اُسی مقام پر مطبوعات کے ضمن میں ''مرزا رسوا (ادبی سوانح) زیر تکمیل'' کی تحریر بھی ملتی ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس کی تصنیف ''تلاش وتوازن'' اپریل 1968ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ اس درمیان ڈاکٹر میمونہ انصاری کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''مرزا محمد ہادی رسواؔ'' اور آدم شیخ کی تصنیف ''رسواؔ'' منظر عام پر آچکے ہیں لیکن ڈاکٹر قمر رئیس نے مرزا رسواؔ پر اپنی کتاب مکمل نہیں کی۔ڈاکٹر قمر رئیس نے رسواؔ کی زندگی کے ایک ایک دن کی تفصیل اکھٹا کی ہے اور وہ اُسے ترتیب دے رہے ہیں۔انہوں نے رسواؔ کا کلام بھی کثیر تعداد میں جمع کیا ہے۔ڈاکٹر حبیب نثار سے مارچ 2003ء میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے بتایا:

> ''رسواؔ پر کتاب ترتیب دے رہا ہوں۔ بہت سارا مواد جمع کیا ہے اور رسواؔ کا کلام بھی اکٹھا کیا ہے۔ تقریباً تین سو پچاس غزلیں رسواؔ کی جمع ہوئی ہیں۔ بس وقت ملے تو کتاب لکھ دوں۔'' 72؎

یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ہادی رسواؔ بہت اچھے شاعر تھے۔انہوں نے اپنے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں جو غزلیں درج کی ہیں خصوصاً مشاعرے کے سلسلے میں وہ اپنے خالق کی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہیں۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مرزا رسواؔ کا کلام آج تک اکٹھا کرنے کی سعی وجستجو نہیں کی گئی۔ڈاکٹر میمونہ انصاری نے اپنے ایک مقالے مطبوعہ فنون لاہور' میں رسواؔ کی بیاض کا ذکر کیا ہے اور اُس سے چند غزلیں نقل کی ہے۔بس یہی کچھ آج تک رسواؔ کا کلام ہے۔۔۔اس پس منظر میں ڈاکٹر قمر رئیس کی زیر اشاعت تصنیف اُردو ادب میں معرکہ خیز اضافہ ہوگی خصوصاً اُن کی تقریباً چار صد غزلیں اُردو والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ ہوں گی۔

''قمر رئیس ایک زندگی'' میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی قمر رئیس کے ایک خط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> '' دسمبر 95ء میں ہم لوگوں نے الہ آباد میں انجمن کی

ساٹھویں سالگرہ منائی ...... اس درمیان وہ ''نیا سفر'' نکالتے رہے۔ حیدرآباد کانفرنس نمبر نکالا۔ مضامین لکھتے رہے۔ بیمار ہوئے۔ دل کا دورہ پڑا لیکن وہ بستر پر رہ کر بھی پروگرام بناتے رہے۔ ''نیا سفر'' کا قرۃ العین حیدر نمبر نکالوں گا۔ یوپی تنظیم مضبوط کروں گا۔ افسانے کی تاریخ لکھوں گا اور پھر اسی بیماری کے عالم میں مجھے ایک بہت پیارا خط لکھا۔

ڈیر فاطمی۔ ادھر ایک سفر نامہ لکھ ڈالا ہے۔ امراؤ جان کا پہلا اڈیشن مل گیا ہے۔ اس کو ایک تفصیلی مقدمہ وفرہنگ کے ساتھ Edit کردیا ہے۔ .N.B.T کے لئے سرشار پر ایک کام کرڈالا ہے۔ اور اب ساری یکسوی کے ساتھ افسانہ کی تاریخ پر لگنا ہے۔ جلسوں وہنگاموں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''73

ڈاکٹر قمر رئیس نے ڈاکٹر علی احمد فاطمی کو خط میں جس سفر نامے کا ذکر کیا ہے وہ شائع ہو گیا ہے جسے ہم ''ازبیکستان انقلاب سے انقلاب تک'' کے نام سے جانتے ہیں۔ .N.B.T کے لئے سرشار پر لکھا گیا کتابچہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ البتہ امراؤ جان کو ایڈٹ کرنے کے باوجود انہوں نے ابھی تک شائع نہیں کیا ہے۔ ''قمر رئیس ایک زندگی'' 1998ء میں شائع ہوئی۔ میرے مقالے کے نگراں ڈاکٹر حبیب نثار نے مارچ 2003ء میں ڈاکٹر قمر رئیس سے ملاقات کی تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ:

''رسوأ اور امراؤ جان پر تفصیل سے گفتگو ہوئی اور ڈاکٹر قمر رئیس اسے مرتب کررہے ہیں۔''74

مرزا رسوأ کے شاہکار ناول کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے لکھا ہے کہ یہ ناول مرزا سرفراز بیگ عزمی کے ناول ''شاہد ورعنا'' پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کو امراؤ جان ادا کا پہلا اڈیشن نہیں ملا تھا۔ علاوہ ازیں اس ناول کے سنہ اشاعت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری اور ڈاکٹر حبیب نثار نے امراؤ جان ادا کا سنہ اشاعت جولائی 1898ء قرار دیا ہے۔

اس تناظر میں ڈاکٹر قمر رئیس کا مرتبہ ایڈیشن کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ غلط فہمیوں پر سے پردہ

اٹھے اور حقیقت کی بازیافت ہو۔ بہر حال رسواؔ کی غزلیں اور امراؤ جان ادا کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت ڈاکٹر قمر رئیس کی ادبی خدمات میں مزید ایک امتیاز کا اضافہ ہوگا۔

تنقید

قمر رئیس ایک ترقی پسند ناقد ہیں جن کی پہچان پریم چند اور فکشن کی تنقید سے قائم ہے تاہم گاہے گاہے انہوں نے دوسرے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ترقی پسند تنقید کی کوئی بندھی ٹکی تعریف ممکن نہیں ہے البتہ جس تنقید میں ادب کے افادی پہلو پر زیادہ زور دیا جائے اور اس کی سماجی معنویت کی تلاش کی جائے اسے ترقی پسند تنقید کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ بعض مفکرین نے کھلے طور پر یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ ترقی پسند تحریک کی اساس مارکسی نظریات پر قائم ہے اس لئے مارکسی نظریات کی روشنی میں ادب کی جانچ پرکھ مارکسی تنقید کہلاتی ہے اور اسی مارکسی تنقید کو ترقی پسند تنقید بھی کہتے ہیں۔ اس مکتبہ تنقید میں مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور مظلوموں کی حمایت کی جاتی ہے اور ادب کا اس طرح جائزہ لیا جاتا ہے کہ اول تو اس کا سماج سے کس قدر رشتہ ہے اور پھر اس رشتے میں پسماندہ طبقے کے مفادات پر کس حد تک توجہ دی گئی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ترین ستون پریم چند نے اپنے یادگار خطبے میں کہا تھا:

> ''جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گاگا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا اس وقت تک ادیب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' 75

اس اقتباس میں پریم چند نے ادب کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے قمر رئیس بھی ادب میں بنیادی طور پر انھیں عناصر کی تلاش کرتے ہیں البتہ ہر نابغہ ادیب وفنکار کی طرح قمر رئیس کا بھی اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ کسی فن پارے یا کسی فنکار کے مجموعی فن کی تنقید کرتے ہوئے اپنے نظریے یا تنقیدی معیار میں نہیں الجھتے ہیں بلکہ وہ براہ راست فن پارے کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ اس مرحلے میں وہ سماجی اور تہذیبی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں اور فن میں اپنے نظریے کی تلاش کرتے ہیں اور پھر اس نظریے کی حمایت وتائید کے لئے فن پارے ہی میں سے نکتے تلاش کرتے ہیں۔ قمر رئیس کی تنقید بے لاگ ہونے کے باوجود دل آزاری کا باعث نہیں بنتی ہے۔ اگر کسی فنکار یا فن پارے سے انھیں اتفاق نہیں بھی رہا تو انہوں نے وہ لہجہ اختیار کیا' وہ زبان استعمال کی اور وہ انداز اپنایا کہ پڑھنے والے کو یا خود اس فنکار کو بہت ناگوار نہ گزرے۔ اس سلسلے میں نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''ناپسندیدگی کے اظہار میں تلخی نہ ہو یہ اور بھی مشکل ہے۔ قمر رئیس نے معاصر ادب کا مطالعہ غیر جانبداری مگر ہمدردی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی خوبیوں کو سراہا ہے' خامیوں پر گرفت کی ہے مگر اعتدال وتوازن کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ...... اسی احساسِ توازن اور جذبہ تفحص نے ڈاکٹر قمر رئیس کو تنگ نظری اور انتہا پسندی سے دور رکھا اور ان اقدار کی تلاش پر مائل کیا جن سے فن کو ہدایت اور آفاقیت حاصل ہوتی ہے۔'' 76

قمر رئیس نے مختلف موقعوں پر اپنے تنقیدی نظریے کا اظہار کیا ہے۔ خود ان کے بیانات سے بھی ان کے تنقیدی نظریے اور افکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کے دیباچوں اور مختلف مباحثوں اور انٹرویوز کے دروان تنقید کے جس پہلو پر توجہ دلائی ہے اس میں ادب پارے کی تفہیم اور پھر اس کی سماجی حیثیت کی وضاحت کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مطابق کوئی بھی ادب خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو' کسی بھی صورتحال میں اس کی تخلیق ہوئی ہوئی ہو وہ اپنے اندر سماجی اثرات ضرور رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سماجی اثرات کا اظہار کسی فرد یعنی ادیب یا فنکار کے ذریعے ہوتا ہے اس لئے خود فنکار کی شخصیت بھی فن پارے پر اثرات مرتب کرتی ہے اور اس طرح قاری کے

سامنے فن پارے کے ساتھ کسی نہ کسی طور پر فنکار کا پرتو بھی ہوتا ہے۔ یہ پرتو کبھی اتنا واضح اور نمایاں ہوتا ہے کہ اس بوجھ تلے فن پارہ دب کر رہ جاتا ہے اور فنکار کی ذات ہی ہر جگہ چھائی ہوئی نظر آتی ہے جبکہ کہیں یہ پرتو اس باریکی کے ساتھ موجود ہوتا ہے کہ قاری کو اس کے وجود کا بہت زیادہ احساس نہیں ہوتا مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر قمر رئیس ادب کی تنقید کے دوران ادیب کی شخصیت اور فن پارے کے وجود میں آنے کے محرکات کے مطالعے پر بھی زور دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے مجموعہ ''تلاش وتوازن'' میں لکھا ہے کہ:

> ''میرے نزدیک ہر ادبی تخلیق خواہ وہ کسی بھی باطنی تجربے یا داخلی حقیقت کا اظہار ہو اور اس کا پیرایہ بیان کتنا ہی نازک اور تہ دار ہو۔ کسی نہ کسی سماجی صورتحال کا عکس ہوتی ہے اور صرف عکس ہی نہیں' اس پر تبصرہ بھی ہوتی ہے۔ اس کی تفسیر بھی اور تنقید بھی۔ اگرچہ یہاں اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے تامل نہیں کہ شعر وادب میں سماجی عنصر ایک متحرک انسانی وجود کے واسطے سے' اس کی منفرد شخصیت اور مخصوص طبعی میلانات کا جزبن کر اور فنی تخلیق کے مراحل سے گزر کر سامنے آتا ہے۔ اس لئے ادب کے مطالعے میں سماجی اور تاریخی عوامل کے ساتھ ساتھ فنکار کی شخصیت کے تشکیلی عناصر اور داخلی محرکات کا مطالعہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔'' 77

اپنے تنقیدی رجحان اور بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے چند دوسرے محرکات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''دوسرا پہلو جو ادب کے مطالعے میں ہمیشہ میرے پیش نظر رہا ہے' فن وادب کی روایت' ان کا تسلسل اور ان کے مخصوص ضابطے ہیں۔ سماجی نظام اور سماجی اقدار کی تبدیلی اور اس تبدیلی کے قوانین ادب کی اقدار' معیار اور اس کے قوانین کو اسی رفتار سے اور اسی حد تک بدلتے ہیں جس طرح اور جس حد تک وہ انسانی اقدار' انسانی جذبات اور

محسوسات کے مجموعی اور عمومی Pattern پر اثر انداز ہوتے ہیں۔'' 78

قمر رئیس کی تنقید کے ضمن میں ان کے اسلوب' ان کی زبان اور لب و لہجے کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔قمر رئیس کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اُن چند اہم ادیبوں میں شامل ہیں جن کی تنقید میں بھی تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ان کی تنقیدی زبان کی خصوصیات میں روزمرہ الفاظ' صاف ستھرا بیان اور سیدھا سادہ انداز شامل ہے۔ان کی تحریروں میں ترسیل کی بے پناہ قوت ہوتی ہے جس میں اکثر و بیشتر خوبصورت الفاظ اور پرلطف طرز بیان سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ان کی تخلیقی زبان کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب وہ کسی کہانی یا ناول کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔کسی ناول پر لکھے گئے قمر رئیس کے تنقیدی مضمون کو پڑھنے کے بعد اصل ناول کو پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔وہ خود بھی تنقید کے دوران اسلوب کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ڈاکٹر قمر رئیس کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''قمر رئیس کے نزدیک اچھا اسلوب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ کوئی فنکار سادہ اور سلیس زبان اور شفاف و بے تکلف طرز تحریر کو کام میں لاتا ہے بلکہ بول چال کی عام فہم زبان کو تخلیقی زبان کا درجہ دے دیتا ہے۔ اسلوب کو تکلف' تصنع اور آرائش سے مبرا ہونا چاہئیے کیونکہ سادہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب ہی سے فکر و اظہار کی تفہیم ممکن ہے۔ قمر رئیس نے گویا صرف موضوع' مواد اور نقطہ نظر ہی پر زور نہیں دیا بلکہ پیرائہ اظہار اور طرز بیان کو بھی اہمیت دی ہے۔'' 79

قمر رئیس کی تنقید کی ایک خصوصیت ان کی رواداری بھی ہے۔گرچہ وہ ایک ترقی پسند نقاد ہیں اور ان کی تنقید کو سماجیاتی تنقید کا نام بھی دیا جاتا ہے لیکن ان کے یہاں تہذیب اور تاریخ کا گہرا شعور ملتا ہے اور ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناقد کو اعلیٰ قدروں کی پاسداری کا بھرپور لحاظ ہے اور اسی کے ساتھ دوسری طرف یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدلتی ہوئی قدروں سے بھی ہم آہنگ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک مخصوص نظریے سے گہری وابستگی کے باوجود

ان کی تنقید اس نظریے کا پروپیگنڈہ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ کسی بھی ادب پارے کو وہ سب سے پہلے اس نظریے سے دیکھتے ہیں کہ وہ ادب ہے یا نہیں یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادب کو خود ادب کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل ہیں۔ قمر رئیس کا تنقیدی سفر کم و بیش نصف صدی سے جاری ہے جس کا محاکمہ کرتے ہوئے ان کے ایک ہونہار شاگرد پروفیسر عتیق اللہ نے لکھا ہے:

> ''وہ اپنی تنقید میں جس قدر یک سو' پراعتماد اور مرتکز دکھائی دیتے ہیں اور جس طرح ایک گہری متانت نیز اپنی نظریاتی توجہات کے باوجود تخلیقی ذہانت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں' ان کے معاصرین میں کم ہی نظر آتی ہے۔
>
> ان کی تنقید' تصورات اور نظریات کا اطلاق تو کرتی ہے مگر ان کی تشہیر یا فلسفیانہ نوعیت کے تعبیر و تحلیل کو اپنا کردار نہیں بناتی .... قمر رئیس جو کہ گزشتہ 35-30 برسوں سے تنقید کے کام سے جڑے ہوئے ہیں' پوری استقامت کے ساتھ تنقید کے اس رویے پر قائم ہیں جس میں تخلیق کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ یعنی عملی تنقید ان کی تحلیل کے عمل میں نمایاں کارکردگی کی حیثیت رکھتی ہے۔
>
> بالعموم افسانہ یا فکشن ان کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔ مگر ہمارے دور کے بعض اہم شعرا کے فکر اور فن کے اسالیب پر ان کے بعض مضامین شعر کی پرکھ کی بڑی عمدہ مثالیں قائم کرتے ہیں۔
>
> .... اس طرح قمر رئیس افسانوی ادب کے پہلو بہ پہلو شاعری کی تنقید کی طرف پہلے کی نسبت زیادہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔
>
> افسانوی ادب کی تنقید قمر رئیس کا پہلا سروکار ہے ...... غور طلب بات یہ ہے کہ اُن دنوں جب فکشن پر لکھے ہوئے مضامین تک کا قحط تھا' قمر رئیس نے پریم چند کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (1959ء) ان کی

تحقیقی دانش اور تنقیدی بینش کی ایک قابل قدر مثال ہے۔'' 80

شاعری

قمر رئیس کو شاعری سے فطری لگاؤ رہا ہے اور شعر گوئی کی ابتدا انہوں نے اس وقت سے کی تھی جب وہ نوجوانی کی منزلوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ اس کے باوجود قمر رئیس نے شاعری کو اپنا میدان نہیں بنایا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آج تک ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ البتہ ان کی کچھ نظموں کا ازبیکی ترجمہ 1972ء میں تاشقند میں ہوا تھا جس پر سجاد ظہیر نے پیش لفظ لکھا تھا مگر اُردو میں اب تک ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ مختلف اخبارات ورسائل میں ان کے احباب اور قدردانوں کے پاس اور خود قمر رئیس کی بیاض میں ان کی شعری نگارشات کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ ایسے بھی شواہد ملتے ہیں کہ وہ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے۔ چند برس قبل تک دہلی اُردو اکادمی کی جانب سے ہر سال 5 ستمبر کو منعقد کئے جانے والے اساتذہ کے مشاعرے میں بھی انہوں نے اپنا کلام پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنا کلام مرتب نہیں کیا' اسے کتابی شکل نہیں دی حتیٰ کہ اسے از خود قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ خود انہیں کی زبانی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں:

> ''اسباب تو کئی طرح کے ہیں۔ ذہن نثر لکھنے کی طرف مائل ہوگیا۔ شعر گوئی کی تحریک کم ہوگئی۔ رشید حسن خاں سے سیکھنے کی کوشش کے باوجود عروض پر پوری قدرت حاصل نہ ہوسکی۔ گیان چند جین اور ایک دوسرے بزرگ نے عروضی غلطیوں کی نشاندہی کی اور سب سے بڑا یہ احساس کہ میں اپنی صلاحیتوں سے اُردو شاعری کے موجودہ سرمایہ میں کوئی اہم اضافہ نہیں کرسکوں گا اور اس کی سطح کو بلند نہیں کرسکوں گا۔'' 81

قمر رئیس کا یہ احساس ایک اچھے اور سچے فنکار ہی کا نہیں ایک کھرے نقاد کا بھی احساس ہے۔ ان کا یہ بیان ان کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے جو قابل تحسین ہے۔ اس انٹرویو میں قمر رئیس نے اپنی شاعری کی

ارتقائی منازل کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر واقع جمود پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"47 - 1946 میں جب لکھنؤ میں نویں جماعت کا طالب علم تھا تب شعر گوئی کا مشغلہ شروع ہوا' غزل کہتا تھا' ایک سال بعد نظم بھی کہنے لگا۔ مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ خصوصاً طرحی مشاعروں میں۔

جی نہیں کوئی باضابطہ استاد نہیں تھا۔ کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی مبارک شمیم کو کلام دکھا لیتا تھا۔ محرکات؟ ابتدا میں سب سے بڑا محرک تو عشق ہی تھا۔ بڑے طوفانی اور بلا خیز عشق کئے ہیں میں نے۔

ایک ابتدائی نظم انتباہ' ماہنامہ ' شعاعیں' دہلی میں شائع ہوئی جس کی ایڈیٹر سلمیٰ صدیقی تھیں(پرانے تراشے دیکھ کر) دوسری' قہقہے ' دسمبر 48ء کے 'جمالستان' میں 1950ء میں 'جھلک' (علی گڑھ) میں بھی کچھ نظمیں چھپیں جس کے ایڈیٹر طاہر مرحوم میرے دوست تھے۔ 'شعاعیں' میں کافی نظمیں شائع ہوئی۔ پھر شاہراہ (دہلی) قومی آواز' پگڈنڈی امرتسر' شیرازہ (کراچی) اور لاہور کے کچھ پرچوں میں بھی غزلیں' نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

میں فیض اور جذبی سے زیادہ متاثر تھا۔ ظ انصاری مرحوم نے شاید 54ء میں ایک خط میں لکھا تھا کہ فیض کے دام سے بچئے۔

گلکار' مقبرہ' شہر پناہ' پہلے پہل' گردپس' کارواں میری اس زمانے کی اچھی نظمیں تھیں۔ لیکن اب یاد نہیں۔ محفوظ بھی نہیں۔

علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں اپنے عملی کام میں زیادہ مصروف رہا۔ شعر گوئی کا زوال وہیں سے شروع ہوا۔"[82]

قمر رئیس نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کی غزلیں دراصل جذبۂ عشق اور واردات قلب کا

بیان ہوتی تھیں۔ قمر رئیس شروع ہی سے حسن کے پرستار رہے ہیں۔ حسن کا پہلو انہوں نے بچپن ہی سے تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ عمر کے پرخطر دور یعنی جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ عشق و محبت (83) کے کئی مرحلوں سے گزرے۔ ان کی محبت کے واقعات بھی اپنے اندر بے حد تنوع رکھتے ہیں۔ کہیں عاشق ہوئے تو کہیں کوئی نازک اندام خود ہی ان پر فدا ہوگئی۔ کوئی محبت دیکھ لینے اور آہ بھر لینے تک محدود رہی تو کہیں معاملات عشق نے کئی کئی منزلیں طے کیں۔ ان تمام منزلوں اور مرحلوں میں دل کے حالات، کیفیات، جذبات اور احساسات کے اظہار کا بہترین وسیلہ شعر ہی ہوتا ہے۔ چونکہ قمر رئیس کو علم و ادب سے خصوصی لگاؤ تھا شاید اسی لئے انہوں نے اپنے دلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی کے لئے شاعری ہی کو اپنا ذریعہ بنایا۔ ان حالات میں جب شاعری شروع ہوئی تو فطری طور پر اس نے غزل کا روپ اختیار کیا۔ قمر رئیس غزلیں کہتے تھے اور اپنی سرگزشت احباب کو سناتے تھے۔ ان کا کلام اکثر و بیشتر شائع بھی ہوا کرتا تھا۔ قمر رئیس کے کالج کے زمانے کے ایک قریبی ساتھی جناب عصمت اللہ خاں اس دور کو یاد کرتے ہوئے قمر رئیس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ادھر ادھر کی، دنیا بھر کی باتوں کے علاوہ شعر و شاعری اور ادب پر بھی گفتگو رہا کرتی تھی۔ بیچ بیچ میں مصاحب علی میرے اصرار پر اپنی غزلیں بھی سنایا کرتے تھے کہ آج چالیس بعد مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مصاحب علی ایک صاحب طرز غزل گو شاعر کی حیثیت سے ابھرنے کے بجائے ایک نقاد اور ایک ترقی پسند ادیب کیسے بن گئے۔'' 84

قمر رئیس کو چونکہ ایک نقاد اور ترقی پسند ادیب بننا تھا اس لئے وہ بن گئے اور اگر ترقی پسند تحریک کے اس عہد پر نظر ڈالی جائے جب قمر رئیس کافی سرگرم تھے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ قمر رئیس کو اپنی افتاد طبع کے مطابق کام کرنے کا موقع ملا اور تحریک کو بھی ایک منظم اور بےلوث رہنما مل گیا۔ بہر حال! ذکر قمر رئیس کی شاعری کا تھا۔ ابتدائی دور میں غزلیں کہنے کے بعد یا اس کے ساتھ ہی انہوں نے نظم گوئی کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی نظمیں انتباہ، قہقہے، گلکار، مقبرہ، پہلے پہل اور گرد پس کارواں وغیرہ کافی مشہور بھی ہوئیں لیکن ان کی

نظموں میں بھی غزلوں کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی تمام شاعری میں آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے استعارات اور غیر فہم علامات اور اشارات و کنایات سے پرہیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں البتہ خوبصورت تشبیہات اور سبک و نازک لفظیات ان کی شاعری کی جان ہیں۔ یہ خصوصیات ان کی شاعری کے آغاز سے لے کر اب تک ہمیشہ ہر جگہ موجود رہی ہیں۔ البتہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ کلام کی شان میں اضافہ ہوتا گیا اور شاعری کا مجموعی تاثر بتدریج بلند سے بلندتر ہوتا گیا۔ موضوعات کا دائرہ صرف حسن و عشق تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے وسعت اختیار کرلی۔ ان کی شاعری کا موضوع خواہ صرف 'حسن' نہ رہا ہو مگر 'حسن بیان' ہر جگہ موجود ہے۔ جو شاعر کی فنی مہارت، تخیل کی قوت اور زبان و بیان پر قدرت کی شہادت دیتا ہے۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی قمر رئیس کی ایک نظم ''شب چراغ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' نظم ایک نیا موڑ لیتی ہے اور جذبہ واحساس پر خوف و ہراس غم رسوائی اور فکر کا پہلو غالب آجاتا ہے اور نظم ابرام وفا کے ساتھ احساس تنہائی پر ختم ہوجاتی ہے جو آغاز وانجام میں ربط قائم کرکے نظم کو ایک مربوط احساس کی شکل عطا کردیتا ہے۔ قمر صاحب کی یہ نظر عہد شباب میں محض ذہنی وجذباتی کش مکش کی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ یہاں جذبہ واحساس اور خارجی دنیا کے درمیان تصادم کی کیفیت بھی موجود ہے لیکن شگفتہ زبان وبیان اور لطیف تشبیہات نظم کی فضا کو ہیجان انگیزی سے محفوظ رکھتی ہیں اور درد وسوز کی دھیمی لذت سے آشنا کراتی ہیں۔''85

مذکورہ نظم ''شب چراغ'' کے دو بند ملاحظہ کیجیے جن میں الفاظ کا خوبصورت استعمال، روانی اور گزری ہوئی یادوں کے روشن چراغ نظر آتے ہیں:

> ''پھر بھی وہی کنج قفس، پھر وہی تنہائی ہے
> وہی یادوں کا چراغاں، وہی خوابوں کا طلسم
> وہی سنگیت، وہی گیت، وہی رس، وہی لے

وہی پھولوں کی قبا' موج مے ناب سا جسم
وہی عارض ' وہی آنکھیں' وہی زلفیں کہ جنہیں
میں ابھی بھول نہ پایا تھا کہ پھر یاد آئے
خم ابرو بھی وہی' سایہ مژگاں بھی وہی
پھر وہی لب جنہیں دیکھو تو نہ دیکھا جائے۔'' 86؎

قمر رئیس کی نظم ''نیم شب'' کے بارے میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی کا خیال ہے کہ یہ مجاز کی نظم 'آوارہ' کی یاد دلاتی ہے۔ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مجاز کی نظم شدید احساس تنہائی ومحرومی کا اظہار کرتی ہے جبکہ قمر صاحب کے یہاں یہ احساس صرف تنہائی تک ہی محدود ہے:

مجھ کو تنہائی کبھی اتنی گراں بار نہ تھی
ذہن میں تلخیٔ افکار تھی' پیکار نہ تھی
تیری وحشت کی قسم منزل شب دور نہیں
ہم بہت دور سہی' شہر طرب دور نہیں
چاند نکلا تھا مگر دیر ہوئی ڈوب گیا۔'' 87؎

قمر رئیس کی ایک اور نظم ''بستی بستی'' کا آخری بند ملاحظہ ہو:

دور یہاں سے اک منزل پر بستی ہے ایک اور جہاں
کل تجھ کو اس خواب گہ روماں سے اٹھ کر جانا ہے
دھوپ کے تپتے میدانوں میں' دھرتی سے چٹانوں سے
خوابوں کو اپنانا ہے' خوابوں کا گیت چرانا ہے۔ '' 88؎

قمر رئیس نے آزاد نظمیں بھی کہی ہیں اور ہیئت کے مختلف تجربے بھی کئے ہیں۔ ان کی شاعری محبت کے جذبے سے لبریز ہے جس میں ہر طرف حسن ہی حسن ہے۔ یہ حسن خواہ انسان کا ہو' فطرت اور کائنات کا ہو یا خود ان کے اپنے انداز اور طرز بیان کا ہو۔ ان کے دستیاب کلام کی کیفیت اور کمیت سے دو باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ ان کا کم از کم ایک مجموعہ کلام ضرور شائع ہونا چاہئے۔ اور دوم یہ کہ کاش انہوں نے اپنے اندر کے شاعر کو مستقل متحرک رکھا ہوتا تو آج ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آ چکے ہوتے! بقول سجاد ظہیر اس سلسلے میں انہوں نے

غیر معمولی 'بخل' سے کام لیا:

"میں بڑے خلوص کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب بھی قمر رئیس کی کوئی نظم یا غزل ہمارے رسالوں یا اخبارات میں شائع ہوتی ہے تو ہم اسے ایک ادبی "واقعہ" سمجھتے ہیں اور عرصے تک شعر وادب پڑھنے اور پرکھنے والوں اور جو ہر اصل کی تلاش کرنے والوں میں اس کا چرچا رہتا ہے۔ جواہر کی اور زیادہ مقدار پیش کرنے میں اتنا بخل کیوں کرتے ہیں!" 89

حواشی و حوالے

1. قمر رئیس کا یہ مضمون اُن کے مضامین کے پہلے مجموعہ "تلاش وتوازن" میں شامل ہے۔(م۔ج۔)

2. تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نگارش" ناولٹ نمبر۔امرتسر۔

3. راقمۃ الحروف نے مقالے میں پریم چند اور قمر رئیس۔کے عنوان سے قمر رئیس کے مطالعہ پریم چند پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اسی وجہ سے اس باب میں پریم چند پر لکھی گئی قمر رئیس کی تصانیف کے تعارف پر اکتفا کیا جارہا ہے۔(م۔ج)

4. قمر رئیس کے مجموعۂ مضامین کے ناموں میں حسین ارتباط ملتا ہے کہ اُن کے تینوں مجموعہ ہائے مضامین کے نام مرکب ہیں اور یہ دونوں ہی نام حرف "ت" سے تعلق رکھتے ہیں جیسے "تلاش وتوازن" "تنقیدی تناظر" اور "تعبیر وتحلیل"۔اگر یہ قمر رئیس کی شعوری سعی وکوشش ہے تو یہ عمل اُن کے شاعرانہ مزاج اور تنقیدی شعور اور ترتیب وآگہی کا پتہ دیتا ہے۔(م۔ج)

5. نگارش 3 ناولٹ نمبر غالباً 1962ء میں شائع ہوا ہے۔راقمۃ الحروف کے پیش نظر جو رسالہ ہے وہ نامکمل ہے۔ٹائیٹل اور اُس کے بعد کا صفحہ نہیں ہے البتہ اداریہ موجود ہے لیکن اس پر سنہ اشاعت نہیں ہے۔چونکہ رسالے کے آخر میں جگر مرادآبادی کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے جگر نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا گیا ہے اسی سے راقمۃ الحروف نے اس رسالے کی اشاعت کا قیاسی سنہ 1962ء متعین کیا ہے۔(م۔ج)

6. ڈاکٹر حبیب نثار نے قمر رئیس سے روایت کی ہے کہ "ناول اور داستان" بہت جلد علاحدہ کتابی شکل میں شائع ہونے والی ہے۔(م۔ج)

7. ڈاکٹر محمد انورالدین "حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل" ص24 1997ء

8۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ''ماسٹر رام چندر اور اُردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ'' ص84 1960ء

9۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''صحافت پاکستان و ہند میں'' از عبدالسلام خورشید'' ص137 لاہور 1963ء

10۔ قمر رئیس کی حیات اور ادبی خدمات پر لکھے جانے والے بیشتر مضامین میں مثلاً ''ادبی صحافت اور قمر رئیس'' از سلمیٰ شاہین یا قمر رئیس ایک تاثراتی مطالعہ از رفعت سروش یا قمر رئیس از احمد جمال پاشا (تمام مضامین بشمول قمر رئیس ایک زندگی مرتبہ سلمیٰ شاہین) میں یہ اطلاع تو دی گئی ہے کہ قمر رئیس نے 1957ء میں ''درس'' کی ادارت سنبھالی لیکن کس تاریخ اور مہینے میں' اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ راقمۃ الحروف کو سلمیٰ شاہین کے مضمون سے پتہ چلا کہ ''درس'' کا نام ''ادیب'' جنوری 1958ء میں تبدیل کیا گیا اسی سنہ کو بنیاد بنا کر میں نے درس کی ادارت سنبھالنے کا مہینہ جنوری قرار دیا ہے کہ درس کی ادارت سنبھالنے کے ایک برس بعد نام کی تبدیلی کا بیان بیشتر مقالہ نگار حضرات نے کیا ہے۔م۔ج)

11۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''ادب اور انتقاد'' از نیاز فتح پوری مضمون مشمولہ ''تنقیدی نظریات'' جلد دوم مرتبہ سید احتشام حسین

12۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ''ادبی صحافت اور قمر رئیس'' ص387 مضمون مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' مرتبہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین

13۔ سلمیٰ شاہین ''ادبی صحافت اور قمر رئیس'' ص 389 مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی

14۔ بحوالہ ''قمر رئیس ایک زندگی'' ص 388

15۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ''ادبی صحافت اور قمر رئیس'' ص 389 مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی

16۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ''ادبی صحافت اور قمر رئیس'' ص390 مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی

17۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ''ادبی صحافت اور قمر رئیس ص391 مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی

18۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی' ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 343 -342

19۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین' ادبی صفحات اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص391

20۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین' ادبی صفحات اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص392

21۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی' ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 343

22۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی' ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص343

23۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ''قمر رئیس' نظریاتی اور جمالیاتی تنقید کا سنگم'' مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص289

24۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی' ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی' سلمیٰ شاہین ص343

25۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین' ادبی صحافت اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی' سلمیٰ شاہین ص393

26۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین' ادبی صحافت اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی' سلمیٰ شاہین ص 394

27۔ راقمۃ الحروف نے مقالے کے باب ''ازبکستان اور قمر رئیس'' میں اس سفرنامے پر تفصیل سے اظہار کیا ہے۔ (م۔ج)

28۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس مشمولہ قمر رئیس :ایک زندگی ص 353-352

29۔ قمر رئیس ''اُردو ڈرامے'' مقدمہ ص48 1961ء

30۔ مقدمہ مشمولہ ڈاکٹر قمر رئیس۔ ''اُردو ڈرامہ۔انتخاب مع مقدمہ'' ص 48 سر سید بکڈ پو علی گڑھ ۔1961ء

31۔ڈاکٹر محمد حسن ''نئے ڈرامے'' 1958ء

32۔مقدمہ مشمولہ ''اُردو ڈرامہ۔انتخاب مع مقدمہ'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 48 سر سید بکڈ پو علی گڑھ ۔1961ء

33۔ محمد عمر و نور الٰہی ''ناٹک ساگر'' ص 7 پہلا اکادمی ایڈیشن 1982ء

34۔مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 11 و 12 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔جون 1976ء

35۔ مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 19 و 20 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ جون 1976ء

36۔مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 15 و 16 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۔جون 1976ء

37۔ مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 16 و 17 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔جون 1976ء

38۔ مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 18 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔جون 1976ء

39۔ مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 21 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔جون 1976ء

40۔ مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 24 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔جون 1976ء

41۔ مقدمہ مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 29 تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ جون 1976ء

42۔پیش لفظ مشمولہ ''اقبال کا شعور فن'' ڈاکٹر قمر رئیس ص 6 شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی۔مئی 1979ء

43۔ علی احمد فاطمی ''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس'' ص 344 مضمون مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی

44۔ کارواں بنتا گیا مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص 14 و 15 ' 1987ء

45۔ کارواں بنتا گیا مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص 26 و 27 ' 1987ء

46۔بحوالہ ''کاروان بنتا گیا'' ص38 ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر

47۔سید عاشور کاظمی ''کاروان بنتا گیا'' ص 39۔مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر''

48۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''اداریہ پیش گفتار'' ص 10 مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر

49۔ کاروان بنتا گیا مشمولہ ''تقرقی پسند ادب پچاس سالہ سفر پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص 10 1987ء

50۔ پیش لفظ مشمولہ اُردو میں لوک ادب پروفیسر قمر رئیس ص 5 و 6 ' جنوری 1990

51۔ پیش لفظ مشمولہ اُردو میں لوک ادب پروفیسر قمر رئیس ص 6 'جنوری 1990

52۔ پیش لفظ مشمولہ اُردو میں لوک ادب پروفیسر قمر رئیس ص 7 'جنوری 1990

53۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو'دکن کی مخصوص شعری اصناف اور دوسرے مضامین' از ڈاکٹر حبیب نثار' 1995ء

54۔ پیش لفظ مشمولہ اُردو میں لوک ادب پروفیسر قمر رئیس ص 10 و 11 'جنوری 1990

55۔ پیش لفظ مشمولہ اُردو میں لوک ادب پروفیسر قمر رئیس ص 13 و 14 'جنوری 1990

56۔ تفصیل کے لیے دیکھئے''اُردو میں لوک ادب'' ص 14 مرتبہ پروفیسر قمر رئیس

57۔ پروفیسر قمر رئیس نے''اُردو میں لوک ادب''میں جو پیش لفظ لکھا ہے اسے''اُردو میں لوک ادب'' کے نام سے 1997ء میں شائع ہونے والے اپنے مجموعہ مضامین''تعبیر و تحلیل''میں شامل کیا ہے جو کہ صفحہ 145 تا 155 پر محیط ہے۔(م۔ج)

58۔ جڑیں اور کونپلیں مشمولہ نیا افسانہ۔مسائل اور میلانات پروفیسر قمر رئیس ص 185 اُردو اکادمی دہلی' 1992

59۔ پیش گفتار مشمولہ نیا افسانہ۔مسائل اور میلانات پروفیسر قمر رئیس ص 11 اُردو اکادمی دہلی' 1992

60۔ قمر رئیس مرتب''جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ''ص 11 جون 1993ء

61۔ ڈاکٹر قمر رئیس''جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ''ص 13 'جون 1993

62۔ پروفیسر قمر رئیس ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' ص 11 اُردو اکادمی' دہلی مارچ 1990ء

63۔ قمر رئیس نے اس پیش لفظ کو اپنے مجموعہ ہائے مضامین''تعبیر و تحلیل''میں اسی عنوان سے شائع کیا ہے۔جس کے ذیل میں قوسین میں''ایک پیش لفظ'' کی سرخی بھی موجود ہے ملاحظہ ہو صفحات 135 تا 145 تعبیر و تحلیل(م۔ج۔)

64 ' 65 و 66۔ قمر رئیس''دہلی میں اُردو افسانہ کی روایت'' پیش لفظ' آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ ص 12 و 13 1990ء

67 و 68۔ پروفیسر قمر رئیس ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' ص 13 اُردو اکادمی' دہلی مارچ 1990ء

69۔ پروفیسر قمر رئیس ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' ص 15 اُردو اکادمی' دہلی مارچ 1990ء

70۔ پروفیسر قمر رئیس ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' ص 21-20 اُردو اکادمی' دہلی مارچ 1990ء

71۔ پروفیسر قمر رئیس ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ'' ص 22 اُردو اکادمی' دہلی مارچ 1990ء

72۔ ڈاکٹر حبیب نثار سے گفتگو بمقام دہلی بتاریخ 5 مارچ 2003ء

73۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس'' ص 355 و 356 مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی۔مرتبہ سلمیٰ شاہین

74۔ ڈاکٹر حبیب نثار سے گفتگو بمقام دہلی بتاریخ 5 مارچ 2003ء

75۔ منشی پریم چند''ادب کی غرض و غایت''،مضمون مشمولہ رسالہ گفتگو،ممبئی ترقی پسند ادب نمبر' مدیر سردار جعفری ص 27 بابت مارچ 1980ء

76۔ نورالحسن نقوی''فن تنقید اور اُردو تنقید نگاری''ص 87-185 ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1998ء

77۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص 9-8 ادارہ خرام پبلیکیشنز دہلی بار اول 1968ء

78۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص 9 ادارہ خرام پبلیکیشنز دہلی بار اول 1968ء

79۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ''اُردو تنقید اور قمر رئیس'' مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی ص 308

80۔ عتیق اللہ ''قمر رئیس کا تنقیدی موقف اور ترجیحات'' مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی ص 269 - 268

81۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم'' قمر رئیس بحیثیت شاعر: چند سوالوں کے جواب میں'' مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 398

82۔ ارتضیٰ کریم'' قمر رئیس بحیثیت شاعر: چند سوالوں کے جواب میں'' مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی 98 - 397

83۔ تفصیل کیلئے' قمر رئیس: ایک زندگی' میں شامل عصمت اللہ خاں' احمد جمال پاشا' اقبال مجید کے مضامین ملاحظہ ہوں۔ (م ج)

84۔ عصمت اللہ خاں'' مصاحب علی بنام قمر رئیس'' مضمون مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 30

85' 86 و 87۔ بحوالہ پروفیسر عظیم الشان صدیقی ''جادہ شوق کا شاعر'' مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 311

88۔ بحوالہ پروفیسر عظیم الشان صدیقی ''جادہ شوق کا شاعر'' مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 317

89۔ سجاد ظہیر'' قمر رئیس بحیثیت شاعر'' مضمون مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 211

☆☆☆

باب سوم

ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر قمر رئیس سے عبارت ہے۔

ترقی پسند تحریک کی نیو لندن میں رکھی گئی۔ 1930ء میں لندن میں چند ہندوستانی طالب علموں نے اپنے ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی و جستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہندوستانیوں کو پستی، غلامی، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا خواب دیکھا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کے وسیلے سے ''انسانیت کا نشاۃ ثانیہ'' قرار دیا گیا تھا۔ ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کی سب سے عظیم اور کامیاب ادبی تحریک تھی جسے خلیل الرحمٰن اعظمی نے ''علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری شعوری تحریک'' (1) قرار دیا ہے۔ اپنی تصنیف ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' میں ترقی پسند تحریک کے ادبی سفر کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس کے زیر اثر ہمارے ادب کو بعض بڑی اہم تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جن لوگوں نے اُردو ادب کے مختلف شعبوں کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے اور زمانۂ حال کے ادبی رجحانات کو اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہماری زبان میں شعر وادب کا ایک معتدبہ ذخیرہ اس تحریک کی پیداوار ہے۔ ترقی پسند مصنّفین کے نام سے ہمارے ملک میں جو تحریک 1935ء میں

شروع ہوئی اس کی یہ خصوصیت نظر میں رکھنے کی ہے کہ یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اتحاد و اشتراک کا ایک وسیلہ بن گئی۔" 2

ڈاکٹر سیما صغیر اُردو اور ہندی ادب کے حوالے سے ترقی پسند تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"اُردو اور ہندی ادب کے نقطہ نظر سے ترقی پسند تحریک سب سے بڑی بلکہ عہد ساز تحریک ہے اور یہ دعویٰ غلط نہیں کہ اس کا دامن وسیع، جڑیں گہری اور تخلیقی فن تابناک رہا ہے۔ اس نے دونوں زبانوں میں فکری اور فنی اعتبار سے جو تخلیقی سرمایہ عطا کیا ہے اور جو انمول شہ پارے بطور یادگار چھوڑے ہیں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اچاریہ نند دلارے باجپئی نے اسے نوجوانوں میں ایک نئی طاقت پیدا کرنے والا بتایا تو ہزاری پرساد دیویدی نے اس کا موازنہ بھکتی تحریک سے کیا ہے۔ 3

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی بنیاد نومبر 1935ء میں ڈنمارک اسٹریٹ لندن کے "نان کنگ" ریسٹوران میں رکھی گئی اور اس کا ایک مینوفیسٹو تیار کیا گیا۔ اس کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں ہندوستان روانہ کی گئیں۔ دسمبر 1935ء میں سجاد ظہیر اپنی تعلیم ختم کر کے ہندوستان آئے اور اپنے ہم خیال ادیبوں کے تعاون سے اپریل 1936ء میں پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام اور اُس کے بعد تخلیق ہونے والے ترقی پسند ادب کے ادبی و سماجی تناظر کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ماضی مستقبل کے لیے ہماری جدوجہد میں انسپریشن فراہم کرسکتا ہے لیکن وہ ہمارے ذہنوں اور ہماری فکری صلاحیتوں کو جکڑ کر مفلوج نہیں کرسکتا۔ یہیں سے احیا پسندی اور ترقی پسندی کے درمیان حدیں قائم ہوتی ہیں۔

اس طرح 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین قائم ہوئی اور ترقی پسند ادب کا دھارا پھوٹ نکلا تو یہ نہ کوئی تعجب کی بات تھی، نہ کوئی آسمان سے نازل ہونے والی بلا یا نوازش ہی تھی اور نہ کوئی ایسا پردا تھا جو بدیس سے لاکر سرزمین ہند پر لگادیا گیا تھا۔ یہ انیسویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کے ادب پھر سامراج دشمن جدوجہد کے دوران بیسویں صدی کے اوائل میں پیدا ہونے والے اجتہادی ادب کی توسیع تھی۔" 4

حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز اتفاقی کارنامہ نہیں تھا۔ اس کا خمیر انیسویں صدی میں تیار ہو چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جب سراج الدولہ نے انگریزوں کو سرزمین ہندوستان سے نکال باہر کرنا چاہا، اُسی وقت سے ہندوستان کی سرزمین پر ترقی پسند فکر کے نقوش اُبھرنے لگے تھے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی کوششوں نے سامراج کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے انسان دوستی اور ظلم وزبردستی کے خاتمے کی سعی بلیغ کی۔ انیسویں صدی میں رونما ہونے والی بیشتر اصلاحی تحریکیں اس بات پر دال کرتی ہیں کہ یہ اپنے زمانے میں انسان دوستی اور سماجی ہم آہنگی کی غرض سے چلائی گئی تھیں۔ انیسویں صدی میں ترقی پسند کاوشوں کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

"یوں تو ہندوستان میں سیاسی وقومی بیداری کا آغاز بہت پہلے ہوچکا تھا اور اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، وہابی تحریک، فرائضی تحریک، راجہ رام موہن رائے اورکیشپ چندر سین کی تحریکیں، سرسید کی علی گڑھ تحریک اور بعض دوسری اصلاحی تحریکوں کا مطالعہ تاریخ وعمرانیات کے طالب علموں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان تحریکوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کس تیزی سے ہندوستانی ذہن بیرونی تسلط سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کررہا تھا۔" 5

"بیرونی تسلط" سے ہندوستانی ذہن جس تیزی سے آزاد ہونے کی فکر میں تھا اُسی رفتار سے اُردو کے

ادیب وشاعر بھی ادب اور سماج میں تبدیلیوں کی فکر کر رہے تھے۔ 1857ء کے سانحہ کے باوجود اُردو ادب نے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور ادیبوں نے ادب اور سماج کے رشتہ کا تعین کرنے کے بعد ادب کی مروجہ اصناف اور اُن کے موضوعات میں تبدیلی کی جانب خصوصی توجہ دی۔ 1857ء کے بعد جو اہم تبدیلی اُردو ادب میں رونما ہوئی وہ انجمن پنجاب کا قیام اور اُس کے تحت منعقد ہونے والے نظمیہ مشاعرے تھے۔ ان مشاعروں میں بجائے مصرع طرح، نظم کا موضوع دیا جانے لگا۔ یہ تمام مشاعرے کامیاب ہوئے اور اُردو میں جدید نظم کی روایت کا آغاز ہوا۔ اس عہد میں تخلیق ہونے والے ادب کی اہم خصوصیت اصلاح معاشرہ قرار پائی ہے اور 1857ء کے بعد کا پورے کا پورا ادب سماجی برائیوں سے برسر پیکار نظر آتا ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مرزا محمد ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر کے افکار اسی زمانے میں تخلیق کا روپ لیتے ہیں۔ اس دور کی ادبی کشمکش کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> ''اس دور کی ادبی کشمکش ترقی پسند اور جارحانہ قدامت پسند قوموں کے درمیان تصادم کا عکس پیش کرتی ہے اور نسیم مغرب کا ان کلیوں کو چٹکانے میں بہت بڑا رول ہے۔'' 6

''نسیم مغرب'' کہہ کر راج بہادر گوڑ نے انجمن پنجاب لاہور اور انڈین نیشنل کانگریس کے قیام میں انگریزوں کے اہم اور عملی حصہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

ہر دور میں ایسے فنکار موجود رہے ہیں جنہوں نے ظلم و جبر کے رویے کی مذمت کی ہے۔ غیر منصف حکمراں کے خلاف آواز بلند کی ہے اور حق وانصاف کی حمایت کی ہے۔ سودا کی ہجو تضحیک روزگار ہو یا نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں غربت اور مفلسی کا ذکر ہو، ان سبھی میں ترقی پسند عناصر موجود ہیں۔ سودا کے انتقال کے کم و بیش ایک صدی بعد 1893ء میں خواجہ الطاف حسین حالی کا مقدمہ شعر و شاعری منظر عام پر آیا جس کے بارے میں نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''(اسے) بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اُردو تنقید کا پہلا نمونہ کہا اور پروفیسر آل احمد سرور نے اُردو شاعری کے پہلے

منشور کا نام دیا۔'' 7

حالی اپنے مقدمے کے ابتدائی حصے میں لکھتے ہیں:

''جھوٹ' مبالغہ 'بہتان' افترا' صریح خوشامد 'ادعائے بے معنی' تعلّی بے جا' الزام لایعنی' شکوہ بے محل اور اس قسم کی باتیں جو صدق و راستی کے منافی ہیں، اور جو ہماری شاعری کے قوام میں داخل ہو گئی ہیں ان سے جہاں تک ممکن ہو احتراز کیا جائے۔'' 8

اُنہوں نے اپنے عہد کے تناظر کا بیان کرتے ہوئے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا:

''زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔'' 9

درج بالا اقتباسات میں حالی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُردو شاعری کو گل وبلبل اور کنگھی چوٹی سے بالاتر کر کے اسے مقصدیت کی طرف موڑنے کے خواہش مند ہیں۔ بیجا مبالغہ آرائی' کذب و افترا اور دلفریب قسم کے مضامین سے وہ بیزار ہیں اور ان کی جگہ مفید اور بکارآمد مضامین پر زور دیتے ہیں۔ حالی نے اپنے مقدمے میں مختلف اصناف کا ذکر کرتے ہوئے قصیدے کی مخالفت اور مثنوی کی زبردست حمایت اسی لیے کی ہے کہ اول الذکر سے جھوٹی تعریف اور خوشامد پسندی مقصود ہوتی ہے جبکہ موخر الذکر صنف مثنوی میں ہر بات مبسوط' مربوط انداز میں مسلسل پوری طرح سے اور بھرپور طور پر بیان کی جا سکتی ہے۔ غرض کہ اُردو تنقید کی پہلی باقاعدہ تصنیف کی اشاعت کے وقت ہی سے اُردو میں افادی اور مقصدی ادب پر زور دیا جانے لگا تھا جو ترقی پسند ادب کی روح تصور کی جاتی ہے۔ اسی عہد کی ایک قدآور شخصیت محمد حسین آزاد نے ''نیرنگ خیال'' میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی

طوطا مینا کی زبانی سنائیں، ترقی کریں تو دو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اُڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے۔ اس واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہئے ۔ علوم و فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہئیں جو صاف شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہماری بزم کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں سب نظر آئیں اور آب تاثیر سے دھوئے جائیں۔ تم دیکھتے ہو بے جان مورتوں میں جان پڑنے کی ساعت آگئی ہے۔ قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جاں بخشی کی تاثیر پیدا کرے۔ اس تحریر سے یہ غرض نہیں ہے کہ زبان کے کپڑے اتار کر ننگا کر دو۔ استعارہ، تشبیہ کا نام نہ رہے۔ ہاں ایسے کپڑے پہناؤ کہ اصلی حسن کو روشن کر دیں نہ کہ اندھیرا چھا جائے۔ اور زبانوں میں کیا ہے جو ہماری زبان میں نہیں۔ ہاں طرز بیان کا ایک ڈھب ہے، وہ تقریر میں آجانا چاہئے، فقط اتنی ہی کمی ہے۔" 10

آزاد اور حالی کے ان اقتباسات سے سب سے پہلے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سماجی صورتحال کیا تھی اور پورے معاشرے پر بے عملی اور بے حسی نے کس طرح اپنا تسلط قائم کر رکھا تھا۔

1884ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا جسے A.U. Hume نے انگریز حکمرانوں کے ایماو اشارہ پر ہندوستانیوں کو سماجی حقوق کی جدوجہد کی غرض سے قائم کیا تھا۔ لیکن 1857ء کے بعد ارتقاء پذیر فکر اور اصلاحی نقطہ نظر نے ہندوستانیوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کانگریس کو اپنے سماجی حقوق حاصل کرنے ہی کے لیے استعمال نہ کریں بلکہ ملک کی آزادی کے لیے بھی اسی کے ذریعے جدوجہد کی جائے۔ اور اس طرح ہندوستان کی جدوجہد آزادی پروان چڑھنے لگی۔ 1920ء کے بعد خلافت تحریک نے ہندوستانیوں کو قومی یک جہتی کا بے مثال مظاہرہ کرنے کا موقع دیا لیکن آزادی اور سماجی انصاف اب بھی بہت دور تھا۔ اُدھر عالمی سطح پر 1924ء کے بعد جرمنی میں ہٹلر کا عروج ہوا اور اُس کے نظریے نے فاشزم کو فروغ دیا۔ یورپ میں سماجی ڈھانچہ پامال ہونے لگا اور

فرد واحد کی مرضی، قوم کی مرضی قرار پائی۔ عالمی سطح پر ادیبوں نے ہٹلر کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کیا اور ادھر ہندوستان میں جدوجہد آزادی تیز سے تیز تر ہوتی گئی ایسے میں 1932ء کے آخر میں ''انگارے'' شائع ہوئی۔

''انگارے'' کے مرتب سجاد ظہیر تھے۔ افسانوں کے اس مجموعے میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے ''نیند نہیں آتی'' ''جنت کی بشارت'' ''گرمیوں کی ایک رات'' ''دلاری'' اور ''پھر یہ ہنگامے'' احمد علی کے دو افسانے ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات'' رشید جہاں کا ایک افسانہ ''دلّی کی سیر'' اور ایک ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' اور محمود الظفر کا افسانہ ''جواں مردی'' شامل تھے۔ ''انگارے'' شائع ہوتے ہی اُتر پردیش میں ''آگ'' لگ گئی اور علماً کی جانب سے خصوصاً اور ادیبوں کی جانب سے دبی دبی آواز میں اس مجموعہ کے خلاف آوازیں (11) اٹھنے لگیں۔ بالآخر اپریل 1933ء میں اس کتاب کو ضبط کرلیا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس انگارے کی اشاعت، اُس کی ضبطی اور اثر کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انگارے اُردو افسانوی ادب میں ذہنی بغاوت اور جرأت آزما تخلیقی تجربات کی ایسی دستاویز ہے جس کی اہمیت کا احساس اور علم عام نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہوکہ یہ کتاب شائع ہونے کے فوراً بعد بحق سرکار ضبط کرلی گئی اور ناشر کے پاس اس کے جو نسخے بچے، وہ جلا دیے گئے۔ کہانیوں کا یہ مختصر سا مجموعہ نہ صرف یہ کہ زوال پذیر جاگیر دارانہ معاشرت اور اس عہد کی ذہنی حقیقتوں کا مرقع تھا بلکہ اس آئینہ میں آنے والے دور کی حقیقتیں بھی اپنا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ پریم چند کے بعد اُردو افسانہ کی جو نئی بساط بچھی، جو نئے رجحانات سامنے آئے اُسے ان کا پیش رو ہی نہیں سرچشمہ بھی کہا جاسکتا ہے۔
>
> 1932ء کے آخر میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ان حلقوں اور اداروں میں غیظ و غضب کی آگ سی دہک اٹھی جن کے مفاد اور ساکھ کو اس سے ضرب پہنچی تھی جو بڑی حد تک اس کا ہدف ملامت تھے۔ اس کی کہانیوں میں گستاخانہ بے باکی،

برہمی' تلخ نوائی اور سرکشی تھی ۔وہ ایک نئی نسل کے طرز وفکر واحساس اور ایک نئے تصور فن کی آمد کا اعلان تھی۔'' 12

اُردو افسانے پر انگارے کے اثرات اور اُس کی روایت کے فروغ کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے ''انگارے کی اشاعت ہی کو ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اُس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ'' قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے اسی خیال سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں:

''تقریباً نصف صدی قبل ''انگارے'' کی اشاعت محض چند افسانوں کے ایک مجموعہ کی اشاعت نہ تھی بلکہ فرسودہ روایات اور رسمی قبود سے بغاوت کا مہذب اظہار تھی۔ ایک نئے عہد نامے کا اعلان تھا۔'' 13

اسلم جمشید پوری نے بھی ڈاکٹر قمر رئیس کی تحریر سے فیض اٹھاتے ہوئے ''انگارے'' کی اشاعت کو انقلاب آفریں اقدام اور نئے عہد اور نئے طرز کی نوید قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''انگارے دراصل اپنے عہد کی سیاسی' سماجی اور ادبی رویوں کی نفی کی صورت (میں) مضبوط و مستحکم آواز کی شکل میں سامنے آیا۔

.... انگارے دبی ہوئی آگ کو ہوا دینے میں کامیاب ہورہا تھا اور یہ کہنے میں عار نہیں کہ انگارے نے ہی ترقی پسند تحریک کے لیے بنیاد کے پتھر کا کردار ادا کیا .... انگارے کی اشاعت' ہندوستانی سماج خصوصاً اُردو ادب میں انقلاب آفریں اقدام ثابت ہوئی۔ اس کے افسانے ایک طرف جہاں روایت سے کھلا اور واضح انحراف تھے وہیں دوسری طرف ایک نئے عہد اور نئے طرز کی نوید بھی۔'' 14

''انگارے'' کی اشاعت کے بعد ''سرفراز'' ''مدینہ'' ''سچ'' ''اُردو'' ''جامعہ'' ''زمانہ'' میں تبصرے شائع ہوئے۔ جامعہ میں فبروری 1933ء میں تین صفحات پر محیط تبصرہ شائع ہوا جس پر تبصرہ نگار کے نام کی جگہ ''م'' لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے یہ پتہ لگایا کہ یہ تبصرہ دراصل پروفیسر مجیب (15) کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ پروفیسر مجیب'

سید سجاد ظہیر کے دوست تھے چنانچہ تبصرہ میں انہوں نے سید سجاد ظہیر کے افسانوں پر زیادہ توجہ دی بہر حال تبصرہ نگار پروفیسر محمد مجیب نے افسانوں کے مطالعہ کے بعد لکھا کہ انگارے حقیقتاً انگارے ہیں افسانے نہیں۔ اقتباس دیکھئے۔

''انگارے واقعی انگارے ہیں محض افسانے نہیں۔ ان میں صرف زندگی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی زندگی اور ان کا مقصد یہ ہے کہ دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہو' ہمارے معاشرے میں آگ لگ جائے۔ مسلمانوں کی موجودہ معاشرت' خیالات' عقائد سب پروار کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی ہنسی اُڑائی گئی ہے' کہیں عیب ظاہر کیے گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ غریبی' بے کسی' مظلومیت' جہالت کی درد انگیز تصویریں بھی ہیں۔ اور معاشرے کے خوشحال آزاد طبقے جو ظلم کرتے ہیں ان کی شکایت بھی کی گئی ہم کو اپنی زندگی اور معاشرت کے تصور پر یہ اعتراض نہ کرنا چاہئیے کہ اس کو ہمارے عقیدے اور تعصب سے اتفاق یا ہمدردی نہیں اور جن چیزوں کا ہم احترام کرتے ہیں ان کی وہ عزت اور قدر نہیں کرتا۔ تنقید کی آزادی نہ ہو تو اصلاح کی گئی .... رہتی وہ نخوت اور تکبیر جو تنقید کو توہین' اختلاف کو عداوت اور خیالات کے لیے تکلف اظہار کو بدتمیزی قرار دے۔'' 16ؔ

پروفیسر محمد مجیب نے انگارے کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُس وقت کے ہندوستانی سماج اور سماجی زندگی کی صورت حال کا بھی تجزیہ کیا ہے اور آخر میں تنقید کی اہمیت کا بیان کیا ہے۔ ''انگارے'' کے خلاف جب رسالوں اور اخباروں میں مضامین' مقالات اور مراسلے شائع ہو رہے تھے اُس وقت کسی اُردو رسالے یا اخبار نے تو کسی انگریزی رسالے اور اخبارات نے بھی اس مجموعہ کی تائید میں اظہار خیال نہیں کیا۔ البتہ محمود الظفر جن کا ایک افسانہ ''انگارے'' میں شامل تھا' نے الہ آباد کے اخبار ''لیڈر'' میں انگریزی میں مضمون (17ؔ) لکھا جس کا عنوان تھا "Shall we submit to gagging"

''انگارے'' کے افسانوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اُس کی حقیقی افادیت و اہمیت کو پہلی مرتبہ ڈاکٹر

قمر رئیس نے اپنے مضمون ''اُردو افسانہ میں ''انگارے'' کی روایت'' میں اُجاگر کی' یہ مضمون سردار جعفری کے رسالے ''گفتگو'' کے خصوصی شمارے ترقی پسند ادب نمبر جلد اول میں شائع ہوا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے محرکات کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ انگارے دراصل اس تحریک کا ''پہلا غیر رسمی اعلان نامہ'' تھا۔ اقتباس دیکھیے۔

> ''اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ 'انگارے' کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی۔ بوسیدہ عقیدوں' فرسودہ اداروں' سماج دشمن طاقتوں اور مجہول سماجی واخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئی انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔ امیروں' حاکموں اور اہل اقتدار کے مقابلے میں زیر دستوں' ناداروں' مجبوروں اور محکوموں کی حمایت ادب میں ایک ایسے دور کی آمد کا اعلان تھی جب تخلیقی ادب کی بنیاد طبقیاتی شعور اور اشتراکی انسانی دوستی پر رکھی جاتی تھی۔ موضوع مواد اور فن کے نئے تجربے' تخلیقی اظہار کے ان بے شمار نئے سانچوں کی جستجو کی علامت تھے جسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاتھوں نقطۂ کمال تک پہنچنا تھا۔ اسی لیے وقار عظیم نے کہا ہے کہ ''انگارے نئے اور پرانے افسانے کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو دونوں کو جوڑتی نہیں بلکہ الگ کرتی ہے۔'' 18

انگارے کی اشاعت اور اُس پر کئے جانے والے ردعمل کا یہ تفصیلی بیان اس لیے کیا گیا کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے آغاز سے قبل کا ادبی پس منظر واضح انداز میں سامنے آجائے اسی کے ساتھ انگارے کے مصنّفین کی فکری اساس کا بھی پتہ چلے۔ اس لیے کہ انھی مصنّفین نے تین برس بعد انجمن قائم کی۔ انجمن کی تشکیل اور اُس کے مقاصد کا بیان کرتے ہوئے احمد علی لکھتے ہیں:

> ''محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورے سے

1933ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے۔ ان کی رضامندی کا ذمہ لیا۔ جو بعد میں انھوں نے خود بھی بذریعہ خط بھیجدی۔ چنانچہ 33-1932ء میں اس کے بانی مبانیوں کے ساتھ جو اصل مقصد تھا وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ ہم ان تمام اہم مسائل زندگی پر آزادئ رائے اور تنقیدی حق چاہتے ہیں۔ جو نسل انسان کو بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں۔'' 19

احمد علی نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کے سلسلے میں 1933ء کی نشاندہی کی ہے۔ اواخر 1932ء میں ''انگارے'' شائع ہوئی۔ ابھی اس مجموعہ پر پابندی عائد نہ ہوئی تھی کہ سجاد ظہیر لندن چلے گئے اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد یورپ کا سفر اختیار کیا اور انہوں نے بغور یورپ کے بدلتے ہوئے سیاسی وسماجی افق کا مطالعہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی سے ملک بدر کیے گئے ادیب' آرٹسٹ' سائنسداں جوق در جوق پیرس ولندن پہنچ رہے تھے۔ 1935ء میں یورپ کی اس بدلتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر ادیبوں اور فنکاروں نے کانگریس منعقد کی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیا کے ادیب تحریک کی شکل میں متحد ہوئے۔

سید سجاد ظہیر' اس عالمی سیاسی افراتفری اور لندن میں زیر تعلیم ہندوستانی طالب علموں کی فکری اساس کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم کو لندن اور پیرس میں جرمنی سے نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں ہر طرف سنائی دیتیں۔ جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچارہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جن میں عوام الناس کے ہر دل عزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ خوفناک واقعات جو وقتاً فوقتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سرقلم ہونے کے

بارے میں اخباروں میں چھپتے۔ وہ اندوہ ناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس چمکدار دنیا سے جس کا نام جرمنی تھا پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراونی پرچھائیں ڈال رہا تھا اور ان سب نے ہمارے دل ودماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔ صرف ایک طاقت اس جدید بربریت کا مقابلہ کرسکتی تھی اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت۔ اس جماعت کی طاقت جو اکٹھا ہوکر کام کرنے سے مسلسل طبقاتی جدوجہد کا تجربہ حاصل کرکے ایک ایسا انقلابی جماعتی شعور پیدا کرتی جارہی تھی جو اسے سماج کو نیچے گھسیٹنے والی سرمایہ داری کو شکست دینے اور مستقبل کی معاشرت کی تعمیر کرنے کا بدرجۂ اتم اہل بناتی۔'' 20ے

سید سجاد ظہیر نے اپنی 'یادیں' لکھتے ہوئے جمع کا صغیہ ''ہم'' برتا ہے۔ جس زمانے کا ذکر سجاد ظہیر نے اس اقتباس میں کیا ہے اُس وقت اُن کے ہمراہ اور ہم خیال جو ہندوستانی نوجوان طالب علم تھے اُن میں انگریزی اور اُردو زبان کے ادیب وناول نگار ملک راج آنند، بنگال کے ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اردو کے ادیب وشاعر ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ برصغیر اور یورپ میں بدلتے ہوئے حالات اور روس کے 1917ء کے انقلاب کے تناظر میں ان نوجوان طالب علموں کے ذہن بھی ایک ادبی انجمن کی تشکیل کا منصوبہ پیدا ہوا۔ ابتدأ میں یہ تمام ہندوستانی نوجوان طالب علم سجاد ظہیر کے رہائشی کمرہ میں جمع ہوا کرتے تھے اور آپسی تبادلہ خیالات اور بحث ومباحث نے ان ملاقاتوں کو ایک اسٹڈی سرکل کی صورت عطا کی اور پھر کچھ ہی دن بعد ان نوجوانوں نے ایک انجمن تشکیل دی جس کا ایک باقاعدہ مینی فیسٹو تیار کیا گیا۔ اس انجمن کا نام ''ہندوستان ترقی پسند ادیبوں کی انجمن یعنی Indian Progressive writer's Association تجویز کیا گیا۔ اس انجمن کا پہلا باقاعدہ جلسہ ڈنمارک اسٹریٹ کے نان کنگ ہوٹل لندن میں منعقد ہوا۔ ملک راج آنند اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔

انجمن کے قیام اور اُس کے مینوفیسٹو کی تیاری کے بعد اس کے باقاعدہ جلسہ پابندی سے منعقد کئے جانے لگے۔ ان جلسوں میں سنیتی کمار چٹرجی ماہر لسانیات نے مقالہ پڑھا۔ ایک بنگالی ادیب نے قاضی نذر الاسلام کی

انقلابی شاعری پر مضمون سنایا۔ ملک راج آنند نے اپنا افسانہ ''دی ٹرورسٹ'' اور سجاد ظہیر نے اپنا ڈرامہ ''بیمار'' پیش کیا تھا۔ (21)

انجمن ترقی پسند مصنّفین کا مینی فیسٹو ابھی ہندوستان روانہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی لندن میں موجود ہندوستانی طالب علموں نے اس انجمن کے زیر اہتمام کسی تحریک کا منصوبہ بنایا تھا لیکن دنیائے ادب نے ان نوجوان طالب علموں کی سعی و جستجو اور ان کی فکر و افکار کا نوٹ ضرور لیا تھا۔ یہ نوجوان انجمن کے قیام کے بعد ابھی کچھ کر گزرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ جولائی 1935ء میں پیرس میں کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانگریس بلائی گئی۔ پہلی بار دنیا کے چند نامور ادیبوں نے ادب کو تحریک بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پیرس میں یہ کانگریس World Congress of the Writers for the Defence of culture کے نام سے منعقد ہوئی تھی۔ لندن میں ہندوستانی طالب علموں کی جستجو اور کلچر کے نام پر منعقد ہونے والی اس کانگریس کا بیان کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''یہ تحریک ابھی چند انقلابی نوجوان طلبا کی پیداوار تھی لیکن جلد ہی ایک ایسی تحریک سے اسے مدد ملی جس کی بنیاد بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے رکھی۔ فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات نے ساری دنیا کے روشن خیال اور انسان دوست ادیبوں کو پیدا کردیا۔ جولائی 1935ء میں پیرس کے مقام پر کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانگریس بلائی گئی۔ اس کانگریس کو بلانے والوں میں ہنری باربس' میکسم گورکی' رومین رولاں' ٹامس مان' آندرے مارلو اور والڈ وفرینک جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب دنیا کے وہ سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہوگئے جو ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کانفرنس میں یہ طے کیا کہ ادیب و شاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے

تحفظ کے لیے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آنا چاہئے اور اپنے فن
کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کردینا چاہئے۔ " 22ے

ہندوستان ادیبوں کی نمائندگی ایک پارسی خاتون صوفیہ واڈیا نے انجام دی۔ علاوہ ازیں سید سجاد ظہیر اور ملک راج آنند بھی اس کانگریس میں شریک ہوئے۔ اس کانگریس کے اختتام پر ساری دنیا کے ادیبوں کے نام عموماً اور ترقی پسند ادیبوں کے نام خصوصاً ایک اپیل شائع کی گئی جس میں قلم کے رفیقوں کو موت کے خلاف زندگی کی رفاقت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اقتباس دیکھے:

"رفیقان قلم ! موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجیے۔
ہمارا قلم ' ہمارا فن' ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے
جو موت کو دعوت دیتی ہیں۔ جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں'
جو روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں' جو کارخانہ داروں اور
زیردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے
مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو
معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔" 23ے

کلچر کی بقا کے لیے طلب کردہ اس کانگریس میں رالف فاکس اور لوئی آراگوں جیسی عالمی ادبی شخصیتیں بھی شریک تھیں۔ سید سجاد ظہیر نے ان ادیبوں سے یہیں ملاقات کی۔ انھیں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے ہندوستان میں آغاز کی فکر تھی چنانچہ انہوں نے انجمن کے سلسلے میں فرانس کے ترقی پسند شاعر و دانشور لوئی آراگوں سے مشورہ کیا۔ اراگوں نے انجمن کی کارکردگی اور سربلندی کے لیے جو مشورے دیئے اُن کا اظہار خود سید سجاد ظہیر نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ اقتباس دیکھے:

"پہلی بات تو یہ کہ ہمیں ہمیشہ اپنی تحریک میں
مختلف مکتبِ خیال کے ترقی پسند مصنفوں کو شامل کرنے کی
کوشش کرنی چاہئے۔ مثلاً اشتراکی خیال کے مصنّفین کو دوسرے
محب وطن اور پرانے مصنّفین کا تعاون حاصل کرنا چاہئے۔
دوسرے یہ کہ ادیبوں اور مصنفوں کو منظم کرنا بہت مشکل کام
ہے اس لیے کہ مصنف اپنے کو ہر قسم کی تنظیم سے ماورا تصور

کرتے ہیں۔ آراگوں نے کہا کہ اس کام میں بہت صبر واستقلال اور وسیع المشربی سے کام نہ کیا جائے گا تو کامیابی مشکل ہے۔" 24ے

پیرس سے واپسی کے بعد سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کو تحریک میں تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور انجمن کا مینی فیسٹو تیار کیا جس پر انجمن کے صدر ملک راج آنند کے علاوہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اپنے دستخط کئے تھے۔

انجمن کو تحریک بنانے کے منصوبہ کے پیچھے ان ہندوستانی طلبا کے یہاں باضابطہ ایک نقطۂ نظر اور ایک نظریہ موجود تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس تحریک کی تنظیم کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو باشعور بنایا جائے اور مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے میں حرکت وعمل پیدا کی جائے۔ سجاد ظہیر "روشنائی" میں لکھتے ہیں:

"جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔ پہلی تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رُخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کی طرف ہونا چاہئے ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حس وحرکت جوش وعمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار ورجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت، پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہمارا اولین فرض ٹھہرا۔" 25ے

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے منشور میں اسی نظریہ ونقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ چند نکات کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ انجمن کا منشور یا مینی فیسٹو حسب ذیل ہے:

"ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جارہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہئیت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر وترقی کے راستے پر لگانے میں

ممدومعاون ہوں۔ ہندستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہوگیا ہے۔ ہئیت میں بھی اور معنی میں بھی۔ اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہوگئی ہے۔ جذبات کی نمائش عام ہے۔ عقل و فکر کو یکسر نظر انداز بلکہ رد کردیا گیا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں بیشتر اسی طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔ انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کرسکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی وتنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا، اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔ وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل وادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں۔

1. ہندستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ ان انجمنوں کے درمیان اجتماع اور پمفلیٹوں وغیرہ کے ذریعہ ربط و تعاون پیدا کرنا' صوبوں کی' مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

2. ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

3. ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹاسکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

4. ہندستانی کو قومی زبان اور انڈورومن رسم خط کو قومی رسم خط تسلیم کرنے کا پر چار کرنا۔

5. فکر ونظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

6. ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا' عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں۔'' 26؎

سید سجاد ظہیر لندن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی داغ بیل ڈالنے اور اُس کا منشور رمینی فیسٹو بنانے سے قبل اواخر دسمبر 1932ء میں ہندوستان آئے تھے اور اپنے اسی سفر کے موقع پر افسانوں کا مجوعہ ''انگارے'' شائع کیا تھا۔ 1933ء میں ''انگارے'' کی اشاعت پر جو ہنگامہ ہندوستان میں برپا ہوا' وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات بھی بخوبی موجود تھی کہ اُن کی اولین مرتبہ تخلیق پر حکومت نے پابندی لگادی تھی اور اس کے تمام مطبوعہ نسخوں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کو تحریک کی شکل دینے سے قبل وہ ہندوستان کی ادبی فضا آنکنا بھی چاہتے تھے اور اس ادبی فضا کو اپنے موافق بھی بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے لندن میں تیار کردہ انجمن کے مینی فیسٹو کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں ہندوستان میں اپنے ہم خیال دوستوں کو روانہ کیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''لندن کی انجمن نے اپنا جو مینی فیسٹو تیار کیا تھا اسے

سائیکلو اسٹائل کرکے سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں کی بھیجا تھا اور انہیں خط لکھ کر اس باب میں ان کی رائے دریافت کی تھی اور یہ بھی کہ یہ لوگ ملک کے دوسرے ادیبوں کو بھی یہ مینی فیسٹو دکھائیں اور اس کے متعلق ان کا عندیہ معلوم کریں۔'' 27ے

سید سجاد ظہیر نے مینی فیسٹو کی کاپیاں ڈاکٹر محمد اشرف (علی گڑھ)' ڈاکٹر محمود الظفر (امرتسر)' ڈاکٹر رشید جہاں (امرتسر)' پروفیسر ہیرن مکھر جی (کلکتہ)' ڈاکٹر یوسف حسین خاں (حیدرآباد)' پروفیسر ہستھی سنگھ (بمبئی) اور احمد علی (الہ آباد) کو روانہ کی تھیں۔

احمد علی' کے دو افسانے انگارے میں شامل تھے اور وہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر تھے۔ انہوں نے مینی فیسٹو پر لبیک کہا اور اس کی کاپیاں اپنے دوست احباب میں تقسیم کیں۔ غالباً احمد علی ہی نے منشی پریم چند کو مینی فیسٹو کی کاپی فراہم کی۔ پریم چند اپنی کہانیوں کے باوصف اردو ادب میں جدیدیت کے نقیب ٹھہرے تھے۔ انہوں نے مینی فیسٹو کو خوش آمدید ہی نہیں کیا بلکہ اسے اپنے ہندی رسالے ''ہنس'' میں شائع بھی کیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اس مینی فیسٹو کو ہندوستان میں سب سے پہلے پریم چند نے خوش آمدید کہا اور اسے اپنے رسالہ ''ہنس'' میں شائع کرکے ایک اداریہ لکھا جس میں ان مقاصد کی حمایت کی اور کہا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔' 28ے

منشی پریم چند' ہندوستانی ادبیات میں ایک معتبر نام تھا۔ اُن کا اپنے رسالے ''ہنس'' میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کا مینی فیسٹو شائع کرنا اور اداریہ میں مینی فیسٹو کی اہمیت وافادیت کا بیان کرنا' ارباب انجمن کے حوصلوں کو بلند کرنے کا باعث بنا۔ 1935ء دسمبر میں سید سجاد ظہیر اپنی تعلیم پورے کر کے ہندوستان لوٹے۔ اس وقت چونکہ اُن کے والد سروزیر حسن الہ آباد میں مقیم تھے' سجاد ظہیر سیدھے الہ آباد پہنچے۔ انہوں نے اپنے ہم خیال احباب سے ملاقاتیں کیں۔ چنانچہ احمد علی' فراق گورکھپوری' سید اعجاز حسین' شیودان پنتھ چوہان' نریندر شرما کے علاوہ الہ آباد

یونیورسٹی شعبہ اردو ایم۔اے کے دو طالب علم سید احتشام حسین اور وقار عظیم نے سجاد ظہیر کی آواز پر لبیک کیا۔ منشی پریم چند قبل ازیں ہی رسالے ہنس کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ الہ آباد میں سجاد ظہیر نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت امرناتھ جھا کے علاوہ مشہور مورخ تارا چند سے بھی تائید حاصل کی اور ان بزرگوں نے اُن کی ہمت افزائی بھی کی اور بھرپور مدد کا وعدہ بھی کیا۔ اس طرح ہندوستان آتے ہی سید سجاد ظہیر نے الہ آباد میں اپنے ہم خیال ادیبوں کا حلقہ بنالیا۔ اتفاق سے دسمبر 1935ء میں ہندوستان اکیڈیمی الہ آباد کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں منشی پریم چند کے علاوہ مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی نے شرکت کی۔ سجاد ظہیر نے اردو کے ان ادیبوں سے ملاقات کی۔ انھیں مینی فیسٹو دکھایا اور اپنے مقاصد واضح کئے۔ منشی پریم چند پہلے ہی اپنی پسندیدگی ظاہر کر چکے تھے انہوں نے مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی کے ہمراہ مینی فیسٹو کی تائید میں دستخط کئے۔ سجاد ظہیر کے حوصلوں کو مہمیز ملی اور انہوں نے سارے ہندوستان میں اپنے ہم خیال احباب سے ربط پیدا کیا اور ملک کے ہر شہر میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی شاخیں قائم کرنے کی اپیل وخواہش ظاہر کی۔ چنانچہ بہت جلد علی گڑھ میں سب سے پہلے انجمن کی شاخ قائم ہوئی اور خواجہ منظور حسین کے مکان پر پہلا جلسہ اوائل 1936ء میں منعقد ہوا۔ قاضی عبدالغفار اس وقت حیدرآباد میں تھے اور ''پیام'' شائع کر رہے تھے۔ انہوں نے وہاں تحریک منظّم کی۔ سبط حسن بھی اُن کے ساتھ تھے۔ پھر امرتسر، لاہور، پنجاب، بنگال اور بہار میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں اور جلسے منعقد ہونے لگے۔

اختر حسین رائے پوری نے جولائی 1935ء میں اپنا مضمون ''ادب اور زندگی'' رسالہ اردو میں شائع کیا تھا اور اس طرح انہوں نے ادب سماج اور زندگی کے تعلق خاطر کو مدلل انداز میں پیش کیا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے ہندوستان آنے کے بعد اُن کے کہنے پر بہار میں انجمن کی شاخ اختر حسین رائے پوری نے قائم کی تھی۔ اپریل 1936ء میں انھیں بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس میں اختر حسین رائے پوری نے ایک علیحدہ مینی فیسٹو پیش کیا جو دراصل انجمن ترقی پسند مصنّفین لندن کے مینی فیسٹو ہی کے اغراض ومقاصد پر مبنی تھا۔ اس مینی فیسٹو پر آچاریہ نریندر دیو، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی دستخط کئے۔ ہندوستان بھر میں ادیبوں کی یہ سرگرمیاں، یہ گہما گہمی ادب کو ایک نیا رُخ دینے، ادب کو زندگی سے مربوط کرنے کے

لیے تھیں جس کے نقیب سجاد ظہیر تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ان سرگرمیوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے تین چار مہینوں میں اس قدر مقبولیت حاصل کرلی کہ ملک میں ہر طرف سے اس رجحان کی تائید ہونے لگی۔ یہ ہندوستان کی پہلی ادبی تحریک تھی جس میں نہ صرف اردو کے ادیب شامل تھے بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی نظریاتی اتحاد کی بنا پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہورہے تھے۔ ملک کے بزرگ اور معمر ادیب نوجوانوں کی اس کوشش کو سراہ رہے تھے کہ ان کی بدولت ہمارا ادب قوم ومعاشرے کے مطالبات سے عہدہ بر آ ہونا چاہتا ہے اور ادب کے ذریعہ انسانیت' جمہوریت اور اخوت ومساوات کے صحت مند خیالات کی ترویج ہورہی ہے جو اس کا حقیقی منصب ہے۔'' 29

سید سجاد ظہیر نے لوئی آراگوں کی تجاویز کو تحریک کی تقویت کے لئے بھرپور انداز میں بروے کار لایا اور انہوں نے مختلف نقاط نظر کے ادیبوں کو ہی یکجا کرنے کی سعی نہیں کی بلکہ مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ سید سجاد ظہیر کی ان کوششوں کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

'' سجاد ظہیر (نے) مولوی عبدالحق ' جوش ملیح آبادی' ڈاکٹر تارا چند' رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔ سب نے ان کی تائید کی۔ ہمت بڑھائی۔ وہ اس تحریک کو صرف اردو تک محدود دیکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دوسری بڑی زبانوں میں بھی اسے فروغ دینے کی خواہش رکھتے تھے اس مقصد سے انھوں نے چند ماہ کے اندر ہندی' پنجابی' بنگالی اور گجراتی زبان کے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ بڑی سرگرمی ' مستعدی اور مجنونانہ لگن سے کام کررہے تھے۔''30

ڈاکٹر قمر رئیس نے یہاں بڑی پتے کی بات کہدی ہے۔ انجمن کی تشکیل اور کل ہند کانفرنس کے لئے ملک بھر کے تمام زبانوں کے ادیبوں کو کیا جوان اور کیا بوڑھے سجاد ظہیر کی ''مجنونانہ لگن'' ہی کی بنا پر تائید حاصل ہورہی

تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت پریم چند کریں لیکن پریم چند چاہتے تھے کہ کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر یا پھر پنڈت جواہر لال نہرو اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض نبھائیں۔ چنانچہ سید سجاد ظہیر کی درخواست پر پریم چند نے اپنے ایک خط میں اُنھیں یہی مشورہ دیا۔ اقتباس دیکھئے۔

''صدارت کی بات' میں اس کا اہل نہیں۔ عجز سے نہیں کہتا' اپنے میں کمزوری پاتا ہوں۔ مسٹر کنھیا لال منشی مجھ سے بہت بہتر ہوں گے یا ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پنڈت جواہر لال نہرو تو بہت مصروف ہوں گے ورنہ وہ نہایت موزوں ہوں گے۔ اس موقع پر سبھی سیاسیات کے نشے میں ہوں گے اور ادبیات سے شائد ہی کسی کو دلچسپی ہو لیکن ہمیں کچھ تو کرنا چاہئیے۔ اگر مسٹر جواہر لال نہرو نے دلچسپی کا اظہار کیا تو جلسہ کامیاب ہوگا۔ اور کیا لکھوں' تم ذرا پنڈت امرناتھ جھا کو تو آزماؤ۔ انھیں اردو ادب سے دلچسپی ہے اور وہ شاید صدارت منظور کرلیں۔'' 31

پریم چند کے اس عذر کو سید سجاد ظہیر اور اُن کے ساتھیوں نے قبول نہیں کیا اور پریم چند کو صدارت کرنے کے لیے اصرار کیا مسلسل اصرار پر انہوں نے حامی بھری اور خطبہ صدارت لکھنے کی تجویز بھی قبول کر لی۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کے انعقاد کے لئے لکھنؤ کا انتخاب کیا گیا تھا اور 9 و 10 اپریل 1936ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ کانفرنس لکھنؤ کے تاریخی رفاہِ عام ہال میں منعقد ہوئی۔ پریم چند نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔ چودھری محمد علی ردولوی کو صدر استقبالیہ کمیٹی منتخب کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں جو اہم اور نامور ادیب و شعرا نے شرکت کی تھی اُس کا بیان کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''اس کانفرنس میں پریم چند کے علاوہ مولانا حسرت موہانی' جے پرکاش نرائن' کملا دیوی چٹو پادھیائے' میاں افتخار الدین' یوسف مہر علی' اندو لال یا جنک اور جتیندر کمار وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ بنگال' گجرات' مہاراشٹر اور مدراس کے ادیب شریک ہوئے اور اپنی زبان کے ادبی مسائل پر تقریریں کیں۔ اس کانفرنس کی دو چیزیں اردو ادب کی تاریخ

میں یادگار رہیں گی' ایک تو وہ ''اعلان نامہ'' یا ''مینی فیسٹو''
جو ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنی پہلی کانفرنس میں
پیش کیا۔ دوسرے پریم چند کا معرکتہ آلارا خطبہ صدارت۔'' 32

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کی دو چیزوں کو خلیل الرحمٰن اعظمی نے ادب کی تاریخ کی یادگار اور معرکتہ الآرا قرار دیا ہے۔ ایک کانفرنس کا مینی فیسٹو اور دوسرے پریم چند کا صدارتی خطبہ۔ ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند کے خطبہ کو'' ترقی پسند نظریہ ادب کی وضاحت'' کے لئے کانفرنس کے مینی فیسٹو سے بھی زیادہ ''جامع اور موثر'' (33) سمجھتے ہیں اور ڈاکٹر سیما صغیر پریم چند کے خطبہ صدارت کو ''اس تحریک کو سب سے زیادہ تقویت'' (34) عطا کرنے والا بتاتی ہیں۔

لکھنؤ میں منعقدہ پہلی انجمن ترقی پسند مصنّفین کانفرنس میں جو اعلان نامہ یا مینی فیسٹو منظور و شائع کیا گیا اُس میں ادیبوں کی ذمہ داری پر اس طرح روشنی ڈالی گئی تھی:

''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی
زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔ اور
ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند
تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے
اندازِ تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان' مذہب' جنس' جنگ
اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے
خیالات کی روک تھام کی جاسکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے
ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی'
نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔'' 35

پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض وغایت بیان کی اور ادیبوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ انھوں نے خطبے کا آغاز اس طرح کیا کہ:

'' حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک
یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام
طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔

یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشاء خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرلے اس میں خیالات وجذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کرکے قوم پر جو احسان کیا ہے، اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے، منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کرلی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ وبہار اور بے تال پچیسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی، اب اس قابل ہوئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔ اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔'' 36؎

پریم چند نے بدلتے ہوئے حالات اور عصری حسیت کے تناظر میں ادب کی تعریف اس طرح پیش کی ہے:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہئیے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخلیقات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانۂ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتستی کی۔ ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبۂ حیرت کی تسکین .... مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہورہا ہے۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل

پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لئے حیرت انگریز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔'' 37

صدر جلسہ نے ادیبوں اور فنکاروں کے لئے حسن و جمال کی بدلتی ہوئی معنویت پر روشنی ڈالی اور اس انداز سے مشورہ دیا :

''سوال یہ ہے کہ حسن کیا شے ہے؟ بظاہر یہ ایک مہمل سا سوال معلوم ہوتا ہے کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع وغروب دیکھا ہے۔ شفق کی سرخی دیکھی ہے۔ خوشنما اور خوشبودار پھول دیکھے ہیں۔ خوش نوا چڑیاں دیکھی ہیں۔ نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں۔ ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ ان نظاروں میں ہماری روح کیوں کھل اٹھتی ہے؟ اس لئے کہ ان میں رنگ یا آواز کی ہم آہنگی ہے سنگیت دلکشی کا باعث ہے۔ ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹس کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔'' 38

اس حوالے سے انہوں نے مزید کہا کہ:

''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں' حسرتوں اور تمناؤں' چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔

انہیں وہ انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی وہ ان کا ذکر بھی کرتا تھا تو مضحکہ اڑانے کے لئے۔ اس کی دہقانی وضع اور معاشرت پر چلنے کے لئے اس کا شین قاف درست نہ ہونا یا محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا۔ وہ بھی انسان ہے' اس میں بھی آرزوئیں ہیں' یہ آرٹسٹ کے ذہن سے بعید تھا۔ .... اس کی نگاہ ابھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کش مکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فاقہ اور عریانی میں بھی حسن کا وجود ہوسکتا ہے' اسے وہ شائد تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن حسین عورت میں ہے' غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی مینڈ پر سلائے پسینہ بہارہی ہے۔'' 39

اور پریم چند نے اپنے خطبے کا اختتام اپنے اس پیغام پر کیا:

''جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا' محض لوریاں گاگا سلانا' محض آنسو بہاکر غم غلط کرنا تھا اس وقت تک ادیب کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' 40

اس کانفرنس کو مختلف مدعوین نے بھی مخاطب کیا تھا۔ کانفرنس کے اعلان نامے یا مینی فیسٹو اور منشی پریم چند کے خطبہ صدارت کے علاوہ اس کانفرنس کو ترقی پسندی کی شہ راہ پر کامیابی سے گامزن کرنے میں کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی کی پرجوش تقریر نے بھی اہم رول ادا کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے ادب کو آزادی کی تحریک کے ترجمان کے طور پر ابھارا۔ اقتباس دیکھئے۔

''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہئے۔ اسے سامراجیوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنا چاہئے۔ اسے مزدوروں اور کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنا چاہئے۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا چاہئے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد و منظم ہوکر اپنی جدوجہد کو کامیاب بناسکیں۔'' 41

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کے دوران متفقہ طور پر سید سجاد ظہیر کو انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کانفرنس کی کامیابی، نومنتخب جنرل سکریٹری سجاد ظہیر کی ذمہ داریوں اور ملک کے مختلف شہروں میں قائم ہونے والی انجمن کی شاخوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کانفرنس عام توقعات سے زیادہ کامیاب رہی اس میں پریم چند نے جو خطبہ پڑھا وہ ترقی پسند نظریہ ادب کی وضاحت کے سلسلے میں ان کے منشور سے بھی زیادہ جامع اور مؤثر ثابت ہوا۔ بعد میں سجاد ظہیر نے اس کاانگریزی ترجمہ اور کانفرنس کی روداد کتابی شکل میں Towards Progressive Literature کے نام سے شائع کی۔ کانفرنس میں سجاد ظہیر کو ہی اس کا جنرل سکریٹری چنا گیا تھا۔ اس لیے اس کی قرار دادوں اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام مختلف شہروں میں انجمن کی شاخوں کا قیام تھا۔ ملک میں ادیبوں کی یہ پہلی انجمن تھی جس کی تنظیم ادب کے بارے میں کچھ واضح اور مشترک مقاصد کے تحت عمل میں آرہی تھی۔ سجاد ظہیر نے مسلسل تگ ودو کے بعد چند ماہ کے عرصے میں الہ آباد، بنارس، لکھنؤ، کانپور، علی گڑھ، پٹنہ، لاہور، دہلی اور امرتسر میں اس کی شاخیں قائم کرلیں۔ نوجوان ادیبوں کے ساتھ پریم چند جیسے بزرگ ادیب بھی جو اس زمانے میں سخت علیل تھے، بڑی

مستعدی اور جوش سے تنظیمی کاموں میں سجاد ظہیر کا ہاتھ
بٹارہے تھے۔'' 42

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے فرمائی، کانفرنس کے صدر منتخب ہونے کی بنا پر وہ بڑی تندہی سے کانفرنس کی کامیابی کے لئے برسرکار رہے۔ انہوں نے کانفرنس سے چار ماہ قبل ہی لندن سے روانہ کردہ مینی فیسٹو کو اپنے رسالے ہنس میں شائع کیا تھا۔ اپریل 1936ء میں منعقدہ اس کانفرنس کی روداد منشی پریم چند نے مئی 1936ء کے ہنس میں شائع کی۔ انہوں نے بنارس میں انجمن کی شاخ قائم کی اور کوشش کی کہ ہندی کے زیادہ سے زیادہ ادیب کانفرنس کی طرف مائل ہوں چنانچہ 10 مئی 1936ء کو سید سجاد ظہیر کے نام خط میں انہوں نے اپنی ان کوششوں اور کاوشوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

''میں نے یہاں ایک برانچ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم اس کے متعلق جتنا لٹریچر ہو وہ بھیج دو تو میں یہاں کے لیکھکوں کو ایک دن جمع کرکے بات چیت کروں۔ بنارس قدامت پرستی کا اڈا ہے اور ہمیں شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑے گا لیکن دو چار بھلے آدمی تو مل ہی جائیں گے۔ جو ہمارے ساتھ اشتراک کرسکیں۔ اگر میری اسپیچ کی ایک اردو کاپی بھیج دو اور اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوگیا ہو تو اس کی چند کاپیاں اور مینی فیسٹو کی چند کاپیاں اور ممبری کے فارم کی چند پرتیں اور لکھنؤ کانفرنس کی کاروائی کی رپورٹ وغیرہ تو مجھے یقین ہے کہ یہاں شاخ کھل جائیگی۔ پھر میں پٹنہ جاؤں گا اور وہاں بھی ایک شاخ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ آج بابو سمپورنانند سے اس کے متعلق کچھ باتیں ہوئیں۔ بابو جے پرکاش نرائن صاحب سے بھی باتیں ہوئیں۔'' 43

ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس انتہائی کامیاب ہوئی اس کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ کانفرنس کے فوری بعد ہندوستان کے سارے شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں۔ پریم چند نے الہٰ آباد اور پٹنہ میں شاخ قائم کی جبکہ اختر حسین رائے پوری نے دہلی میں۔ کانپور میں بھی شاخ قائم ہوئی اور مولانا حسرت موہانی کو

اس کی صدر منتخب کیا گیا۔ اسی طرح لکھنؤ اور حیدرآباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی شاخیں قائم ہوئیں۔ 1937ء میں الہ آباد کے علاوہ جلیانوالا باغ (امرتسر) تحریک کی آواز عوام تک پہنچانے کی غرض سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کے مہتمم فیض احمد فیض تھے۔ اسی طرح کلکتہ، سلہٹ، گوہاٹی، ناگپور، پونا، احمد آباد، میسور، مالا بار اور بیجواڑہ میں بھی شاخیں قائم ہوئیں۔

الہ آباد میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں اردو اور ہندی کے بیشتر ادیب نے شرکت کی تھی چنانچہ ہندی ادیبوں میں نریندر شرما، رمیش چندر سنہا، آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریس ترپاٹھی نے شرکت کی اور ترقی پسند سیاسی رہنماؤں میں جے پرکاش نرائن، شیودان سنگھ چوہان، نریندر شرما، رمیش چندر سنہا قابل ذکر ہیں۔ کانفرنس کی صدارت کے لئے ایک مجلس تشکیل دی گئی تھی جس میں نریندر دیو، پنڈت رام نریس ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق شامل تھے۔ مولوی عبدالحق نے کسی وجہ سے کانفرنس میں شرکت نہیں کی لیکن انہوں نے اپنا خطبہ صدارت بھیج دیا جسے کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں اور باتوں کے علاوہ نوجوان ادیبوں کو مشورہ دیا کہ ادب میں ''ادبیت'' کو برقرار رکھیں۔ اقتباس دیکھئے:

> '' ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی حاصل ہونی چاہئیے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ ''بھونڈے پن'' کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ ترقی پسند مصنّفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔ ان کے خیالات کیسے ہی بلند پایہ اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔'' 44

مولوی عبدالحق نے ادب میں، ادبی اقدار کی برقراری پر زور دیا اور فن کو سنوارنے کی بات کی۔ 1936ء کے بعد یوں تو ہندوستان کے مختلف شہروں میں کانفرنسیں ہوئیں لیکن 1938ء میں الہ آباد میں منعقد ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس اس لحاظ سے اہم واقع ہوئی کہ اس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے مخاطب کیا اور

رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا پیام بھیجا۔ جواہر لال نہرو اپنی تقریر میں بے تکلفانہ طرز تخاطب اپنایا اور ترقی پسند ادب کی وضاحت کی۔ اور ادب و سیاست کے موضوع پر بھی روشنی ڈالی۔ اقتباس دیکھئے:

"ترقی پسند ادب کیا ہے؟ ادیب کن لوگوں کے لیے لکھتا ہے اور کیوں لکھتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ہر شخص دے سکتا ہے اور دیے گئے ہیں۔ ان کو بار بار دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سوالوں کو سن کر میرا جی چاہتا ہے کہ پوچھوں آپ کیوں زندہ ہیں؟ کیا مقصد ہے زندگی گا؟..........موجودہ دنیا کو اس خیالی دنیا تک لے جانے کی اور لوگ بھی کوشش کرتے ہیں مثلاً سیاسی حضرات ہیں۔ لیکن سیاسی حضرات اور اسی قسم کی کوشش کرنے والے دوسرے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ بڑی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتے۔ ایک آرٹسٹ ایسی چھوٹی باتوں سے الگ رہتا ہے۔ اس کی زندگی اور ماحول سیاسی لوگوں کی زندگی اور ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ بڑی بڑی باتوں کو روز مرہ کی چھوٹی باتوں کے چنگل سے الگ کرکے سماج کو دکھا سکتا ہے۔"

"ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے۔ اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پل بناتا ہے جس پر ہوکر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔"45

رابندر ناتھ ٹیگور نے سماج کے تئیں ادیب کی ذمہ داری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتہ دینے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اُن سب کے غم گسار اور ہمدم ہوجائیں۔ انسان کی روح کو صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں ادب اور

انسانیت ' جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہوجائیں گے تو رہنمایانِ خلق کو مستقبل کی راہ ملے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا طور کیا ہے اور عوام کے جذبات کا علم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض رہ جائیں گے۔" 46

اسی زمانے میں دہلی اور ہری پورہ میں بھی ترقی پسند مصنفین کے جلسے منعقد ہوئے۔ ہری پورہ کے جلسے کی صدارت سروجنی نائیڈو نے انجام دی۔ اسی زمانے میں ترقی پسند ادیبوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سے فاشزم کی مخالفت میں بیان حاصل کیا اور اسے اخبارات میں شائع کیا۔ دہلی' الہ آباد' کلکتہ اور ہری پورہ میں منعقد ہونے والی یہ کانفرنسیں علاقائی حیثیت کی حامل تھیں لیکن مرکزی انجمن سے ان تنظیموں کا برابر ربط ضبط برقرار تھا۔ دسمبر 1938ء کے آخری ہفتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس چونکہ بنگال کے صدر مقام پر منعقد ہوئی تھی اس لئے افتتاح کے لیے رابندر ناتھ ٹیگور کو زحمت دی گئی تھی لیکن وہ اپنی علالت کی وجہ سے نہ آ سکے۔ قبل ازیں مارچ 1938ء میں الہ آباد میں منعقد کانفرنس اور دہلی کی کانفرنس میں ٹیگور کے پیامات سنائے گئے تھے۔ الہ آباد کانفرنس میں رابندر ناتھ ٹیگور کو مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی بیماری کی وجہ سے شرکت سے قاصر تھے۔ اس بار بھی ٹیگور نے شرکت نہیں کی اور اپنا خطبہ روانہ کردیا جسے پڑھ کر سنایا گیا۔ کانفرنس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی اس دوسری کل ہند کانفرنس میں بنگالی زبان کے متعدد ادیب وشعراء نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم کو جنہوں نے' اردو' ہندی' ہندوستانی پر مقالہ پیش کیا' کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

ترقی پسند تحریک' کل ہند سطح پر مقبول ہی نہ ہوئی تھی بلکہ وقت کی اہم ضرورت کے طور پر ابھری تھی جس کو رابندر ناتھ ٹیگور' علامہ اقبال' پریم چند' مولوی عبدالحق' جواہر لال نہرو' سروجنی نائیڈو' آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن جیسے ادیبوں اور دانشوروں کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ ان دانشوروں کے خطبات وتقاریر سے ادیبوں اور عوام میں نیا شعور اور نیا احساس پیدا ہوا تھا۔ سید سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کی مقبولیت اور قومی افق پر اس کے اثرات کا

گزشتہ دو برس یعنی 1936ء تا 1937ء میں کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' 1936ء ' 1937ء ' 1938ء کے درمیان ہماری تحریک کا سب سے زیادہ فروغ اردو' ہندی اور بنگالی کے نوجوان ادیبوں میں ہوا۔ اردو اور ہندی کا علاقہ چونکہ مشترک تھا' اس لئے اس علاقے میں انجمن کی جو شاخیں بنیں ان میں اردو اور ہندی کے ادیب دونوں شامل تھے لیکن عام طور پر اردو والوں میں تحریک کا اثر زیادہ تھا اور ہندی والوں کے مقابلے میں وہ انجمن میں زیادہ تھے۔ اس کے باوجود ہمارے لئے بڑے فخر اور خوشی کی بات تھی کہ ٹھیک ایسے زمانے میں جب اردو اور ہندی کا جھگڑا بڑی سنگین شکل اختیار کرگیا تھا اور فرقہ وارانہ سیاست کی زہریلی فضا سے ادب کی محفل بھی مسموم ہورہی تھی' ترقی پسند مصنفین کی انجمن' اس کی کانفرنسیں اور اس کے جلسے' وہ واحد مقامات تھے جہاں دونوں زبانوں کے ادیب ایک ساتھ جمع ہوکر' ایک دوسرے کی لکھی ہوئی چیزیں سنتے تھے اور ان پر بحثیں کرتے تھے۔'' 47

ملک میں جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی' سیاست میں تصادم کے آثار نمایاں تھے' فرقہ وارانہ فضا بھی اپنا مسموم اثر دکھا رہی تھی لیکن پھر بھی جذبۂ انسان دوستی' ملک کی بیشتر زبانوں کے ادیبوں اور شعراء کو ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کئے ہوئے تھا۔ انسان دوستی' عوام دوستی' اور حقیقت پسندی ان ادیبوں کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین اپنی عملی کارگزاری سے اپنے مقاصد اور منشور کو بڑی حد تک پورا کر رہی تھی۔ اب ضرورت تھی کہ انجمن کی کارکردگی ہر کس و ناکس تک پہنچایا جائے۔ اس تناظر میں انجمن کے ترجمان رسالے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی چنانچہ 1939ء میں ''نیا ادب'' کے نام سے رسالہ جاری کیا گیا جس کے پہلے شمارے میں پریم چند کے خطبہ کے اقتباسات کے ساتھ ساتھ ملک راج آنند' ڈاکٹر تاثیر' علی احمد جعفری اور احتشام حسین کی تخلیقات شائع کی گئیں تھیں لیکن بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ''اس شمارے کی سب سے اہم چیز اس کا اداریہ

تھا۔''(48)''نیا ادب'' کے پہلے شمارے کے اداریہ میں ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی اس طرح وضاحت کی گئی تھی:

''یہ کہنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادب ہر پرانی چیز کے خلاف نفرت و احتجاج کا نام ہے۔ ترقی پسند ادب ہر چیز کو اس کے ماحول اور تاریخی پس منظر میں دیکھتا ہے اور ادبی کارناموں کی سچی کسوٹی یہی ہے۔ ترقی پسند ادب قدیم ادب سے ناتا نہیں توڑتا' وہ پرانے ادب کی بہترین روایات کا حامل ہوتا ہے اور انہیں روایتوں کی بنیاد پر نئی عمارتیں کھڑی کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب ہی دراصل قدیم ادب کا سب سے معتبر امین اور وارث ہے...... ہمارے نزدیک ترقی پسند وہ ادب ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے' ان کا پرتو ہو' ان کی چھان بین کرتا ہو اور ایک نئی اور بہتر زندگی کا راہبر ہو لیکن وہ صرف زندگی کی ہلچل اور ہیجان کا ہی نقیب اور نبض شناس نہیں ہوتا۔ وہ صرف سطح پر کروٹیں لینے والی موجوں ہی کے ساتھ نہیں بہتابلکہ زندگی کی گہرائیوں میں جاکر ان خاموش اور میٹھے دھاروں سے سیراب ہوتا ہے جو سطح سے نیچے بہتے رہتے ہیں۔'' 49

''نیا ادب'' کا تیسرا شمارہ جون 1939ء میں شائع ہوا۔ یہ شمارہ اپنی مشمولات کی وجہ سے خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔اسی رسالے میں پریم چند کا افسانہ ''کفن'' شائع کیا گیااور ہندی کے مشہور افسانہ نگار جگل کشور شکلا کا پہلا اردو افسانہ ''ایک دن'' بھی شائع کیا گیا۔مضامین میں اختر حسین رائے پوری' کا ''ادب اور زندگی''فیض احمد فیض کا ''انیسویں صدی میں اردو ادب کا سماجی پس منظر'' سید حسن کا ''فلسفہ شاہین'' ڈاکٹر عبدالسلیم کا ''ہماری قومی زبان'' سجاد ظہیر کا ''اردو کی انقلابی شاعری'' سید مطلبی فریدآبادی کا ''شمالی ہند کے دیہاتی شعرا میں انقلابی رجحانات'' اور سردار جعفری کا ''ترقی پسند مصنفین کی تحریک'' شامل تھے۔ان تمام تحریروں کے علاوہ شعری حصہ کی تخلیقات نے اس شمارے کو خصوصیت نوعیت عطا کردی ہے۔''نیا ادب'' کی ایک انفرادیت یہ بھی تھی کہ اس کے ہر شمارے میں ترقی

پسند مصنفین کی شائع ہونے والی تصانیف پر اداریے میں روشنی ڈالی جاتی تھی۔

جوش ملیح آبادی ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک کے موید و محرک تھے۔ انہوں نے سروجنی نائیڈو کے تعاون سے جنوری 1936ء میں دہلی سے اپنا رسالہ ''کلیم'' جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ ابتدأ ہی سے ترقی پسند خیالات کی تشہیر کے لئے معروف تھا۔ مئی 1939ء میں جوش نے کلیم کی ادارت شہاب ملیح آبادی کو سونپی۔ شہاب کلیم کو ملیح آباد لے آئے اور جون جولائی 1939ء کا شمارہ ملیح آباد سے شائع کیا۔ اگست میں ''کلیم اور نیا ادب'' کو ضم کر دیا گیا اور اگست ستمبر کا مشترکہ شمارہ ''نیا ادب اور کلیم'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس شمارہ کا اداریہ ''عہد نو کا آغاز'' کے عنوان سے جوش ملیح آبادی نے لکھا تھا۔

''نیا ادب'' اور بعد ازاں ''نیا ادب اور کلیم'' کی اشاعت کے تناظر یہ بات بھی پوشیدہ تھی کہ لاہور سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے نظریات کی مخالفت میں آواز بلند ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے فرد کے جذبات اور احساسات کو اگر چہ نظر انداز نہیں کیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے نزدیک اظہار ذات' انفرادی جذبات واحساسات کی ترجمانی' انسانی نفسیات کی تحلیل اور وارداتِ قلبی کے انکشاف پر کم بلکہ بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے فنکار جو ادب میں زندگی کے ساتھ ساتھ ادیب کی ذات اور اُس کے احساسات' جذبات اور اُن کی تحلیل نفسی کو بھی ضروری سمجھتے تھے ترقی پسند تحریک سے اختلاف کرتے ہوئے 1938ء کے اوائل میں لاہور میں ''بزم افسانہ گویاں'' قائم کی جو کہ 1939ء میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کے نام سے موسوم کی جانے لگی۔ انجمن ترقی پسند تحریک کے اس مخالف گروہ کا تذکرہ کرتے ہوئے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

> '' اسی زمانے میں (انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے وقت) ایک اور گروہ نے سر اٹھایا۔ یہ ہئیت پرست' ایہام پرست اور جنس پرست ادیب تھے جن کے مشہور نمائندے میراجی' یوسف ظفر' ممتاز مفتی' مختار صدیقی وغیرہ تھے۔ یہ ذہین اور ہوشیار لکھنے والے تھے جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے۔'' 50

علی سردار جعفری نے یہاں حقیقت حال کا بیان نہیں کیا ہے بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ حریفانہ چشمک نے اُن کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے اس لئے کہ جس زمانے میں حلقۂ ارباب ذوق نے جنم لیا اور یورپ کی ترقی پسندی سے اثر قبول کیا اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اور جن نوجوانوں نے اس انجمن کی تشکیل کا منصوبہ بنایا وہ بھی یورپ ہی کے ادب سے متاثر تھے۔ حلقہ ارباب ذوق نے ''یورپ کے انحطاطی ادب'' کا اثر قبول کیا تھا یا نہیں یہ بحث یہاں مناسب نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق نے ادب کے فنی اُصولوں کو ترجیح دی تھی اُن کا خیال تھا:

> ''ادب کی اولین خصوصیت یہی ہے کہ وہ اول اور آخر ادب ہو۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی بعد کی باتیں ہیں۔ جو چیز معیار پر پوری نہیں اترتی حلقہ کے نزدیک درخورا عتنا نہیں۔ ''51

''حلقہ ارباب ذوق'' کے سرگرم کارکن میراجی تھے، انہوں نے ترقی پسند تحریک کے تناظر میں اپنے نقطہ نظر کا بیان متعدد مضامین و مقالات میں کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> '' اگر دو ایک لمحوں کے لیے فن برائے حیات کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہو ہی نہیں سکتا۔'' 52

''حلقہ اربابِ ذوق'' سے تعلق رکھنے والے ادیب ادب میں زندگی کے ساتھ ساتھ فنی قدروں کے پاس ولحاظ کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ روایت کی پاسداری کو بھی اہم گردانتے تھے اور ادیب کی ذات کو بھی نظر انداز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ترقی پسند مصنفین اور حلقہ اربابِ ذوق کے نظریوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حلقہ اربابِ ذوق کی ادبی اقدار کو معاشرہ کے سردوگرم سے اُس نوعیت کا تعلق نہیں تھا جو ''ادب برائے زندگی'' کے کٹر حامیوں کا تصور ہے۔ حلقہ کے ارکان نے جارجیت اور بیرون کی بجائے داخلیت اور درون پر ''زیادہ'' زور دیا .... ایسے فنکار جنھوں نے ترقی پسند تحریک کا اثر قبول کیا۔

کمیونسٹ فکر کی مطابقت میں فرد کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے (ہندوستان میں ترقی پسند فنکار فرد کی اہمیت کو قطعی طور پر نظر انداز نہ کرسکے) معاشرہ کی کلیدی حیثیت اور فرد پر معاشرہ کی گرفت کو تسلیم کیا لیکن اس دور کے ایسے فنکار جنھوں نے ترقی پسند تحریک کو درخورِ اعتنا متصور نہیں کیا دیگر اسباب ومحرکات سے متاثر ہوتے رہے۔ حلقہ اربابِ ذوق کا شمار بھی ایک ایسے ہی گروہ میں ہوتا ہے۔ میرا جی ' مختار صدیق ' قیوم نظر اور ممتاز مفتی وغیرہ کی تخلیقات کا مطالعہ کیجیے۔ یہ بات بیک نظر واضح ہوتی ہے کہ کمیونزم اور ترقی پسند تحریک کی وجہ سے فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقہ اربابِ ذوق نے معاشرہ کے مقابلہ میں فرد اور ذات کو اہمیت دی۔'' 53

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے ترقی پسند ادبی تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے فکری نقطۂ نظر اور ادبی اقدار پر اظہار خیال کیا ہے اور دونوں تنظیموں کے بنیادی اختلاف پر روشنی ڈالی ہے۔ بہر حال حلقہ اربابِ ذوق نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے ہی میں تحریک کے ادبی اور اقدار پر تادیب کی تھی لیکن اربابِ مجاز تحریک نے حلقہ اربابِ ذوق کے نقطۂ نظر کا صحیح تناظر میں نوٹس نہیں لیا اور 1945ء تک تحریک اسی روش پر چلتی رہی جس پر اُس کی ابتدا ہوئی تھی۔

1939ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ساری دنیا میں فاشزم کے خلاف نفرت کا اظہار کیا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک کی جانب سے فاشزم کی مذمت میں ٹیگور کا بیان جاری کیا گیا۔ 1942ء میں جبکہ عالمی جنگ اپنے عروج پر تھی ہندوستان کے مختلف نقاطِ نظر رکھنے والے ادیبوں نے ایک ہی سانس میں جنگ اور فاشزم سے نفرت کا مظاہرہ کیا۔ ایسے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی کے ہارڈنگ لائبریری کے مرکزی ہال میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر عبدالعلیم نے نبھائی۔ اس کانفرنس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ساتھ دوش بہ دوش حلقہ اربابِ ذوق کے ادیب وشعرا

نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ کانفرنس کے آخر میں قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ ''وہ اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں اور فاشزم کے خلاف ہیں'' (54) ''ترقی پسند تحریک کی کانفرنس میں جہاں یہ قرارداد پیش کی گئی وہیں ایک اور بھی قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا:

> ''ہم برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ ان نازک حالات میں ہمارے وطن کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں۔'' 55

انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس کے اختتام پر جو قراردادیں منظور کی گئیں اُن کی حمایت میں جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی نے مشترکہ بیانات جاری کئے۔ مجازؔ نے بھی آہنگ نو کے عنوان سے نظم لکھی اور جنگ کے خلاف بیان جاری کیا اور لکھا:

> ''آج ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے اہل وطن کے دل میں اُمید کی روشنی پیدا کریں۔ ان کی تھکی ہوئی نبضوں میں ہمت کا خون دوڑادیں۔ ہم ترقی پسند اب تک اپنے آرٹ سے تلوار کا کام لیتے رہے ہیں۔ ہم نے ہر قسم کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسانیت اور تمدن کے سب سے بڑے دشمن فاشزم کے مقابلے میں ہم اپنی تلوار میان میں رکھ لیں۔
>
> ہمارے نغموں کو آج دوبارہ وطن کی فضاؤں میں گونجنا چاہئے تاکہ اتحاد' خود اعتمادی ' سرفروشی اور حسرت کے جذبات سے معمور ہوکر ہم اپنے راستے سے ہر اس رکاوٹ کو ہٹادیں جو اندھے سامراجی ہماری راہ میں حائل کرتے ہیں اور تمام دنیا کے عوام کے ساتھ مل کر اس جنگِ آزادی میں اس طرح شریک ہوں جو ہماری عظیم المرتبت قوم کے شایانِ شان ہے۔'' 56

انجمن ترقی پسند مصنفین کی مخالفت سرکاری مشنری کیا کرتی تھی لیکن اس کانفرنس میں جب فاشزم کے خلاف اور اتحادیوں کی تائید میں قراردادیں منظور کی گئیں تو مرکزی سرکار کے رویہ میں بھی تبدیلی آئی۔ اُدھر

1938ء ہی میں حلقہ اربابِ ذوق، ترقی پسند تحریک کی مخالفت پر کمر بستہ تھی۔ جعفر علی خاں اثر نے 1940ء میں ''نیا ادب کدھر جا رہا ہے'' کے عنوان میں مضمون لکھا اور اُسے ''نیا ادب'' ہی میں شائع کروایا۔ سید سجاد ظہیر نے اس مضمون کا جواب فرضی نام سراج مبین کی حیثیت سے لکھا۔ اثر لکھنوی نے چند اور مضامین دوسرے رسالوں میں بھی شائع کئے جن کے جواب فیض احمد فیض نے ترقی پسندی کے اُصولوں کے تناظر میں دیا۔ لیکن تحریک کی شدید مخالفت، رشید احمد صدیقی نے کی اور شدت سے کی۔ رشید احمد صدیقی کے مضامین کا جواب سید احتشام حسین نے اور پھر علی جواد زیدی نے لکھے۔ اسی اثنا میں فرحت کاکوروی نے لکھنؤ سے ''مداوا'' شائع کیا۔ ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں لکھے جانے والے ان مضامین کا مفصل اور مدلل جواب اس وقت کے صدر انجمن ڈاکٹر عبدالعلیم نے ''ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' کے عنوان سے تین قسطوں میں رسالہ ''منزل'' لکھنؤ میں شائع کیا جس میں مخالفین تحریک کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا۔(57)

ڈاکٹر عبدالعلیم نے 1944ء کے شروع میں ترقی پسند تحریک کے مخالفین کے جوابات رسالہ ''منزل'' میں شائع کروائے تھے۔ اسی زمانہ میں ''کل ہند اردو کانگریس'' کی کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی جس میں سید سجاد ظہیر کو بطور مقالہ نگار مدعو کیا گیا اور ''ترقی پسند تحریک'' موضوع قرار دیا گیا۔ سید سجاد ظہیر نے حالات کی مناسبت سے مقالہ لکھا، ترقی پسند تحریک کے مقاصد اور منشور کی وضاحت کی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے مخالفین کی نادانی کو بھی واضح کیا۔ چنانچہ اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

> '' ایک بڑی اور عجیب بات یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کے مخالفین پر نئے ادیب کو اور اگر وہ خراب ادیب ہے تو اور زیادہ اصرار کرکے ترقی پسند کا نام دے کر پوری تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً میراجی کا کلام لے کر اس کا خوب مذاق اڑایا جاتا ہے اور تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ اگر یہی ترقی پسندی ہے تو اس سے ہمیں خدا کی پناہ ہے۔ آخر اس طرح کی باتیں کیوں کہی جاتی ہیں۔؟
>
> آزاد نظم اور معریٰ نظم کا سوال دراصل ترقی پسندی

کے موضوع سے باہر ہے لیکن جو حضرات اس طرز شاعری کو ناپسند کرتے ہیں انھیں بھی یہ کہہ کر مشتعل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ترقی پسند ی یہی ہے۔ واقعہ کیا ہے؟ اکثر ترقی پسند شعرأ بحروقافیہ کے پابند ہوکر شعر کہتے ہیں۔ چند ان میں سے ایسے ہیں جنھوں نے بعض نظمیں بحر میں کہتے ہوئے قافیے کو ترک کیا ہے۔ کئی ایسے ترقی پسند شعرأ ہیں جو آزاد اور معریٰ کو ناپسند کرتے ہیں۔ پھر اس آزاد اور معریٰ کے شیرخوار تجربوں کو ترقی پسندی کے سرکیوں تھوپا جاتا ہے۔'' 58

انجمن ترقی پسند مصنفین کی چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی کے مارواڑی ودیالیہ میں ہوئی جس کے صدر مرہٹی ادب کے مشہور ادیب شری پدامرت ڈانگے تھے۔1943ء اور 1944ء میں بنگال میں سخت قحط پڑا جس کی شدت سے سارا ہندوستان متاثر ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے ادیب قحط کے واقعے سے بیحد متاثر ہوئے اور اپنی تخلیقات میں قحط کے متاثرین سے ہمدردی جتائی۔ نظم ونثر کے علاوہ خواجہ احمد عباس نے ''دھرتی کے لال''، فلم بنائی۔

اکتوبر 1945ء میں پانچویں کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس اس وجہ سے اہم تھی کہ اس میں صرف اردو کے ترقی پسند ادیب شریک ہوئے تھے جبکہ پچھلی چار کانفرنسوں میں ہرزبان کے ادیب شریک ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے اردو زبان وادب اور اس کے مسائل پر تفصیل سے بات' بحث اور تبادلہ خیال نہیں ہو پاتا تھا۔ پانچ دن کی اس کانفرنس میں اردو کے تقریباً تمام ادیب وشعرأ نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں منعقد ہونے والے مختلف اجلاسوں کے علیحدہ علیحدہ صدر منتخب کئے گئے۔ اس کانفرنس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا۔ صدر استقبالیہ قاضی عبدالغفار اور سکریٹری عابدعلی خاں وسلیمان اریب تھے۔ ابتدائی اجلاس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ شاعری اور تنقید کے اجلاس کی صدارت کے فرائض بالترتیب فراق گورکھپوری اور سید احتشام حسین نے انجام دیے۔ جبکہ اردو اور ہندی کے مسئلہ پر منعقد اجلاس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر تاراچند نے انجام دیئے۔ جلسۂ عام کی صدارت مولانا حسرت موہانی نے کی۔

حیدرآباد میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس سے قبل جعفرعلی خاں اثر اور رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند

تحریک کے زیر اثر تخلیق پانے والے ادب میں عریانی اور فحاشی کی زیادتی پر اعتراض کیا تھا۔ اس کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایک یہ قرارداد پیش کی کہ ''اردو ادب میں اس وقت فحاشی کے جو رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں ان کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں۔'' (59) قاضی عبدالغفار نے اس قرارداد کی مخالفت کی لیکن سب سے زیادہ اس قرارداد کی مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔ اور اس طرح یہ قرارداد مسترد ہوگئی۔

حیدرآباد میں منعقدہ اس کل ہند کانفرنس کی کامیابی کا بیان کرتے ہوئے رفعت سروش لکھتے ہیں:

''اس کانفرنس کے دوررس نتائج مرتب ہوئے اور شائد ترقی پسند ادیب اور شاعر زیادہ فعال ہوگئے کم از کم حیدرآباد سے واپس آکر بمبئی کے ادیبوں اور شاعروں میں زیادہ جوش وخروش اور اتحاد عمل دیکھنے میں آیا۔ کرشن چندر نے ''پودے'' نام سے اس کانفرنس کا رپورتاژ' لکھا۔ نیا ادب' میں خصوصی مضامین چھپے۔ اور کچھ عرصہ بعد انجمن کی ہفتہ وار نشست بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) کے مکان 96ء والکیشور روڈ پر منعقد ہونے لگی۔ ان ادبی نشستوں نے ہندوستان بھر کی انجمنوں کے لیے ایک مثال پیش کی اور ملک کے مختلف شہروں میں اسی طرح کے جلسے ہونے شروع ہوئے۔'' 60

حیدرآباد میں منعقد ہونے والی کانفرنس سے انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک نئی جولانی ملی تھی اور تحریک پھر ایک مرتبہ متحرک ہوگئی تھی۔ ہفتہ واری ادبی اجلاسوں نے اس عمل کو جاری رکھا تھا۔ غالباً اسی لئے قمر رئیس نے حیدرآباد میں اکتوبر 1945ء میں منعقد اس پانچویں کل ہند کانفرنس کو ''اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس'' قرار دیا ہے۔ اس کانفرنس کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''1945ء کی پہلی کانفرنس' آغاز تحریک کے پہلے دہے میں منعقد ہوئی تھی۔ جب اس کی روایت جڑ پکڑ رہی تھی۔ ادبی اور نظریاتی طور پر اس کی بنیادیں استوار ہورہی تھیں۔ اس

پہلی اور پرشکوہ کانفرنس نے ترقی پسند ادبی تحریک کی شناخت کو نکھارنے اور اس کے آدرشوں کو ہمہ طور پر پھیلانے میں جو کارنامہ انجام دیاوہ ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے۔''61

حیدرآباد میں منعقدہ پانچویں کل ہند کانفرنس' 1947ء سے قبل کی آخری کانفرنس ثابت ہوئی۔ 1946ء میں ملک میں سیاسی طوفان سرگرم رہااوراگست 1947ء میں ہندوستان تقسیم کردیا گیا۔فیض نے' آزادی کی صبح آئی تو کہا ۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیم ہند سے قبل ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ چند ادیب پاکستان ہجرت کر گئے جن میں سید سجاد ظہیر بھی شامل تھے۔رفعت سروش لکھتے ہیں:

''مگر 47ء کے ختم ہوتے انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک خوشگوار دور ختم ہوگیا۔ ساحر اور حمید اختر' ابراہیم جلیس' خدیجہ اور ہاجرہ سب 15 اگست سے پہلے ہی بمبئی سے چلے گئے تھے۔ ہمارا غیر سرکاری آرگن' نظام' بھی تقسیم وطن کی نذر ہوگیا۔ قدوس صہبائی بھی بمبئی چھوڑ گئے اور چند ماہ بعد ہم سب کے محبوب ادیب اور رہنما سید سجاد ظہیر بھی پاکستان سدھار گئے۔'' 62

سید سجاد ظہیر کے پاکستان ہجرت اور وہاں اُن کی مصروفیات کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

''پھر ترقی پسند مصنفین کو سجاد ظہیر جیسے محبوب اور منجھے ہوئے رہنماؤں سے محروم ہونا پڑا۔ وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں انقلابی جمہوری تحریکوں کے سربراہ کی حیثیت سے ان مصروفیتوں میں پھنس گئے جو ادبی کم اور سیاسی زیادہ تھیں۔''63

اپریل 1949ء میں یو۔پی۔ کے ادیبوں نے لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں سہ روزہ صوبائی کانفرنس منعقد کی جس کا افتتاح ڈاکٹر سید محمود نے کیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت قاضی عبدالغفار نے، دوسرے اجلاس کی صدارت رشید احمد صدیقی نے اور تیسرے اجلاس کی صدارت نیاز فتح پوری نے کی۔ ملک کی تقسیم نے اردو کو متعصب زبان بنا دیا تھا۔ تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیب بھی ہندی اور اردو کے مناقشے میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ ترقی پسند تحریک اپنی پالیسی واضح کردے۔ اس کانفرنس سے ایک نیا منشور پیش کیا گیا جس میں زبان کے مسئلہ پر دوٹوک انداز میں اعلان کیا گیا۔

> ''یوپی کے ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ ہر زبان کو آزاد اور بے روک ٹوک ترقی کا حق ہونا چاہئیے۔ وہ کسی زبان کے بولنے والوں پر ایک سرکاری زبان کے لادے جانے کی مخالفت کرتی ہے۔
>
> یوپی کے ترقی پسند مصنفین کا خیال ہے کہ ہندی اور اردو دونوں بنیادی طور پر ایک ہی زبان ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کی بنیاد ایک ہی بول چال کی زبان ہے اور جنتا کی بول چال کی زبان ہی کو بنیاد بنا کر وہ زندہ رہ سکتی ہیں۔'' 64؎

اسی سنہ 1949ء میں قمر رئیس نے مارکسی لٹریچر میں دلچسپی لینی شروع کی اور کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں منعقد ہونے والے ہفتہ واری اجلاسوں میں شرکت کرنے لگے۔ قمر رئیس کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی آزادی کے بعد سید سجاد ظہیر کے غائبانے میں چلنے والی انجمن سے ہوئی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔

اواخر مئی 1949ء میں بمبئی کے علاقہ بھیمڑی میں ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں بدلے ہوئے حالات اور ہندوستان کی تقسیم کے پیش نظر 1936ء کے مینی فیسٹو کو ترک کرتے ہوئے نیا مینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''نیا منشور'' اور اُن کے اثرات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک

میں ایک نیا موڑ آیا ہے کیونکہ اس کانفرنس میں ترقی پسند ادیبوں نے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں 1936ء کے مینی فیسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فیسٹو منظور کیا اور نئے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی حالات میں ترقی پسند ادیبوں کو کھل کر ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دینے پر زور دیا گیا۔ .... جو نیا منشور پیش کیا اس سے اس تحریک کو فائدہ پہنچنے کے بجائے بعض ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتائج ترقی پسند ادیبوں کی اس تحریک اور ادبی تخلیقات کی پیداوار دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوئے۔'' 65؎

بھیمڑی کانفرنس میں منظور کئے جانے والے نئے منشور کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے انتشار کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''مئی 1949ء کی بھیمڑی کانفرنس میں پرانے منشور کو رد کرکے ایک نیا منشور منظور کیا گیا جس کے نتیجے میں ترقی پسند ادیبوں میں باہمی اختلافات' ادعائیت' انتشار اور کم نگاہی کی ایسی فضا پیدا ہوئی جس سے تحریک کو نقصان پہنچا۔ اگر سجاد ظہیر ہندوستان میں ہوتے تو کم از کم ادبی سطح پر داروگیر کی وہ صورت نہ پیدا ہوتی جو ہوئی۔'' 66؎

بھیمڑی کانفرنس میں ہندی کے ادیب ونقاد ڈاکٹر رام بلاس شرما کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ 1949ء کے حالات کے تناظر میں تحریک کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''1949ء میں ہی 1943ء کے بعد پہلی بار بمبئی میں بنگلہ' تیلگو' مراٹھی' ہندی' اردو وغیرہ کے ترقی پسند مصنفین اکٹھا ہوئے تھے اور انہوں نے کل ہند انجمن کو پھر چلانے کی کوشش کی تھی۔ ان دنوں زیادہ تر ترقی پسند مصنفین کانگریس کے قہر کا شکار تھے۔ بمبئی میں کانفرنس پر روک لگا دی گئی تھی جس کی وجہ سے مختلف صوبوں سے ترقی پسند مصنفین آنہ سکے۔'' 67؎

نئے منشور کے پیش نظر جب ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے ادیبوں پر جا بجا احتساب شروع کیا تو بہت سارے ادیبوں نے چپ سادھ لی اور کچھ ہی عرصہ بعد ترقی پسندوں میں ''ادبی جمود'' پر بحث ہونے لگی۔ اس کشاکش کی صورتحال میں مارچ 1952ء میں بمقام دہلی ترقی پسند ادیبوں کی چھٹی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بحث ومباحثہ کے بعد بھیمڑی کانفرنس کے مینی فیسٹو پر نظر ثانی کی گئی جس میں کہا گیا:

'' ہمارا ادب فنی اعتبار سے خوبصورت ہونا چاہئیے۔ قومی اور عام پسند ہونا چاہئیے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے کے لیے تمام سہولتیں دی جائیں۔

ہم تمام ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ عوام کی خدمت کے لیے متحد ہوں اور خوشحال اور پُر بہار زندگی کی تعمیر میں اپنی فنی کاوشوں کے ذریعے ان کی مدد کریں۔'' 68؎

دہلی کی اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ کرشن چندر بڑے ادیب تھے لیکن تنظیمی صلاحیتیں اُن میں نہیں تھیں چنانچہ تنظیم میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''1953ء کی کانفرنس کے بعد ترقی پسند تحریک انتشار واختلال سے نکلی تو تنظیمی تعطل میں مبتلا ہوگئی۔ .... انجمن کے نئے سکریٹری کرشن چندر نے تنظیم میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس دور میں تیزی سے سنسنی خیز ناول اور افسانے لکھ کر مشہور فلمی رسالہ ''شمع'' میں چھپوانے لگے تھے اور اُن کی حیثیت آہستہ آہستہ ایک تجارتی ادیب کی سی ہوتی جارہی تھی۔'' 69؎

ترقی پسند مصنفین کی تنظیم اس تعطل کا شکار تھی کہ کچھ عرصہ بعد سید سجاد ظہیر راولپنڈی سازش مقدمے میں بری ہوکر ہندوستان لوٹ آئے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے معترضین کو جواب دینے اور اپنی تحریروں

کے ذریعے نظریاتی الجھنوں کو دور کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اُنہوں نے انجمن کی نئی تنظیم اور اسے از سرِ نو زندہ کرنے کا مشورہ دیا اور مارچ 1956ء میں مئو ضلع اعظم گڑھ میں ترقی پسند ادیبوں کا اجتماع ہوا جس میں بڑی تلخ و ترش بحثیں ہوئیں۔ اس بات پر بھی غور ہوا کہ انجمن کی تنظیم کو بدلے ہوئے حالات میں باقی رکھا جائے یا نہیں اور اگر باقی رکھا جائے تو اس کا یہی نام ہو یا کوئی نئی شکل دی جائے۔ سید احتشام حسین کو تنظیمی کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا کہ وہ سارے ادیبوں سے خط و کتابت کے ذریعہ اس مسئلے کو طے کریں۔

اسی اثنا مئی 1956ء میں حیدرآباد میں کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے تعلق رکھنے والے ادیب بھی مدعو کئے گئے۔ اس کانفرنس میں بھی مئو کانفرنس کے موضوعات پر بحث و مباحثہ ہوا۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے نئے لکھنے والوں کی جم کر سرزنش کی اور ترقی پسند تحریک کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا:

> ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہئیت کے پیچھے اچھے موضوع کو تباہ نہیں کرنا چاہیے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر موضوع صالح بھی ہو اور زندگی کی صحت مند قدروں کی عکاسی بھی کرتا ہو اگر اسے پیش کرتے وقت ایک خاص پیکر اور خاص انداز میں ڈھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ متاثر کن ہو تو پھر وہ ایک بھونڈی سچی بات ہوگی لیکن ادب نہ ہوگا۔''
>
> ''اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ترقی پسندی کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کٹر اور دقیانوسی سر پر ڈنڈا لے کر کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ لکھ تو پھر اس قسم کا تصور غلط ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس قسم کے تصور کو جلد از جلد ختم ہونا چاہیے۔'' 70؎

ڈاکٹر عبدالعلیم کی تقریر پر مباحث ہوئے اور سجاد ظہیر نے انجمن کو دوبارہ منظّم کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ اب وہ اس کو بدلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:

> ''پہلے میری رائے یہ تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظم کرنا چاہیے۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کرکے اسے باعمل بنانا

چاہیے لیکن اب میں اس رائے پر قائم نہیں ہوں۔ اس کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔'' 71

1953ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد کرشن چندر نے اُن سے جو کچھ بن پڑا، تنظیم کے لئے کرنے کی کوشش وسعی کی لیکن اپنی خواہش اور جستجو کے باوجود وہ تحریک میں موجود انتشار اور بکھراؤ کو ختم نہیں کر سکے۔ تین برس بعد مئی 1956ء میں کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ تحریک کے بانی سید سجاد ظہیر نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ تحریک میں تنظیم بن جائے اور انتشار دور ہو۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

'' ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترویج ہے۔ ادیبوں میں خیالات کے اعتبار سے اختلاف ہوسکتا ہے اور ضروری ہے اور یہ اختلاف ایک تنظیم کے اندر رہ کر بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان کا اظہار جمہوری طریقے سے ہو۔ ہم کو اپنے اختلافات کم کرنے ہیں اور مشترکہ باتوں کو لے کر آگے بڑھانا ہے۔ اب اس تنظیم کا نام چاہے کچھ ہی ہو۔'' 72

سید سجاد ظہیر کا یہ طرز تخاطب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاز کے اُس ملاح کا ہے جسے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی کشتی کے ڈوبنے کا یقین ہو چکا ہو۔ 1953ء میں جب سجاد ظہیر پاکستان سے رہائی پا کر ہندوستان آئے ہیں اُس وقت بھی انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو ختم کرنے یا نئے نام سے قائم رکھنے کی تجویز کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو سماجی انصاف اور آزادی کا تصور دینے والے سجاد ظہیر نے سماج ہی سے ہار مان لی تھی۔ بہر حال سید سجاد ظہیر کے خدشات غلط نہیں تھے اور نہ ہی یہ ایسے خیالات تھے جو بے بنیاد ہوں۔ دراصل اُن کی دیدہ ور نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ انجمن میں اس کے نام لیوا اب صرف اردو کے ادیب وشاعر ہی رہیں گے۔ ایسا ہی ہوا کہ ایک ہی سماجی نظریئے کو تسلیم کرنے والے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک نے قدیم انجمن کے سلسلے کو قائم رکھا اور دوسرے گروہ نے اس سے علیحدگی اپنالی۔ اسی کے ساتھ ہندی کے ادیبوں نے اپنی علیحدہ ''جن وادی لیکھک سنگھ'' تشکیل دے

لی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو ابھی یہ دو صدمے ہوئے ہی تھے کہ 1960ء میں علی گڑھ میں ''ادبی انجمن'' کے نام سے ایک نئی ادبی تنظیم بنائی گئی جس کے صدر مجنوں گورکھپوری اور سکریٹری خلیل الرحمٰن اعظمی منتخب ہوئے۔ علی گڑھ میں ابتدا ٔ سے پورا ماحول ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ حالات نے کروٹ لی تھی۔ 1966ء تک کرشن چندر نے جوں توں ترقی پسند تحریک فعال اور برقرار رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ دسمبر 1966ء میں دہلی میں منعقد کل ہند کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کرشن چندر صرف ہاتھ میں ایک قلم لئے ڈائس پر نمودار ہوئے اور مدعوئین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> '' جب یہ عہدہ مجھے ملا تو اس کے ساتھ یہ قلم تفویض ہوا تھا۔ اور بس قلم کا کام لکھنا ہے۔ سو یہ لکھتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ دوسرے ترقی پسند اہل قلم بھی لکھیں اور بہتر سے بہتر لکھیں۔ جس کی اپنی ایک شناخت ہو............ میرے نزدیک انجمن پسند مصنفین کا بنیادی کام یہی ہے۔'' 73ء

1966ء کی دہلی میں منعقدہ ترقی پسند ادیبوں کی یہ کانفرنس بقول قمر رئیس ''آخری'' تھی اس لئے کہ اسی کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک نیا دستور اور منشور منظور کیا گیا اور:

> '' جس کے مطابق ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو ایک غیر الحاق اور مرکزی تنظیم کی صورت دی گئی۔'' 74ء

قمر رئیس 1952ء سے کسی نہ کسی حیثیت سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اسی دوران وہ 1962ء میں تاشقند درسی خدمات کے لئے روانہ ہوئے اور 1966ء میں ہندوستان لوٹ آئے۔ وہ بحیثیت ترقی پسند ادیب' انجمن کے بدلتے ہوئے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے جس کا اندازہ کرشن چندر پر لکھے گئے اُن کے مضمون سے ہوتا ہے جس میں اُن کی تنظیمی صلاحیتوں کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔ ابھی قمر رئیس کل ہند سطح پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا بخوبی جائزہ بھی نہ لینے پائے تھے کہ انھیں تدریس کے لئے دوبارہ ستمبر 1970ء میں تاشقند جانا پڑا۔

تاشقند میں قمر رئیس نے ترقی پسند تحریک کی تاریخ' روایت اور اُس کے عروج کا سنجیدگی سے جائزہ لیا۔ وہ

اس وقت مارکسی نظریے کی بنیاد پر تشکیل دی گئی دنیا کی پہلی مملکت میں مقیم تھے۔ یہاں انہوں نے روسی اور ازبیکی ترقی پسند ادیبوں کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ اور ہندوستان میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ بزرگ ادیبوں اور شاعروں سے بھی ربط وضبط برقرار رکھا جن میں فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور خود سید سجاد ظہیر بھی شامل تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ علاالدین خلجی نے دیوگیری (موجودہ تلنگانہ) کے مہاراجہ کو شکست دے کر اُسے دہلی کی سلطنت کا مطیع اور باج گزار بنایا تو دراصل یہیں پر اُس نے دہلی کی سلطنت حاصل کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹر قمر رئیس کا ہے کہ 1972ء میں تاشقند میں اپنی تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے جب انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو نئی زندگی دینے کی غرض سے اپنی سعئی بلیغ شروع کی تو دراصل سرزمین تاشقند پر ہی خط تقدیر نے تاحیات انجمن کی باگ ڈور اُن کے نام لکھ دی اور............

1972ء میں ہندوستان آتے ہی قمر رئیس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں، کل ہند کانفرنس بلائی گئی۔ تنظیم میں اُن کے حوصلے نے نئی روح پھونکی اُن کے ہم عصر دوستوں نے تحریک کو نئی زندگی عطا کی اور 1973ء میں قمر رئیس کو باضابطہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

قمر رئیس ترقی پسند تحریک میں ہر دو سطحوں پر سرگرم رہے۔ وہ مسلسل لکھتے بھی رہے اور تحریک کی تنظیمی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اُن کا شمار اردو کے ممتاز ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے۔ اُن کے ذکر کے بغیر 1960ء کے بعد کی ترقی پسند تحریک کا تصور نامکمل رہے گا۔ سجاد ظہیر کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کو منظّم اور متحرک کرنے میں بلاشبہ قمر رئیس نے ہی سب سے نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ وہ ایک طویل مدت سے انجمن کی سرگرمی جاری رکھے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی نوعیت اور بہانے سے انجمن کے مقاصد کو نئی نسل میں منتقل کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ قمر رئیس یوں تو لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ طالب علمی (1952ء) سے ہی کسی نہ کسی طرح سے تحریک سے وابستہ رہے اور اپنے قلم کے ساتھ ساتھ وسیع النظری اور تنظیمی صلاحیتوں سے اس تحریک کی جڑیں مضبوط کرتے رہے لیکن چالیس سال کی عمر میں یعنی 1972ء میں جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تو جلسوں، سمیناروں، اور ادبی محفلوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ تا کہ انجمن پر جمود نہ طاری

ہو اور انجمن فعال بنی رہے۔ ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس کے موضوع پر روشنی ڈالنے سے قبل اور انجمن کے تئیں قمر رئیس کی خدمات کا بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے قمر رئیس کی وابستگی پر اظہار خیال کیا جائے۔ اور اس تعلق خاطر کا بیان اگر خود قمر رئیس کے الفاظ میں ہو تو یقیناً یہ سونے پہ سہاگہ کے مترادف ہوگا۔ 1997ء میں حکومت ہند نے قمر رئیس کو ڈائرکٹر انڈین کلچرل سنٹر، سفارتخانہ ہند تاشقند کے عہدہ پر فائز کیا اور وہ تاشقند روانہ ہو گئے۔ راقمۃ الحروف نے قمر رئیس کو ترقی پسند تحریک سے اُن کی وابستگی پر مبنی چند سوالات روانہ کئے جن کے انہوں نے تفصیل سے جوابات لکھے ہیں۔ واضح رہے کہ اس مراسلاتی انٹرویو میں صرف ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قمر رئیس نے انجمن ترقی پسند مصنفین سے اپنی ابتدائی وابستگی کا بیان کرتے ہوئے لکھا:

> "1949ء میں جب میں انٹر کا طالب علم تھا تو اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے آفس سے اشتراکی لٹریچر لاکر پڑھنے لگا۔ کبھی کبھی اتوار کے دن مارکسزم پر ہونے والے کلاسوں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ پارٹی آفس میں باہر سے آنے والے کمیونسٹ کارکن بھی مارکسزم کے فلسفے پر لکچر دیتے تھے۔ سوویت یونین کی کامیابیوں اور پھر چین جیسے بڑے ملک میں ہونے والے اشتراکی انقلاب نے بھی ذہن کو متاثر کیا۔ یہ سلسلہ 52ء یعنی بی اے تک چلتا رہا۔ شعر گوئی کا آغاز ہوچکا تھا لیکن زیادہ تر روایتی انداز کی غزلیں کہتا تھا۔ البتہ بی اے میں پہنچ کر فیض احمد فیض اور سردار جعفری سے متاثر ہوکر نظمیں بھی کہنے لگا۔
>
> 1952ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں کے ادبی ماحول میں اس وقت ترقی پسندی ہی کے چرچے تھے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح مجھے بھی بعض ممتاز ادیبوں سے ملنے اور ان کی محبتوں سے نیاز مندانہ فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ ان میں سید احتشام حسین، آل احمد سرور اور حیات اللہ

انصاری کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن، سلام مچھلی شہری، کمال احمد صدیقی، مسیح الحسن رضوی اور منظر سلیم کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آل احمد سرور صاحب کے گھر، نعمت اللہ روڈ پر ہر اتوار کو ترقی پسند ادبی انجمن کے جلسے ہوتے تھے۔ ان میں بزرگوں کے علاوہ نوجوان ادیب بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ وہ اپنی کہانیاں، نظمیں اور مضامین بغیر کسی جھجک کے پڑھتے تھے۔ ان تخلیقات پر بڑی زور دار بحث ہوتی تھی۔ کسی کے ساتھ پاسداری یا رورعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ نفس مضمون پر نظریاتی انداز کی بحث ہوتی تھی لیکن فنی پہلو بھی ضرور زیر بحث آتے تھے۔ رام لعل کے علاوہ رتن سنگھ، اقبال مجید، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، آغا سہیل، حسن عابد اور دوسرے نوجوان ان محفلوں میں پابندی سے آتے تھے۔ اس وقت ہم نوجوانوں کے لیے یہ بڑی اہم تربیت گاہ تھی۔ خصوصاً سید احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کی صحبتوں نے ادب شناسی اور علم و آگہی کے نئے دروازے کھول دیے۔ چھٹے دہے میں اگرچہ نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے تھے لیکن تخلیق کے میدان میں کرشن چندر، فیض، سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور دوسرے ادیب بڑی شاندار اور شاہکار چیزیں لکھ رہے تھے۔ اور نوجوان ادیب بھی ان سے تحریک اور حوصلہ پارہے تھے۔ اس زمانے کی فکری اور نظریاتی تربیت نے میرے اندر بڑا اعتماد پیدا کیا۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح میں بھی ترقی پسندی کے حوالے سے اپنی شناخت پر فخر محسوس کرتا تھا۔"75

75۔ قمر رئیس کا انٹرویو بذریعہ ڈاک جو کہ راقمۃ الحروف کے یہاں محفوظ ہے۔

قمر رئیس کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انٹرمیڈیٹ تعلیم حاصل کرنے کے زمانے ہی سے اشترا کی

لٹریچر میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور پارٹی کی طرف سے منعقد ہونے والی کلاسوں میں شرکت بھی کیا کرتے تھے۔ اور اُن کی تربیت ایسے مقام پر ہوئی جو اشترا کی معلومات کا منبع تھا۔ 1952ء میں جب وہ لکھنؤ آئے تو حسن اتفاق کہ وہاں بھی ترقی پسند حلقہ بڑا سرگرم تھا چنانچہ یہ بہت جلد اس سے قریب ہو گئے۔ اُس وقت ان کی عمر صرف بیس برس تھی۔ اسی حلقے میں علمی و ادبی سطح پر ان کی رہنمائی ہوئی۔ اس وقت دنیائے ادب کے جو اہم نام تھے اُن میں سے بیشتر لکھنؤ ہی میں مقیم تھے۔ قمر رئیس ان ہی کی محفلوں میں بیٹھتے۔ جلسوں میں اظہار خیال کرتے اور بزرگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے۔ قمر رئیس لکھنؤ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں کے حالات خود اُن ہی کی زبانی سنئے:

> ''میں 1956ء کے اوائل میں پی ایچ ڈی (اردو) میں داخلہ کے لیے علی گڑھ آگیا۔
>
> آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن بھی اسی زمانے میں لکھنؤ سے علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ یہ زمانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں روشن خیالی کے فروغ اور تعمیر و ترقی کا زمانہ تھا۔ ممتاز ترقی پسند دانشور مجنوں گورکھپوری بھی علی گڑھ آگئے تھے۔ میرے علاوہ قاضی عبدالستار، راہی معصوم رضا اور شہاب جعفری بھی شعبہ اردو کے طالب علم تھے۔ اردوئے معلٰی کے ادبی جلسے بڑی پابندی اور کامیابی سے ہوتے تھے۔ البتہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی حالت کمزور تھی۔ کبھی کبھی ڈاکٹر عبدالعلیم اور مونس رضا صاحب کی تحریک پر کوئی جلسہ ہوجاتا تھا۔ ترقی پسندفکر و دانش کو بے شک اس زمانے کے علی گڑھ میں غلبہ حاصل تھا۔ اس عہد میں اردو کے ممتاز ترین ترقی پسند ادیب و شاعر علی گڑھ میں جمع تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کے علاوہ پروفیسر منیب الرحمن، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، اختر انصاری، وامق جونپوری، ڈاکٹر محمد حسن اور خلیل الرحمن اعظمی۔ ان سب کے گرد بہت سے نوجوان جمع ہوجاتے تھے۔ شعر و ادب کے مسائل پر اکثر ان

کے ساتھ کھل کر بحث ہوتی تھی جس سے نوجوان ذہنوں کو بڑی روشنی ملتی تھی۔ منیب الرحمن اور ڈاکٹر محمد حسن ڈرامے بھی اسٹیج کرتے تھے۔ محمد حسن نے اردو تھیٹر کے نام سے ایک تھیٹر گروپ بھی بنایا۔ اس کے ڈراموں میں نو عمر طالبات بھی اداکاری کے جوہر دکھاتی تھیں۔ اس عہد میں میرا زیادہ وقت ماہنامہ 'ادیب' اور 'علی گڑھ میگزین' کی ادارت کے کاموں یا پھر اپنے تحقیقی کام میں صرف ہوتا تھا۔ ملک کے اور اردو زبان کے مایہ ناز اور صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی میرے نگراں تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے سخت نکتہ چیں رہے تھے لیکن مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ اکثر کہتے ''مجھے تمہارے خیالات سے کوئی سروکار نہیں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ لکھو دلائل اور شواہد کے ساتھ لکھو۔'' 76

قمر رئیس جب علی گڑھ منتقل ہوئے تو وہاں انھیں وہ زمانہ ملا جو روشن خیالی کے فروغ اور تعمیر و ترقی کا تھا۔ یونیورسٹی میں اور خاص طور پر شعبۂ اردو میں معروف شخصیتیں موجود تھیں۔ علی گڑھ میں قمر صاحب کے حق میں یہ بات بھی خوب ہوئی کہ اردو ادب کی انتہائی قد آور شخصیت پروفیسر رشید احمد صدیقی کو اُن کی تھیسس Thesis کا نگراں مقرر کیا گیا۔ علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد قمر رئیس دہلی آئے جہاں شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں لکچرر کی اسامی پر اُن کا تقرر ہوا تھا۔ یہ اُن کی فراغت کا ابتدائی دور تھا۔ قمر رئیس کا بیان ملاحظہ ہو:

''اگست 1959ء میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے میں دہلی آگیا۔ یہاں آکر کچھ فراغت میسر ہوئی۔ اور تحریک کی صورتحال کے بارے میں کچھ سمجھنے اور سوچنے کا موقع ملا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر محمد حسن بھی دہلی آگئے۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جو بڑی تحریکیں اور ادارے تعطل اور انتشار کا شکار ہوئے ان میں ایک انجمن ترقی پسند مصنّفین بھی تھی۔ سجاد ظہیر صاحب جو اس کے روح رواں تھے، پاکستان جاچکے تھے۔ 1948ء کے بعد

کامریڈ ریونڈے کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی جس داروگیر کا شکار ہوئی اس کی وجہ سے بہت سے ادیب انجمن ترقی پسند مصنّفین سے الگ ہوگئے۔ کچھ ہجرت کرگئے۔ پھر اس سے اہم یہ کہ آزادی کے بعد خود انجمن ترقی پسند مصنّفین نے ایک قرارداد کے ذریعے انجمن کی رکنیت کے دروازے غیر کمیونسٹ ادیبوں پر بند کردیئے۔ انجمن کی تنظیم اور تحریک کو نقصانات پہنچانے میں اس واقعہ نے سب سے اہم رول ادا کیا۔ اور اگرچہ بعد میں دہلی کی ایک کانفرنس میں اس کی تلافی کی کوشش کی گئی لیکن نقصان جو پہنچنا تھا پہنچ چکا تھا۔ کرشن چندر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری بنادیے گئے تھے۔ وہ ایک اچھے تخلیق کار تھے لیکن انجمن کے تنظیمی کاموں میں انہوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ نہ ہی وہ اس کے اہل تھے۔ سجاد ظہیر صاحب نے پاکستان سے واپس آکر انجمن میں نئی روح پھونکنے کی کوشش ضرور کی لیکن انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس مایوس کن صورتحال سے صرف میں ہی نہیں دوسرے ادیب بھی دکھی تھے۔ اس دکھ میں اضافہ اس سے بھی ہورہا تھا کہ کچھ لوگ ''ایوان جدیدیت'' کی تعمیر کے لئے ترقی پسندی کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی مسلسل سعی کررہے تھے۔ صف اول کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں پر حملے کئے جارہے تھے۔'' 77

قمر رئیس کو اس بات کا بڑا احساس رہا ہے کہ سجاد ظہیر کے پاکستان چلے جانے اور کرشن چندر کے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سکریٹری بنا دیے جانے سے انجمن کو کافی نقصان پہنچا۔ وہ کرشن چندر کو ایک باصلاحیت ادیب ضرور مانتے ہیں لیکن اُن کی تنظیمی صلاحیتوں کے قطعی قائل نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ کرشن چندر کے دور ہی میں انجمن کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اس نقصان یا نقصان کی تکلیف میں اضافہ جدیدیت کے علمبرداروں کے ذریعے ترقی پسند مخالف مہم سے بھی ہوا۔ حالات کی اسی سنگینی نے 1972ء میں قمر رئیس کو انجمن کی قیادت سنبھالنے

پر آمادہ کیا۔ انجمن کی باگ ڈور سنبھالنے کا فیصلہ خود قمر رئیس نے اپنے طور پر نہیں لیا تھا بلکہ وہ مسلسل اپنے بزرگوں سے انجمن کو نئی زندگی دینے کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کر رہے تھے۔ چنانچہ قمر رئیس لکھتے ہیں:

''میں سجاد ظہیر صاحب، علی سردار جعفری صاحب اور دوسرے بزرگ ادیبوں سے برابر تبادلہ خیال کررہا تھا۔ فیض احمد فیض صاحب نے ترقی پسندوں کے لیے ایک بالکل نئے منشور کا مسودہ مجھے دیا تھا۔ اس پر بھی بحث ہوئی۔ بزرگوں کے علاوہ انور عظیم، اجمل اجملی، سید محمد عقیل رضوی، حسن نعیم اور اس پیڑھی کے دوسرے ادیبوں سے بھی نئی ترقی پسندی کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس طرح میرے فعال ہونے کے پیچھے جو محرکات اور مقاصد کام کررہے تھے ان کا خلاصہ یوں ہوسکتا ہے:

1. میں نے محسوس کیا که میری نسل کے بیشتر ادیب دل سے چاہتے ہیں که ترقی پسند ادیبوں کی ایک نئی تنظیم وجود میں آئے (بشرطیکہ اس کی رہنمائی بزرگ نہیں نوجوان ہی کریں) لیکن کوئی بھی Initiative لے کر قیادت کے لیے تیار نہیں تھا۔
2. جدیدیوں کی طرف سے ترقی پسند ادبی تحریک اور سرمایه پر حملوں میں شدت بڑھتی جارہی تھی۔
3. یہ حقیقت روشن تھی کہ ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں میں نوجوان ادیبوں کی بڑی تعداد جدیدیت کے نعروں کے مقابله میں ترقی پسند ادبی اور فکری روایت سے زیادہ قریب تھی۔ اپنے اظہار اور اشاعت کے لیے اس ایک معتبر فورم اور ادبی رسائل کی تلاش تھی۔
4. وحید اختر، جوگندر پال، عزیز قیسی، عمیق حنفی اور انور عظیم جیسے ذہین فنکار نئے شعور اور نئی حسیت کی شاہکار اور ابہام سے عاری تخلیقات پیش کررہے تھے۔ ان کی جدیدیت کو بالعموم ترقی پسندی کی توسیع کا نام دیا جارہا تھا۔ اور

نوجوان پیڑھی ان سے متاثر تھی۔

5. نظریاتی سطح پر اور نئی ادبی حسیت کے حوالے سے کچھ مسائل الجھے ہوئے ضرور تھے۔ لیکن ان کو سمجھنے سمجھانے اور کنفیوژن دور کرنے کے لیے ضرورت اس کی تھی کہ ادبی مسائل پر کھلے جلسے ہوں۔ مذاکرے ہوں۔ جہاں ہر شخص کو آزادی کے ساتھ اظہار خیال کا موقع ملے۔ اس طرح آہستہ آہستہ مسائل کے بارے میں ایک واضح موقف پیدا ہوگا۔ الجھاؤ کم ہوگا۔ ہم خیال ادیب ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سچائی اور ایمانداری سے سمجھیں گے۔ افہام وتفہیم کی اسی ضرورت کے تحت نئے ترقی پسند رسائل کا اجرا بھی عمل میں آئے گا۔

الغرض ایسے ہی مقاصد اور اسی سوچ کے تحت میں نے دوستوں کے تعاون سے جلسے اور سمینار کرنا شروع کیا اور ایسے ہی تقاضوں کے تحت رسائل کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ میری دانست میں اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔'' 78؎

قمر رئیس نے قیادت سنبھالنے کے بعد جو انتھک محنت کی اس کے بڑے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوئے۔ تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی اور اس طرح یہ تنظیم نئے سرے سے سرگرم ہوگئی۔ ترقی پسند نظریے اور ادب پر مباحث کا ایک سلسلہ پھر سے چل پڑا۔ قمر رئیس کے خیال میں چونکہ انجمن نے ایک بڑی غلطی یہ اعلان کر کے کی تھی کہ انجمن کا رکن صرف وہی ادیب بن سکتا ہے جو کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا جب اُن کا دور آیا تو انہوں نے اس بات کی کھلے لفظوں میں وضاحت کی کہ انجمن کی رکنیت کے لیے نہ تو کسی سیاسی جماعت سے وابستگی ضروری ہے اور نہ ہی اس کے رکن پر کسی سیاسی جماعت سے وابستگی پر کسی طرح کی پابندی ہے۔ البتہ انسان دوستی، امن خواہی اور ترقی پسندی کے دیگر اُصولوں کی حمایت لازمی ہے۔ یہ ایک فطری امر تھا۔ اس طرح کی وضاحتوں سے فائدہ یہ ہوا کہ کئی ادیب جو تحریک کی ''بے عملی'' کے سبب اس سے کنارہ کش ہو گئے تھے وہ دوبارہ تحریک میں سرگرم ہو گئے اور بعض ایسے ادیب جو نظریاتی طور پر تو ترقی پسند تھے لیکن کھل کر سامنے نہیں آتے تھے، قمر رئیس کی قیادت میں متحد

ہوئے۔

قمر رئیس کی سرکردگی میں منعقد ہونے والے انجمن کے جلسوں میں ایک اہم جلسہ مارچ 73ء میں دہلی میں ہوا۔ یہ دراصل ''ادب اور عصری آ گہی'' کے موضوع پر ایک کل ہند سمینار تھا جس کا مقصد اُس دور میں معرض وجود میں آنے والے ادب کا تجزیہ یا احتساب کرنا تھا۔ اس سمینار میں ادب کی صورتحال اور ادیب کے رجحانات اور اس کی ذمہ داریوں پر کافی کھل کر بحث ہوئی۔ ادب کیسا لکھا جارہا ہے' ادب کو کیسا ہونا چاہئے' مختلف اصناف ادب میں جو کاوشیں سامنے آ رہی ہیں اُن کی معیار بندی کا طریقہ اور کسوٹی کیا ہونی چاہئے۔ ادب میں عصری تقاضوں کے تعلق سے ہمارے ادیب کا کیا رویہ ہے۔ ادیب روایتوں سے انحراف کے زعم میں کہیں اعلیٰ قدروں کو تو فراموش نہیں کرر ہے ہیں۔ اس سے ملتے جلتے اور بھی درجنوں مسائل تھے جن پر بات چیت ہوئی۔ سمینار میں چونکہ ملک کے مختلف شہروں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی اس لیے بڑی آسانی سے سمینار میں ملک بھر کی صورتحال سامنے آئی۔ تحریک اور تنظیم کی کارکردگی پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ بیرون شہر کے نمائندوں نے سمینار کے نتائج سے اپنے اپنے شہر کے لوگوں کو واقف کرایا۔ بلکہ کئی شہروں میں اس سمینار کے بعد ایسے جلسے منعقد کئے گئے جن میں اس سمینار ہی کی روداد پیش کی گئی اور اُس پر مزید بحثیں ہوئیں۔ سمینار کی کامیابی میں بلاشبہ قمر رئیس ہی کا سب سے اہم کردار رہا۔ سجاد ظہیر فرماتے ہیں:

> ''ان تمام فیصلوں سے زیادہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر قمر رئیس کی وہ آخری اپیل ہے جو انہوں نے اپنے رفیقوں سے اس تمام کارروائی کے اختتام پر کی اور وہ یہ تھی کہ 'ہم سب سے زیادہ اور بہتر لکھنے کی کوشش کریں'۔'' 79؎

یہ ایک ایسی اپیل تھی جس نے نہ صرف سب کے دلوں پر اثر کیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے بلکہ قمر رئیس کا یہ نظریہ بھی سب پر واضح ہو گیا کہ قمر رئیس ''مصنف کی سب سے اول ذمہ داری اُس کے مصنف ہونے کو تصور کرتے ہیں'' اور مصنف کا سب سے اہم کام ''بہتر لکھنے'' کو قرار دیتے ہیں۔ یہ انتہائی اہم بات ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی ادیب کی شناخت اس کے پیش کردہ ادب سے ہی بنتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے۔

1976ء میں قمر رئیس نے ترقی پسند تحریک کے قیام کا چالیس سالہ جشن منانے کا اعلان کیا جس میں انہوں نے حیات اللہ انصاری اور اوپندر ناتھ اشک جیسے بزرگ ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ بڑی تعداد میں نوجوان ادیبوں کو بھی مدعو کیا۔ 1936ء کے بعد چالیس سال کا وقفہ گزرنے تک لکھنؤ کانفرنس کے محرکین کی بڑی تعداد انتقال کر چکی تھی۔ اب ساری ذمہ داری قمر رئیس کے سر آ پڑی جسے انہوں نے بخوبی اور بخوشی نبھایا۔

بہر حال دہلی کی غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں چالیس سالہ جشن منعقد کیا گیا جس میں نئے لکھنے والوں اور نئی سوچ رکھنے والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بڑے پیمانے پر اظہار خیال اور مباحثے ہوئے۔ انجمن کی کارکردگی اور اس سے وابستہ ادیبوں کے فن پر کھل کر رائے زنی کی گئی جس میں اعتراضات زیادہ تھے لیکن اس کا مقصد اصلاح تھا۔ اسی کانفرنس میں باضابطہ طور پر اتفاق رائے سے قمر رئیس کو انجمن کا جنرل سکریٹری (80) منتخب کیا گیا جس جوش و خروش اور بھر پور تائید سے قمر رئیس کا انتخاب عمل میں آیا وہ ترقی پسند تحریک اور انجمن کا ایک یادگار واقعہ بن گیا۔ اس واقعے کی منظر کشی کئی لوگوں نے اپنے اپنے مضمون میں کی ہے۔ رفعت سروش لکھتے ہیں:

> ''اس کانفرنس کی کامیابی میں قمر رئیس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور جب اس کانفرنس میں جنرل سکریٹری کے لیے ڈاکٹر قمر رئیس کا نام پیش کیا گیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ اس نوجوان دانشور کی عوامی مقبولیت کا اعتراف تھا۔ اور اس کے بعد زمانے نے دیکھا کہ قمر رئیس کی سربراہی میں انجمن میں سرگرمی آئی۔ اور اس سلسلے میں ان کی شہرت مشرق ومغرب کی تمام سرحدیں عبور کرگئی اور وہ بہت سے روٹھنے والوں کو ایک مرکز پر لے آئے۔ ان کی میانہ روی نے تحریک کے تن بیمار میں تازہ روح پھونک دی۔'' 81

آٹھویں دہائی میں جدیدیت پوری طرح سر اٹھا چکی تھی۔ علامت نگاری کا رواج عام ہو چکا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی اور علامت نگاری آمنے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ترقی پسندی میں موضوع اور مواد کو اہمیت دیتے ہوئے اس کی آسان ترسیل پر توجہ دی جا رہی تھی جبکہ علامت نگاری میں ''دور کی کوڑی لانے'' کو فن کا کمال

تصور کیا جا رہا تھا۔ وہ بات جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے، وہ انداز جس کا کوئی سرا ملایا نہ جا سکے، وہ جملہ جس میں قاری کھو جائے، الجھ جائے وہی علامت نگاری تھی۔ مبہم انداز میں پیچیدہ قسم کی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں۔ علامت نگاری کے دور میں ترقی پسند نظریات کی نفی کی بھی کوششیں ہو رہی تھیں۔ ایسے دور میں 1979ء میں قمر رئیس نے ''عصرِ آ گہی'' نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس کے مضامین بلاشبہ ترقی پسند خیالات پر مبنی ہوتے تھے۔ اس کے اداریوں میں قمر رئیس کبھی بالراست اور کبھی بالواسطہ طور پر جدیدیت کے وار کا دفاع کرتے تھے اور ترقی پسند ادیبوں کے مقاصد پر روشنی ڈالتے تھے۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ قمر رئیس نے اپریل 1980ء میں بڑے زور وشور سے پریم چند کا صد سالہ جشن منایا۔ اس موقع پر ''پریم چند کی روایت اور جدید اردو افسانہ'' پر کل ہند سطح کا دوروزہ سمینار منعقد کیا گیا جس میں چار مختلف پیڑھیوں کے افسانہ نگار اور ممتاز نقادوں نے شرکت کی۔ افسانہ نگاروں میں جنیندر کمار، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی اور اپندر ناتھ اشک جیسے باکمال ادیب اس میں موجود تھے۔ دوسری پیڑھی کے ادیبوں میں کوثر چاند پوری، دیوندر ستیارتھی، شکیلہ اختر اور پرکاش پنڈت کے نام قابل ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد کی دو پیڑھیوں میں انور عظیم، جوگندر پال، اقبال متین، کلام حیدری، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، ایم کوٹھاوی راہی، آمنہ ابوالحسن، کنور سین، احمد یوسف، عبدالصمد، انور امام اور بہت سے مقامی نوجوان ادیب وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں جبکہ نقادوں میں پروفیسر ثریا حسین، پروفیسر ساجدہ زیدی، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر وہاب اشرفی، اصغر علی انجینئر، زاہدہ زیدی، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر ش اختر، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر عتیق اللہ، اظہار اثر، ڈاکٹر فضل امام، ڈاکٹر فصیح ظفر، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، عبدالقیوم ابدالی وغیرہ شامل تھے۔

قمر رئیس 1982ء میں دو برسوں کے لیے تاشقند چلے گئے۔ واپسی پر کافی دنوں تک ان کی طبیعت خراب رہی۔ اس لیے انجمن کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں لیکن 1984ء میں جب وہ فیض عالمی سمینار میں شرکت کے لیے لندن گئے تو وہاں کچھ اور ہی منصوبہ بندی ہوگئی۔ قمر رئیس نے سید عاشور کاظمی کے ساتھ مل کر لندن میں ترقی پسند مصنّفین کا جشن پچاس سالہ منعقد کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ یہ کانفرنس اگست 1985ء میں لندن میں منعقد کی گئی اور اس کی تیاری پورے سال جاری رہی۔ ہندوستان، پاکستان اور لندن میں اس کی بے شمار میٹنگیں ہوئیں۔ لندن میں

عاشور کاظمی نے اس کے اہتمام کا بیڑہ اٹھایا۔ انہیں فارغ بخاری، جاوید حکیم اور بخش لائلپوری وغیرہ کا تعاون حاصل تھا۔ 1936ء کے بعد ترقی پسند تحریک کی تاریخ میں اتنی عظیم الشان کانفرنس کا انعقاد کبھی نہیں ہوا تھا۔ قمر رئیس نے کانفرنس کی تیاریوں اور اس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ عاشور کاظمی ادیبوں کو مدعو کرنے کے لیے بذات خود ہندوستان آئے۔ مختلف شہروں کا دورہ کیا اور کم و بیش سبھی سرگرم لوگوں سے ملاقات کی۔ کانفرنس کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی جاتی تھی عاشور کاظمی اور قمر رئیس پر دباؤ بڑھتا جاتا تھا۔ عاشور کاظمی لندن میں اور قمر رئیس دہلی میں بیٹھے ہوئے کانفرنس کی تیاریوں کے نوک پلک درست کرتے رہے۔ سید عاشور کاظمی رقم طراز ہیں:

> ''اندازہ ہوتا تھا کہ جو حال لندن میں میرا تھا دہلی میں اسی صورتحال سے وہ دو چار تھے۔ طے یہ تھا کہ قمر رئیس صاحب کم از کم ایک ہفتہ قبل لندن پہنچیں گے تاکہ پروگرام کو آخری شکل دی جاسکے لیکن انہیں ہوائی سیٹ نہ مل سکی۔ وہ 29 جولائی کو لندن پہنچے اور آتے ہی بیمار پڑگئے۔'' 82

اس ناسازئ صحت کے باوجود قمر رئیس نے کانفرنس کی تنظیم اور رہنمائی کا کام جاری رکھا۔ اس کانفرنس کے ایک مندوب ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> '' وہ عاشور کاظمی صاحب کے گھر پر لیٹے لیٹے ہدایت دیتے رہے۔ دلچسپی دکھاتے رہے تاکہ ہمارا اور خاص طور پر عاشور صاحب کا دل نہ ٹوٹنے پائے۔ قمر صاحب اس قدر بیمار تھے کہ اپنا مقالہ نہ پڑھ سکے۔ ان کا مقالہ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے پڑھا۔ تقریبات کے آخری بزنس سیشن میں وہ باقاعدہ شریک ہوئے۔ لندن کے ٹھنڈے موسم میں سر سے پیر تک گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے ، بخار میں تپتے ہوئے قمر صاحب جس وقت مائیک پر آتے ہیں جس طرح سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اس سے مجھے پہلے بار ان کی بین الاقوامی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔ ہر چند کہ ان کی آواز میں نقاہت تھی لیکن پھر بھی ان کی تقریر کا مانوس لب ولہجہ ، شیریں سخنی ، شکریہ ، وعدے یہ سب کچھ

دل کو چھوگئے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی قلبی وذہنی وابستگی کا وہ ایک ایسا نادر اور جذباتی اظہار تھا جس نے قمر صاحب کا قد بہت بلند کردیا۔''83؎

اس کانفرنس میں ہندوستان، پاکستان، کناڈا، جرمنی، روس، ناروے اور برطانیہ کے ادیبوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ بیرون ملک کے مندوبین میں سب سے زیادہ تعداد ہندوستان سے تھی جس کی وجہ صرف قمر رئیس تھے۔

ترقی پسند تحریک کے گولڈن جوبلی سال یعنی 1986ء میں ترقی پسند ادیبوں کی فیڈریشن نے فیصلہ کیا کہ ملک کے مختلف اہم شہروں میں کانفرنسوں کا انعقاد کیا جائے۔ اس سلسلے کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی۔ فیڈریشن کی کانفرنس ہونے کی وجہ سے اس میں تقریباً سبھی ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کی لیکن فطری طور پر اردو ہندی ادیبوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بیرون ممالک کے مندوبین بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ مگر اتفاق سے کانفرنس کے دوران ہندی اردو کا ایک تنازعہ چھڑ گیا۔ تنازعے نے اتنی شدت اختیار کی کہ مہادیوی ورما اور پریم چند کے بیٹے امرت رائے سمیت کئی ہندی ادیبوں نے اردو کے خلاف بیانات دیے اور اردو ادیبوں نے کانفرنس کے پہلے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ ایسے ماحول میں قمر رئیس نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے اُردو ادیبوں کو اپنے ساتھ لے کر اُس وقت کے فیڈریشن کے صدر بھیشم ساہنی سے بات چیت کی۔ وہاں موجود ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا بیان ہے:

'' یہاں میں نے قمر صاحب کا ایک نیا روپ دیکھا۔ قمر صاحب کے سیکولر کردار، مساوات، اشتراکیت اور ترقی پسندی پر ان کا دشمن بھی شک نہیں کرسکتا۔ صبر وتحمل اور سنجیدگی ان کی شخصیت کے اجزائے لانیفک ہیں۔ ان سب کے باوجود وہ ایک انسان ہیں۔ اس دن پہلی بار میں نے ان کے چہرے پر غم وغصہ کی لہریں نمایاں طور پر دیکھیں۔ بعد میں وہاں بھیشم ساہنی بلائے گئے۔ اس وقت قمر صاحب نے بھیشم ساہنی سے جو گفتگو کی وہ ان کی اردو دوستی، تنظیم دوستی کی بہترین مثال تھی۔'' 84؎

کانفرنس کے اختتام کے بعد قمر رئیس نے پورے ملک کے اہم شہروں کے ادیبوں سے تیزی سے رابطہ قائم کرنا شروع کیا اور ہر شہر میں کانفرنس منعقد کئے جانے کی ترغیب دی۔ یہ تمام کانفرنسیں ترقی پسند تحریک کے جشن زریں سے متعلق تھیں۔ الہٰ آباد، لکھنؤ، جے پور، رانچی اور دہلی وغیرہ میں بڑے دھوم سے جشن منایا گیا۔ کانفرنسوں کا انعقاد تو شہر کے مقامی ادیب ہی کرتے تھے لیکن قمر رئیس مسلسل ان تمام سے رابطہ بنائے رکھتے تھے۔ اپنے تجربوں سے فائدہ پہنچاتے رہتے تھے۔ شرکت کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ بیشتر ادیب اپنے اپنے حساب سے کسی کانفرنس میں شریک ہوتے تھے تو کسی میں نہیں لیکن قمر رئیس ان دنوں منعقد ہونے والی ہر کانفرنس میں شریک ہوئے اور دیگر شرکا نے ان کی موجودگی کی برکتوں سے فائدہ اٹھایا۔ ان کانفرنسوں میں سب سے زیادہ اہم اور آخری کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں ترقی پسند ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شرکاء میں آنند نرائن ملا، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، وامق جونپوری، مجروح سلطان پوری، جیلانی بانو جیسے سینئر ادیبوں کے ساتھ بے شمار نوجوان ادیب اور اسکالر بھی شامل تھے۔

ممتاز ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین کی ادبی و تنقیدی خدمات پر دسمبر 1988ء میں الہٰ آباد میں ایک دو روزہ سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سلسلے میں مدعو حضرات کو کرایے کے ساتھ نذرانے کی بھی پیش کش کی گئی۔ قمر رئیس کو جو دعوت نامہ وصول ہوا اس میں بھی نذرانے کا ذکر کیا گیا تھا۔ قمر رئیس نے اس دعوت نامے پر اپنا جو ردِ عمل ظاہر کیا اس سے ان کی شخصیت کی عظمت، بے لوث خدمت کا جذبہ اور ترقی پسند نظریات سے ان کی غیر معمولی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے "نذرانہ" دیے جانے کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے یو پی کے گورنر کو افتتاح کے لیے مدعو کیے جانے پر بھی احتجاج کیا۔ انہوں نے یاد دلایا کہ انجمن کا یہ فیصلہ ہے کہ خواہ اسے حکومت سے مدد لینی پڑے لیکن حکومت کے اراکین کو افتتاح وغیرہ کے لیے آمادہ نہیں کیا جائے گا۔ دراصل قمر رئیس کا یہ رویہ ان کی پوری زندگی میں قائم رہا ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں ترقی پسند اُصولوں پر کاربند رہتے ہیں اور یہی تربیت اپنے جونیئر ساتھیوں، ادیبوں، اسکالروں اور طلبہ کو دیتے ہیں۔ قمر رئیس کی ترقی پسندی میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ صحت مند تبدیلیوں کا استقبال کرتے ہیں اور زمانے کے تقاضوں سے دامن نہیں بچاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے

ساتھ لکھنے والوں کے موضوعات بھی بدل رہے ہیں،ان کے انداز بھی بدل رہے ہیں اور تخلیقات کے لیے تخلیق کار کا رویہ بھی بدل رہا ہے۔فکر میں بھی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔قمر رئیس نے ان تمام تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا البتہ ان کا بنیادی رشتہ ترقی پسندی سے جڑا رہا۔ 1991ء میں دہلی اردو اکادمی نے ''عصمت چغتائی اور نیا اردو افسانہ'' پر سہ روزہ سمینار کیا۔سمینار کی نگرانی قمر رئیس نے کی اور اس سمینار میں بھی انہوں نے نئے افسانوں کے ساتھ نئے خیالات کی تعریف کی اور حقیقت پسندی کے مقابلے میں نئی حقیقت پسندی کی اصطلاح استعمال کی۔علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> '' انہوں نے ان سب کے ذریعہ اپنی نظریاتی وسعت کا ثبوت دیا اور ثابت کرنا چاہا کہ ترقی پسندی ایک وسیع نظام فکر کا نام ہے' انہوں نے بارہا کہا کہ ترقی پسندی تبدیلیوں کا استقبال کرتی ہے۔ جو لوگ زمانے کی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ زمانے کا ساتھ بھی نہیں دے سکتے۔ مارکسزم سماجی ومعاشی تبدیلیوں کا تو نام ہے ہی' خود احتسابی کا بھی نام ہے اور قمر رئیس ہمیشہ محاسباتی عمل سے دو چار رہے ہیں۔ ان کی فکر میں' ان کی شخصیت میں ایک خوشگوار قسم کی لچک ہے۔''85

قمر رئیس نے کبھی بھی ٹکراؤ کا رویہ اختیار نہیں کیا۔تحریک پر اعتراضات کا ردعمل بھی وہ بڑے نپے تلے انداز اور محتاط طریقے سے ظاہر کرتے تھے۔اس کے لیے انہوں نے اپنے رسالوں ''عصر آگہی'' اور ''نیا سفر'' سے بھی بڑا کام لیا۔ان رسالوں میں بھی وہ راست جواب نہیں دیا کرتے ہیں بلکہ اخلاقی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کہہ دینے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کا ایک صالح طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ ایسے موضوعات اور شخصیات پر سمینار کا اہتمام کرتے ہیں تاکہ بڑے پیمانے پر اور بڑے پلیٹ فارم سے اپنی بات کہی جاسکے۔اس سلسلے کا ایک سمینار جوش ملیح آبادی سے متعلق تھا جسے انہوں نے 17, 18, 19 اپریل 1992ء کو دہلی میں منعقد کیا۔بعد میں سمینار میں پیش کئے گئے مقالے ''نیا سفر'' میں شائع ہوئے۔بعد ازاں اس

خاص نمبر کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ جوش سیمنار کے بعد قمر رئیس نے سوویت یونین کے انہدام اور مشرقی یورپ کی اشتراکی ریاستوں کے خاتمہ کے موضوع پر 28 مئی 1994ء کو سیمنار کا اہتمام کیا۔ انہدام سوویت یونین کو قمر رئیس ''ڈوبتی صدی کا اہم ترین واقعہ'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' اشتراکی ملکوں کی کمزوریاں اپنی جگہ لیکن ان ملکوں میں اشتراکیت کے نام پر جو معاشرے بن رہے تھے انہوں نے انسان کو صدیوں کے استحصال ' جبرومحکومی ' پسماندگی اور وحشیانہ اونچ نیچ کی زنجیروں سے آزادی کے خواب دکھائے تھے۔ ان خوابوں کی مدھر روشنی نے ہمارے شعور وادب کے نئے گوشوں کو منور کیا تھا۔ اسے انسانی دکھ درد سے کچھ اور قریب کردیا تھا۔'' 86

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین کی 25 ویں کانفرنس 10 مارچ 1995ء کو حیدرآباد میں منعقد کی گئی جس میں قمر رئیس کو ایک بار پھر جنرل سکریٹری' انجمن ترقی پسند مصنّفین منتخب کیا گیا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اس موقع پر قمر رئیس نے ایک یادگار رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں انجمن کی کارکردگی کا وسیع پیمانے پر احاطہ کیا گیا ہے اور ترقی پسندی کو جن جن صورتحال کا سامنا رہا' اُس سب پر روشنی ڈالی گئی۔ رپورٹ میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف' ان کی روایات' انجمن کی حیدرآباد شاخ کی بہتر کارکردگی' جدیدیت کے فروغ کے اثرات' انجمن کے جشن زریں سے متعلق جلسوں' انجمن کی 24 ویں کانفرنس منعقدہ دہلی مورخہ 2, 3, 4 مارچ 1990ء کے نتائج اور گزشتہ کانفرنس اور اس کانفرنس کے دوران ہوئے مختلف سیمناروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے آخری حصے میں قمر رئیس نے بڑا نازک مسئلہ اٹھایا اور اس کی وضاحت بھی بیان کردی ہے:

> '' آج کے نوجوان ادیب اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ عہد حاضر میں ترقی پسندی کی ترجیحات کیا ہیں؟ کیا کسی خاص نظریہ سے غیر مشروط وفاداری کا نام ترقی پسندی ہے؟ یا یہ ایک روشن اور شفاف ذہنی رویہ ہے جو زندگی کی سچائیوں

کی تلاش میں ہماری مدد کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ رویہ ایک فلسفی اور سائنٹسٹ کے رویے سے کیونکر مختلف ہوگا؟ کہ وہ بھی سچائیوں کی تلاش کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک ادیب اور تخلیق کار کا ذہنی رویہ ان سے اپنے بنیادی حوالوں میں مختلف ہے اور ہونا چاہئیے۔ ان کی تلاش وتحقیق کا محرک علمی ہے۔ جبکہ ایک تخلیق کار کی فکر وتشویش کا مرکز انسان کی ذات ہے۔ اس کی فلاح' آسودگی' آتشی اور آزادی ہے۔ اُس طرح انسان دوستی ہی اس کا بنیادی حوالہ ٹھہرتا ہے۔ لیکن آج کی یہ انسان دوستی عہد سلف کی انسان دوستی سے اس لئے مختلف ہے کہ اس کا سرچشمہ مذہب' رواجی اخلاق اور وجدان تھا جبکہ صنعتی عہد کی انسان دوستی کو فروغ دینے میں تمام بشری' عقلی اور سائنسی علوم اور نظریوں نے رسد بہم پہنچائی ہے۔ کوئی بھی نظریہ اور اس کا اطلاق ترقی پسندانہ ہوگا جو انسان کی آزادی' آسودگی اور فلاح کا ضامن ہو۔ جو اس کو صدہا سال کے استحصال' ظلم' احتیاج' زبردستی اور نا برابری کی اذیت سے نجات بخشنے کے امکانات رکھتا ہو' اس لئے ذاتی طور پر میں کل ہی نہیں' آج بھی اشتراکی نظریہ کو حرز جاں بنائے ہوئے ہوں کہ پچھلی صدیوں میں جو نظریے انسان نے خلق کئے ہیں ان میں اشتراکی نظریہ سب سے بڑھ کر انسان دوستی' عوام دوستی اور درد مندی کا حامل ہے۔'' 87

اس کانفرنس کے کچھ ہی دنوں بعد قمر رئیس اپنی نئی ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے اپنے پسندیدہ شہر تاشقند روانہ ہوگئے۔ وہاں اُن کا پانچ برس تک قیام رہا۔ 2002ء میں وہ ہندوستان واپس آئے ہیں۔ آنے کے بعد اُن کے قلم میں پہلے سے کہیں زیادہ تیزی آ گئی ہے۔ اُن کی آمد کے بعد متواتر اُن کی کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں لیکن ان کا تعلق ازبیکستان اور وہاں کے ادب سے ہے۔ قمر رئیس اپنی عمر کی ساتویں دہائی مکمل کر چکے ہیں اور اس دوران وہ عارضۂ قلب میں بھی مبتلا تھے۔ غالباً اسی وجہ سے وہ سفر وغیرہ سے پرہیز کرنے لگے ہیں۔ ابھی حال ہی میں (وسط

اپریل 2003ء) میں حیدرآباد میں منعقد کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین کے فیڈریشن کی تیرہویں کانفرنس منعقد ہوئی لیکن وہ اُس میں بھی شریک نہ ہوسکے۔ تاہم ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اُن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جسے ہمیشہ ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ بقول احمد جمال پاشا:

> ''انجمن ترقی پسند مصنّفین'' کے تن مردہ میں قمر رئیس نئی روح پھونک چکے ہیں۔ یہ اپنا تاریخی کارنامہ انجام دے کر اب خود تاریخ بن چکے ہیں۔ ان کی باتوں میں' ان سے ملاقات میں وہی کشش ہے جو میں نے سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض میں دیکھی تھی۔'' 88

حواشی و حوالے

1. خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 11 سنہ اشاعت 1996ء
2. خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 11 سنہ اشاعت 1996ء
3. ڈاکٹر سیما صغیر ''ترقی پسند تحریک کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' ص 44 مضمون مشمولہ ''نوائے ادب'' ممبئی بابت جولائی تا ستمبر 2002ء
4. راج بہادر گوڑ روشنائی ''ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی'' ص 17 ص 18 مضمون مشمولہ ادبی تناظر 1991ء
5. خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 19 سنہ اشاعت 1996ء
6. راج بہادر گوڑ ''انصبا'' ص 13
7. نورالحسن نقوی ''الطاف حسین حالی'' مشمولہ فن تنقید اور اردو تنقید نگاری ص115 1998ء
8. مولانا الطاف حسین حالی' مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ
9. مولانا الطاف حسین حالی ''دیوان حالی'' مطبع انوار احمدی الہ آباد
10. محمد حسین آزاد ''نیرنگ خیال'' ص15 مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ' دہلی 1978ء
11. انگارے کی اشاعت کے بعد اُس کی ممانعت کے سلسلے میں رسالوں اور اخباروں میں جو طوفان اٹھا اُن کا اندازہ ڈاکٹر خالد علوی کی مرتبہ کتاب ''انگارے کا تاریخی پس منظر اور ترقی پسند تحریک'' میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ م ج
12. ڈاکٹر قمر رئیس ''اُردو افسانہ میں انگارے کی روایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 47

13۔ ڈاکٹر خالد علوی ''انگارے کا تاریخی پس منظر اور ترقی پسند تحریک'' نئی دہلی ص 11

14۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ''ترقی پسند اُردو افسانے اور چند اہم افسانے نگار'' ص 22 و ص 23 سنہ اشاعت 2002ء

15۔ و 16۔ پروفیسر محمد مجیب ''م'' ''تنقید و تبصرہ'' مشمولہ رسالہ جامعہ دہلی بابت فروری 1933ء

17۔ محمود الظفر' اخبار لیڈر' الہ آباد 5 اپریل 1933ء

بحوالہ ڈاکٹر خالد علوی ''انگارے کا تاریخی پس منظر اور ترقی پسند تحریک'' نئی دہلی

18۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''اُردو افسانہ میں انگارے کی روایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 53

19۔ احمد علی ''ترقی پسند تحریک اور تخلیقی مصنف'' ص 4 مضمون رسالہ ''سیپ'' کراچی

20۔ سید سجاد ظہیر ''یادیں'' مضمون مشمولہ رسالہ ''نیا ادب'' بابت جنوری فروری 1941ء

21۔ جاں نثار اختر نے بحیثیت مدیر علی گڑھ اردو میگزین اپریل 1936ء کے شمارے میں

سجاد ظہیر کے اس افسانے ''بیمار'' کو شائع کیا ملاحظہ ہو ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر ص 239)

22۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 31

23۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ''سویرا'' لاہور' شمارہ نمبر 8

24۔ سید سجاد ظہیر ''لوئی اراگوں'' مضمون مشمولہ رسالہ ادب لطیف لاہور۔ سالنامہ 1948ء

25۔ سید سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص 112 1980ء دہلی

26۔ رسالہ ہنس اکتوبر 1935 بحوالہ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص 33-32

27۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 34

(28۔ پریم چند رسالہ ''ہنس'' بابت اکتوبر 1935ء بحوالہ ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' از خلیل الرحمٰن اعظمی ص 33)

29۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 37

30۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 142 مشمولہ ''تنقیدی تناظر''

31۔ منشی پریم چند کا خط سجاد ظہیر کے نام مشمولہ ''نیا ادب'' بابت جنوری فروری 1940ء لکھنؤ

32۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 4

33۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 143 مضمون مشمولہ ''تنقیدی تناظر۔''

34۔ ڈاکٹر سیما صغیر ''ترقی پسند تحریک کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' ص 46

مضمون مشمولہ رسالہ ''نوائے ادب'' ممبئی بابت جولائی تا ستمبر 2002ء

35۔ ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 19 مارچ 1980ء

36 منشی پریم چند ''ادب کی غرض وغایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 20

37 منشی پریم چند ''ادب کی غرض وغایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 21-20

38 منشی پریم چند ''ادب کی غرض وغایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 23-22

39 منشی پریم چند ''ادب کی غرض وغایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 24

40 منشی پریم چند ''ادب کی غرض وغایت'' مشمولہ گفتگو ممبئی' ترقی پسند ادب نمبر ص 27

41 تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''روشنائی'' ص 112 از سید سجاد ظہیر

42 قمر رئیس ''تنقیدی تناظر'' ص 143

43 تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''روشنائی'' از سید سجاد ظہیر

44 خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ایڈیشن 1996 ص 51

45 خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ایڈیشن 1996 ص 53

46 سردار جعفری ''ترقی پسند ادب''

47 سید سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص 187

48 خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 58

49 خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 59

50 علی سردار جعفری ''ترقی پسند ادب'' طبع اول ص 193

51 ''حلقہ ارباب ذوق'' مضمون مشمولہ ''ادبی دنیا'' لاہور جولائی 1945 ص 44

52 میرا جی ''1941 کی بہترین نظمیں'' دیباچہ ص 11 مرتبہ ''حلقہ اربابِ ذوق'' لاہور

53 ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ''حلقہ اربابِ ذوق'' ص 48 و 49 مضمون مشمولہ ''تنقید شعر'' 1971ء

54 اور 55 بحوالہ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 64

56 رسالہ ''نیا ادب'' سہ ماہی 1943ء شمارہ 1

57 تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ''منزل'' لکھنؤ بابت فبروری مارچ 1944ء

58 بحوالہ سہ ماہی ''نیا ادب'' بابت 1944ء مرتبہ قاضی عبد الغفار

59 ڈاکٹر قمر رئیس ''رپورٹ'' بابت 10 مارچ 1995ء۔ حیدر آباد

60 پروفیسر قمر رئیس' سید عاشور کاظمی ''ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر'' 1987 ص 298

61 ڈاکٹر قمر رئیس ''رپورٹ'' بابت 10 مارچ 1995ء حیدر آباد

62 پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ''ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر'' 1987 ص 301

63 ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''روشنائی۔ ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی'' ص 30 مضمون مشمولہ ''ادبی تناظر''

64 رپورٹ شائع کردہ انجمن ترقی پسند مصنفین یوپی 1949ء، بحوالہ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 88

65 خلیل الرحمٰن اعظمی ''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک'' ص 89, 88 اور ص 95

66 ڈاکٹر قمر رئیس ''سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 147 مضمون مشمولہ تنقیدی تناظر

67 بحوالہ ''ترقی پسند تحریک کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' از ڈاکٹر سیما صغیر ص 48 مشمولہ رسالہ ''نوائے ادب''

68 مکمل منشور کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ''شاہراہ'' دہلی بابت اپریل 1952ء

69 خلیل الرحمٰن اعظمی ''اردو ادب'' میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 101

70 علی گڑھ کے سالانہ جلسہ کی رپورٹ۔ رسالہ ''ماحول'' (دہلی) شمارہ 14,13۔ بحوالہ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

71 و 72 ترقی پسند ادیبوں کے اجتماع کی رپورٹ۔ صبا (حیدرآباد) جون جولائی 1956ء

بحوالہ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

73 ڈاکٹر قمر رئیس ''رپورٹ'' ص 5 حیدرآباد کانفرنس منعقدہ مارچ 1995ء

74 قمر رئیس ''سجاد ظہیر اور ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 152 مضمون مشمولہ تنقیدی تناظر

75، 76، 77 و 78 قمر رئیس کا انٹرویو بذریعہ ڈاک جو کہ راقمۃ الحروف کے یہاں محفوظ ہے۔

79 سجاد ظہیر بحوالہ ڈاکٹر علی احمد فاطمی ''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس''، مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 341

80 رفعت سروش اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے سلمٰی شاہین کی مرتبہ کتاب قمر رئیس ایک زندگی میں قمر رئیس کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری بنائے جانے کی سنہ 1976 درج کی ہے جبکہ اسی کتاب میں ریاض احمد نے سنہ 1972 تحریر کی ہے۔ راقمۃ الحروف نے اس سلسلے میں جب پروفیسر قمر رئیس سے بات کی تو اُنہوں نے بتایا کہ ''1972 سے میں نے اُردو مصنفین کو ایک علاحدہ پلیٹ فارم پر لا کر سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا اور ایک جلسہ بھی منعقد کیا تھا لیکن مجھے جنرل سکریٹری 1973 کی کانفرنس میں منتخب کیا گیا۔ 1976 کی کانفرنس میں، جو نسبتاً بڑی تھی، میری جنرل سکریٹری شپ قائم و برقرار رکھنے پر اتفاق رائے کیا گیا۔ سنہ 2000 میں جب میں تاشقند میں تھا تو یہاں ایک کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین نے علی احمد فاطمی کو جنرل سکریٹری چن لیا اور مجھے اس کی صدارت سونپ دی۔'' اس بیان کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا کہ قمر رئیس کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری 1973 میں منتخب کیا گیا تھا اور وہ 2000 میں اس کے صدر بنائے گئے۔ (م۔ج)

81 رفعت سروش ''قمر رئیس: ایک تاثراتی مطالعہ''، مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 101

82 سید عاشور کاظمی ''کارواں بنتا گیا''، مشمولہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر ص 31

83. ڈاکٹر علی احمد فاطمی ''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس''، مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 345

84. ڈاکٹر علی احمد فاطمی ''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس''، مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 347

85. ڈاکٹر علی احمد فاطمی ''ترقی پسند تحریک اور قمر رئیس''، مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 53-252

86. قمر رئیس کی رپورٹ بحیثیت جنرل سکریٹری، کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین منعقدہ حیدرآباد مارچ 1995ء

87. قمر رئیس کی رپورٹ بحیثیت جنرل سکریٹری، کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین، کانفرنس منعقدہ حیدرآباد

88. احمد جمال پاشا ''قمر رئیس''، مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی ص 41 - 40

☆☆☆

باب چهارم

پریم چند اور قمر رئیس

برصغیر میں پریم چند اور قمر رئیس اسم بہ مسمّٰی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پریم چند نے اپریل 1936ء میں بمقام لکھنؤ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت کے فرائض اس مقبولیت کے ساتھ انجام دیئے اور اپنے خطبہ صدارت میں ترقی پسندی کی تعریف کا اس طرح بیان کیا کہ اُن کا خطبہ کانفرنس کے منشور سے زیادہ اہم گردانا گیا۔ کچھ ایسی ہی صورتحال قمر رئیس کی اُن تصنیفات کی ہے جو انہوں نے پریم چند اور اُن کے فن پر سپرد قلم کی ہیں۔ پریم چند 1936ء میں آنجہانی ہوگئے اور ٹھیک بیس برس بعد قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کو اپنا موضوع بنا کر علی گڑھ میں ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھنا شروع کیا اور 1959ء میں انھیں یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا۔ اسی برس اُن کا مقالہ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے سرسید بک ڈپو نے شائع کیا۔

آج اکیسویں صدی میں پریم چند کی تخلیقات کو جو اہمیت حاصل ہے وہی اہمیت قمر رئیس کے تحریر کردہ مقالے کو بھی حاصل ہے۔ بلکہ تفہیم پریم چند کے ضمن میں آج کا قاری پریم چند کی تخلیقات پر قمر رئیس کی تصانیف کو ترجیح دیتا ہے۔

قمر رئیس کی پریم چند اور اُن کے فن سے دلچسپی کا بیان کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

> ''فکشن اور فکشن میں پریم چند کی تخلیقات قمر رئیس کا اہم موضوع رہا ہے۔ انہوں نے پریم چند کے حالات زندگی، ان کی شخصیت، ان کے افسانوں اور ناولوں کے پس منظر اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کا کئی زاویوں سے تجزیہ کیا ہے۔ اُردو ہی

نہیں، ہندی میں بھی پریم چند کے سلسلے میں قمر رئیس کی
تحریریں عالی مقام رکھتی ہیں اور ان کے حوالے کے بغیر ظاہر ہے
پریم چند پر کوئی کام آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔"[1]

قمر رئیس کی پریم چند اور اُن کے فن پر تحقیق اس زمانے میں سامنے آئی جب آزادی کے بعد ادب پر جمود کی کیفیت طاری تھی اور "فکشن پر لکھے گئے مضامین کا قحط تھا" ([2]) قمر رئیس نے اسی قحط میں پریم چند پر تحقیق کا گل سرسبد پیش کیا۔ پریم چند پر قمر رئیس کی پہلی تصنیف 1959ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی اور تا حال پریم چند، اور اُن کے فن پر مندرجہ ذیل تصانیف قمر رئیس نے سپرد قلم کئے ہیں:

1. پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار 1959ء
2. مضامین پریم چند 1960ء
3. پریم چند فکر وفن 1980ء
4. پریم چند 1981ء
5. منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے 1983ء
6. پریم چند کے نمائندہ افسانے 1991ء

قمر رئیس نے حسب ذیل مضامین پریم چند کے فن پر لکھے ہیں:

1. پریم چند کی زندگی میں رومانی عناصر، مطبوعہ علی گڑھ میگزین بابت 1958ء
2. پریم چند کی کہانیاں ۔ مشمولہ تلاش وتوازن ۔ 68ء
3. پریم چند کے افسانے ایک جائزہ ۔ مشمولہ تعبیر و تحلیل
4. پریم چند کے ہیرو، ایک سماجیاتی جائزہ ۔ مشمولہ تعبیر و تحلیل
5. پریم چند کی روایت اور جدید افسانوی ادب ۔ مشمولہ تعبیر و تحلیل
6. "پریم چند اور فرقہ واریت" مشمولہ عصری آگہی

پریم چند سے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کی سب سے پہلی تحریر راقمۃ الحروف کی نظر میں وہ مضمون ہے جو" پریم چند

کی زندگی میں رومانی عناصر'' کے عنوان سے انہوں نے 1958ء میں لکھا اور جسے قمر رئیس نے علی گڑھ میگزین میں شائع کیا تھا۔ جس کے مدیر وہ خود تھے۔ اس مضمون میں قمر رئیس نے پریم چند کی زندگی کے جس رومان کا ذکر کیا ہے اُس کا لبِ لباب انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' میں درج کر دیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہ مضمون قمر رئیس نے اپنے کسی مجموعہ ہائے مضامین میں شامل نہیں کیا ہے۔

''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' ڈاکٹر قمر رئیس کی ایک معرکتہ الآ را تصنیف ہے جو بنیادی طور پر ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیوسٹی سے اس موضوع پر تحقیق کی تھی اور ان کے نگراں شہرۂ آفاق ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن دسمبر 1959ء میں شائع ہوا اور اس نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ محض تین سال کی مدت میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور اس کے بعد ہندوستان و پاکستان میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ آج قمر رئیس کی ماہر پریم چند کی حیثیت سے جو شناخت ہے اس کی بنیاد اسی کتاب سے پڑی تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کتاب پر تعارف لکھتے ہوئے اسے اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو میں شاید یہ پہلا مقالہ ہے جس میں پریم چند کے تصورات اور ان کی تخلیقات کا اس تفصیل سے مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کے محرکات بعض ناولوں اور کرداروں کے ماخذوں' موضوعات اور ناول کی فنی ساخت پرداخت کو تنقیدی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ...... ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کیا ہے اور اس فریضہ کو محنت' دیانت اور خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ انہوں نے ان دستاویزات سے استفادہ کیا ہے جو اس مطالعہ میں بیش از بیش قدروقیمت رکھتی تھیں اور ان کو مل سکتی تھیں' ان سے جو ہندی کے ممتاز اور مستند لکھنے والوں نے پریم چند اور ان کی تخلیقات سے متعلق سپرد قلم کی ہیں' جن تک اردو داں طبقہ کی رسائی کم ہے۔'' 3

رشید احمد صدیقی کی اس سند اور قبولیت عام سے قطع نظر جب اس کتاب کے عنوانات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قمر رئیس نے موضوع کو کس قدر وسیع تناظر میں پیش کیا ہے۔ کوئی عام اسکالر ہوتا تو شاید پریم چند کی حیات اور ان کی روایت کا مختصراً ذکر کر کے ان کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کر دیتا۔ مگر قمر رئیس نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے پریم چند کے سوانحی حالات اور ناولوں کے تنقیدی مطالعے کے علاوہ بڑے تفصیل کے ساتھ ذہنی اور فکری پس منظر کو بیان کیا ہے اور اس پس منظر کے ذیل میں انہوں نے تین ضمنی عنوانات قائم کئے ہیں جن میں عام اقتصادی حالات، مذہبی اور سماجی اصلاحات اور قومی بیداری اور سیاسی جدوجہد شامل ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے فن اور فکر کا ورثہ کے تحت ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے کارناموں اور ان کی تصنیفات کے پس منظر اور محرکات بیان کیے ہیں۔ ایک مکمل باب زبان اور طرز بیان سے متعلق ہے جس میں ناولوں کے زبان و بیان کے عہد بہ عہد ارتقا کو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں اظہار بیان کی خصوصیات کو واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور ظرافت نگاری کے آئینے میں جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ آخری باب میں ناول نگار کی حیثیت سے پریم چند کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے پس منظر، فکر و نظر اور تصور فن اور فن کی روشنی میں پریم چند کو ایک عظیم ناول نگار قرار دیا گیا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے باب میں قمر رئیس نے پریم چند کے سوانحی حالات بیان کیے ہیں۔ اس میں ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند کے گھرانے کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے۔ دراصل پریم چند کے والد منشی عجائب لعل ڈاک خانے میں ملازمت کرتے تھے اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کھیتی باڑی سے بھی وابستہ تھے۔ پریم چند کا بچپن اس دور اور ان کے نجی حالات کے مطابق روایتی انداز سے گزرا۔ بچپن میں نہ تو وہ بہت غیر معمولی یا نمایاں شخصیت کے مالک تھے اور نہ ہی بہت خاموش طبع یا تنہائی پسند تھے بلکہ وہ اپنے چچازاد بھائیوں اور دیگر ہمجولیوں کی مانند ایک عام لڑکے تھے۔ البتہ ایک انفرادیت ان سے ضرور وابستہ تھی وہ یہ کہ، وہ کسی بھی صورت میں سچ اور حق کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ بچپن کی بعض شرارتوں پر جب ان کی گرفت ہوئی تب انہوں نے کذب وافترا سے خود کو بچا لینے کی بجائے حقیقت بیان کر کے جرم قبول کرنے کو ترجیح دی۔ پریم

چند کا سارا بچپن بنارس کے ایک گاؤں ''لمہی'' میں گزرا جہاں انہوں نے گاؤں کی زندگی، کھیتوں سے جڑے ہوئے انسان کے مقدرات، موسم برسات سے لگی ہوئی کسانوں کی آس، ان کی غربت اور مجبوریوں اور ساہوکاروں کے رویوں کو بڑے قریب سے دیکھا۔ ان کی اپنی گھریلو زندگی بھی تنگ دَتی میں ہی گزری تھی۔ تعلیم کا سلسلہ ایک مولوی صاحب کے یہاں اردو اور فارسی سے شروع ہوا۔ بچپن میں ہی ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ماں کی ممتا سے محرومی کے ساتھ ساتھ سوتیلی ماں کے رویے نے بھی ان کے ذہن پر برا اثر ڈالا تھا۔ قمر رئیس نے بچپن اور ابتدائی تعلیم کے ذکر کے بعد ان کی ملازمت، شادی، سب ڈپٹی انسپکٹری، تبادلہ، مدرسی کا نیا دور، گورکھپور میں قیام، ملازمت سے استعفیٰ کے بعد کے حالات، ممبئی کی ملازمت اور پھر ان کی بیماری سے لے کر وفات تک کا ذکر بہت تفصیل اور دلائل کے ساتھ کیا ہے۔ ذہنی اور فکری پس منظر کے باب میں قمر رئیس نے اس صورتحال کو پیش کیا ہے جن سے پریم چند نے اپنے ناولوں اور کہانیوں کے لئے مواد حاصل کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ پریم چند کی تحریروں کا موضوع خود ان کا عہد اور زندگی ہے۔ پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت پورے ملک میں اور خاص طور پر گاؤں دیہات میں عجیب وغریب قسم کی مجبوریوں کا سایہ تھا۔ مغربی تہذیب ہندستان کی روایتی سوچ پر دستک دے رہی تھی مگر مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا تھا۔ صنعتوں کا پھیلاؤ شروع ہوگیا تھا لیکن ان کی برکتوں کا دائرہ مخصوص طبقے تک محدود تھا۔ علی گڑھ تحریک اور مختلف دوسری تحریکوں کے سبب عوام کا سیاسی شعور بیدار ہونے لگا تھا لیکن سماج کی فلاح و بہبود کے لئے ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی تھا۔ اس پس منظر میں پریم چند نے لکھنا شروع کیا۔ قمر رئیس نے اقتصادی، مذہبی، سماجی اور سیاسی حالات کا مفصل جائزہ لینے کے بعد اس وقت تک کے تین اہم ناول نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر شامل ہیں۔ نذیر احمد کے فن کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنے کے بعد قمر رئیس اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

'' نذیر احمد کے تبلیغی انداز نظر اور اخلاقی نظریات نے ان کے فن کو ابھرنے یا نکھرنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کا فن ان کے مقاصد کا پابند ہے۔ قاری کو ہر لحظه یه خیال رہتا ہے که مصنف اسے کوئی اخلاقی درس دے رہا ہے۔ اور اپنے مقصد کے حصول کے

لئے قصے کے اشخاص اور واقعات کو ایک معینہ اور جانی بوجھی سمت میں لیے جارہا ہے .... نذیر احمد کے ناولوں میں یہی کمزوری سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اخلاقی اور مذہبی تصورات ان کے ذہن پر اس اس درجہ حاوی ہیں کہ نہ صرف ان کے اشخاص کے کردار گفتار پر اس کی چھاپ ہے بلکہ وہ کرداروں کے نام بھی ان کے مخصوص اخلاقی او صاف کی مناسبت سے رکھتے ہیں۔" 4

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے حوالے سے انہوں نے کہا:

" نذیر احمد اردو ناولوں کو جو نہ دے سکے وہ سرشار نے دیا۔ سرشار کا زمانہ اگرچہ نذیر احمد سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن دونوں کے مزاج میں جو بنیادی فرق تھا۔ زندگی ' ماحول اور حالات میں جو تفاوت تھا اس نے دونوں کے فن کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ دیا ہے۔ نذیر احمد مولوی اور واعظ تھے۔ سرشار مست ولاؤ بالی ...... نذیر احمد کے سامنے دلی کے اجڑے ہوئے مسلمان گھرانے تھے۔ سرشار کی نظر لکھنؤ کے ہر محلہ' کوچہ اور ہر طبقہ پر تھی۔ نذیر احمد کے مذہبی اور اخلاقی عقائد اشخاص کے لطیف اور نازک جذبات کو دیکھنے اور دکھانے کے مانع رہے۔ سرشار کی رند مشربی نے ہر قسم کے جذبات کو ایسی گرم جوشی سے لبیک کہا کہ مذہب اور اخلاق منہ تکتے رہ گئے۔" 5

قمر رئیس نے پریم چند کا فکری پس منظر بیان کرتے ہوئے نذیر احمد اور سرشار کے باہم فطری اختلاف کو واضح کیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالحلیم شرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سرشار کے ناول بھی نذیر احمد کے ناولوں کی طرح چند اصلاحی مقاصد کے حامل ہیں لیکن شرر اس نکتہ سے ناآشنا تھے کہ خواہ مقصد کتنا ہی اعلیٰ ہو اس کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب اسے ایک دلچسپ اور دلکش پیرایہ میں پیش کیا جائے۔ دلچسپی کا یہ عنصر ایک طرف تو وہ شاعرانہ زبان

وبیان، برجستہ مکالموں اور منظر نگاری سے پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف عشق ومحبت کی واردات اور جرأت وجانبازی کے واقعات سے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے ناولوں میں عہد سلف کے مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی بلندی اور اس کے مقابلہ میں عیسائی قوم کا معاشرتی اور اخلاقی زوال پس منظر کا کام کرتا ہے۔ اور ان کا پلاٹ عشق ومحبت کے واقعات اور دلیری وجانبازی کے کارناموں سے ہی بنا جاتا ہے۔ یہ رومانی عناصر قاری کے شوق وجنس کو مہمیز کرتے ہیں اور اس کی دلچسپی کو قائم رکھنے کا وسیلہ ہوتے ہیں۔'' 6

قمر رئیس نے مذکورہ بالا تین ناول نگاروں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے تاہم یہاں مرزا ہادی رسوا کی کمی محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ رسوا کا ناول امراؤ جان ادا فنی و تکنیکی اعتبار سے جس قدر مکمل اور پختہ ناول ہے اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس میں کرداروں کی تحلیل نفسی کے بھی شاندار نمونے موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پریم چند کا ناول 'بازار حسن' انجم کسمنڈوی کے ناول نشتر اور رسوا کے ناول امراؤ جان ادا سے متاثر ہے۔ لہٰذا نذیر، سرشار اور شرر کے ساتھ رسوا کا بھی تفصیلی ذکر کیا جاتا تو یہ باب مزید وقیع ہوسکتا تھا۔

اگلے باب میں قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کا محاکمہ کیا ہے۔ انہوں نے ان ناولوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور اس کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ پہلے دور میں پریم چند کے ابتدائی ناول اسرار معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوۂ ایثار اور بیوہ کو شامل کیا ہے۔ دوسرے دور میں بازار حسن، گوشہ عافیت، نرملا اور غبن پر بحث کی ہے جبکہ تیسرے دور کے ناولوں میں چوگان ہستی، پردہ مجاز، میدان عمل، گئودان اور منگل سوتر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ یہ آخری دور کے ناول پریم چند کے پختہ فکر کے ترجمان ہیں۔ قمر رئیس نے ناولوں کو ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ پہلے دور کی بہ نسبت دوسرے دور کے ناولوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو زیادہ موثر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے جبکہ تیسرے دور تک پہنچتے پہنچتے پریم چند کے غور وفکر کا انداز کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ ہوگیا تھا اور انہوں نے یہ شدت سے محسوس کرلیا تھا کہ ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کی خوشحالی کا راز محض بیرونی طاقتوں سے نجات

میں پوشیدہ نہیں ہے بلکہ انہیں پہلے اندرونی طاقتوں یعنی سیٹھ ساہوکاروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے شکنجے سے آزاد کرانا ضروری ہے۔ ان کی تحریر میں جتنی سادگی اور روانی پائی جاتی ہے وہ اپنے اندر معنی اور مفاہیم کی اتنی ہی وسعت رکھتی ہے۔ سیدھے سادے لفظوں اور جملوں میں اثر انگیزی کا کمال ان کے ناولوں کا ایک وصف ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند کے تمام ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی سنہ اشاعت کی بھی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے اپنے بیانات کی تصدیق رسالہ ہنس، جاگرن اور زمانہ کے حوالوں سے کی ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند کے افراد خانہ، ان کے احباب اور خود پریم چند کے مضامین اور خطوط کے ذریعے اپنے خیالات اور تحقیقی نکات کو مزید موثر اور مستحکم بنایا ہے۔ انہوں نے ناولوں کے زبان و بیان کے ارتقا اور اظہار و بیان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناول چونکہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے اس میں واقعات کے انداز بیان، مناظر کی پیش کشی اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ظرافت نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں میں ان خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ پریم چند کے تصور فن اور فن کا ذکر کرتے ہوئے قمر رئیس نے لکھا ہے کہ:

> ''پریم چند نے بعض مضامین میں ''فن برائے فن'' کو ادبی تخلیق کا اعلیٰ ترین معیار قرار دیا ہے اور فن کی اپنی جمالیاتی قدروں کو مانا ہے لیکن اس کی توضیح کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آرٹ ہر زمانہ میں ابلاغ اور تبلیغ کا وسیلہ رہا ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق اور اشاعت میں کچھ افادی قدریں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ یہ افادیت تخلیق کی حسن کاری اور اس کی جمالیاتی وحدت میں توانائی، صحت اور عظمت کے عناصر پیدا کردیتی ہے۔'' 7

دراصل پریم چند کی تحریروں سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان کے فن کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ ہوتا گیا اور ان کی حقیقت نگاری کی دھار تیز سے تیز تر ہوتی گئی تھی۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ پریم چند نے حقیقت نگاری پر مبنی اپنے فنی نمونے اس دور میں پیش کیے جب رومانویت کا غلبہ تھا۔ لفظوں کی صنعت گری، خوبصورت بیانات اور تشبیہات و استعارات کی مرصع سازی کو اہمیت حاصل تھی۔ ایسے دور میں پریم

چند نے موضوع اور مواد کو اہمیت دے کر سماجی حقیقت نگاری کی روایت قائم کی اور یہ مضبوط و توانا روایت پورے عہد پر اثر انداز ہوئی۔ اسی بنا پر قمر رئیس نے اپنی اس یادگار تصنیف کو ان تجزیاتی جملوں پر ختم کیا ہے:

> ''نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کی قدروں کی ترجمانی کی بلکہ نئی اقدار کو جنم دینے کا اعلیٰ فرض بھی انجام دیا۔ اپنے لاکھوں قارئین کو انہوں نے نیکی اور بدی یا خوب وزشت کا ایک نیا شعور بخشا۔ فنی اعتبار سے انہوں نے اردو ناول کو حقیقت نگاری کی جن روایات سے روشناس کرایا وہ آج بھی اس کا بلند ترین معیار ہیں۔ انہوں نے نذیر احمد' سرشار اور شرر کی روایات کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ انہیں وسعت' معنویت اور گہرائی عطا کی۔ نذیر احمد کی مقصدیت ' سرشار کی وسعت نظر اور شرر کی منظر کشی اور شائستہ زبان پریم چند کے ناولوں میں اپنی انتہائی ترقی پذیر اور نکھری ہوئی صورت میں ملتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ناول اردو کے افسانوی ادب کا سب سے گرانقدر سرمایہ ہیں۔''8

درج بالا مطالعے اور مصنف کے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں یہ کہنا قطعی بے جا نہ ہوگا کہ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' پریم چند کے بارے میں اردو میں ایک بنیادی کتاب ہے۔ پریم چند پر اردو میں لکھی گئی کتابوں میں پروفیسر جعفر رضا (الہٰ آباد) کی کتاب ''پریم چند کہانی کا رہنما'' کو بھی کافی اہم مقام حاصل ہے لیکن اس کا بیشتر سروکار پریم چند کی کہانیوں سے ہے جبکہ قمر رئیس کے موضوع کا تعلق ان کے ناولوں سے ہے۔ جعفر رضا کی کتاب کا پہلا اڈیشن قمر رئیس کی کتاب کی اشاعت کے ٹھیک دس برس بعد یعنی 1969ء میں منظر عام پر آیا۔ قمر رئیس نے اپنی کتاب میں نہ صرف پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے بلکہ بے شمار حقائق کی تصدیق و توثیق بھی کی ہے۔ مصنف نے کسی بھی بات کا پتہ لگانے کے لئے شواہد کے قریب سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس کی پیش کش میں اپنی بصیرت اور وسعت نظر کو بروئے کار لایا ہے۔ نتیجے کے طور پر دنیائے ادب کو ایک ایسی کتاب میسر ہوئی جو پریم چند پر کام کرنے والے کسی بھی محقق کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتی ہے۔

قمر رئیس نے 1960ء میں ''مضامین پریم چند'' شائع کی۔ ابھی ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' کو شائع ہوئے ایک برس بھی نہ ہوا تھا۔ عام قاری اور نقاد اسی تحقیقی تصنیف کے حقائق کے ادراک کی کوشش کر رہے تھے کہ پریم چند کے سلسلے میں مزید ایک معرکتہ الارا کتاب قمر رئیس نے شائع کی۔ جس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے۔

پریم چند کے لکھے گئے جن مضامین کو قمر رئیس نے اس مجموعہ میں شائع کیا ہے وہ تمام کے تمام قدیم رسالوں زمانے، تاج، ہنس، پیام، آجکل وغیرہ سے اخذ کئے گئے ہیں اور یہ تمام مضامین قمر رئیس نے اپنے مقالے کے لئے مواد کی تلاش وتنقید اور تعبیر وتحلیل کے سلسلے میں اکٹھا وجمع کئے لیکن ان کی افادیت واہمیت کی وجہ سے انہوں نے فوری مرتب وشائع کیا۔

پریم چند کے ان مضامین میں اُن کے عہد کا سارا ہندوستان سمٹ آیا ہے۔ سیاسی حالات، ادبی صورتحال، دوست واحباب کی نگارشات، اور اُن سب سے زیادہ اُردو ادب اور پریم چند کی فکری اساس ان مضامین کا حصہ بنے ہیں۔ پریم چند نے اپنے مضامین میں فکشن، ترقی پسندی، مختصر افسانے کا فن، نفسیاتی حقیقت نگاری اور افسانہ کی تکنیک وغیرہ کا اپنے مضامین میں بیان کیا ہے۔ پریم چند اپنے عہد میں افسانے کی تکنیک میں روز بروز تبدیلی کا بیان کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''آج کل کہانی نئے نئے طریقوں سے شروع کی جاتی ہے۔ کہیں دو دوستوں کی باہمی گفتگو سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور کہیں پولس رپورٹ کے ایک ورق سے۔ تعارف (کرداروں کا) بعد میں ہوتا ہے۔ یہ انگریزی (مغربی) افسانہ نگاری کی نقل ہے۔ اس سے کہانی غیر ضروری طور پر پیچیدہ اور مشکل ہوجاتی ہے۔ یورپ کی دیکھا دیکھی خطوں، ڈائریوں یا ذاتی یادداشتوں کے ذریعہ بھی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ میں نے خود بھی ان تمام طریقوں سے افسانے لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان سے کہانی کی

روانی میں رکاوٹ ہوتی ہے۔" 9

پریم چند نے اس مضمون میں افسانوں میں اپنائی جانے والی مختلف تکنیکوں کا بیان کیا ہے۔ اس اقتباس کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خود پریم چند نے افسانے کی مختلف تکنیک میں طبع آزمائی کی لیکن بیانیہ ہی اُن کا پسندیدہ تکنیک تھی۔ اپنے ایک دوسرے مضمون میں "مختصر افسانے کا فن" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ افسانہ میں کرداروں کی تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی فطری مصوری ضروری ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کے حقائق کی فطری مصوری کو ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے۔ اس میں تخیئلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تجربات ہی تخلیقی تخیئل سے دلچسپ ہوکر کہانی بن جاتے ہیں لیکن یہ سمجھنا بھول ہوگی کہ کہانی زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔ حقیقی زندگی کی تصویر تو انسان خود ہوسکتا ہے۔ مگر قصے کے اشخاص کے خوشی وغم سے ہم جتنا متاثر ہوتے ہیں اتنا حقیقی زندگی سے نہیں ہوتے جب تک کہ وہ خود اپنی ذات سے متعلق نہ ہو۔ کہانیوں میں کرداروں سے ہمیں ایک ہی دو منٹ کے تصارف میں اپنائیت کا احساس پیدا ہوجاتا ہے اور ہم ان کے ساتھ ہنسنے اور رونے لگتے ہیں۔" 10

پریم چند نے اپنے اس مضمون میں مختصر افسانے کے فن پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ پتے کی بات لکھی ہے کہ کہانی زندگی کی حقیقی تصویر نہیں ہوسکتی اور یہ حقیقی تصویر پریم چند کی رائے میں خود انسان کی تصویر کشی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح پریم چند نے اپنے ایک مضمون میں نفسیاتی حقیقت اور افسانے میں اُن کی پیش کش پر اظہار خیال کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اعلیٰ ترین مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی جائے۔ نیک باپ کا نالائق اولاد کی زبوں حالی میں رنجیدہ ہونا ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ اس جذبہ میں باپ کی ذہنی ہیجانی کیفیات اور اس کے مطابق اس کے

ردِ عمل کی مصوری بھی افسانہ کو موثر اور پر کشش بناسکتی ہے۔ برا شخص بالکل ہی برا نہیں ہوتا۔ اس میں کہیں فرشتہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی حقیقت ہے۔ اس پوشیدہ یا خوابیدہ فرشتہ کو اُبھارنا اور اس کا سامنے لانا ایک کامیاب افسانہ نگار کا شیوہ ہے۔ پے درپے مشکلات پیش آنے پر انسان کتنا دلیر ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ وہ بڑے سے بڑے خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے خم ٹھونک کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کا خوف جاتا رہتا ہے۔ اس کے دل کے کسی گوشہ میں پوشیدہ جوہر نمایاں ہوجاتے ہیں اور ہمیں متعجب کردیتے ہیں۔ یہ ایک انسانی حقیقت ہے۔'' 11ے

پریم چند کے مضامین اور خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

''پریم چند نے اپنے مضامین اور خطوط میں کہیں بھی اس پر زور نہیں دیا کہ افسانہ میں سماجی، سیاسی یا اخلاقی مسائل پیش کئے جائیں۔'' 12ے

پریم چند نے جو خطبہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی افتتاحی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں پڑھا تھا اُس میں انہوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ موضوعات بھی بدل گئے ہیں اور اب ادیبوں کو مزدوروں کی ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیوں کا بیان کرنا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں اپنے عہد کے ادب کی کسوٹی پر کھرا اترنے والے فن کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور روشنی پیدا کرے۔'' 13ے

''مضامین پریم چند'' ہندوستان کے سب سے اہم افسانہ نگار کے لکھے ہوئے مضامین ہیں جن کے پڑھنے سے اُردو ادب میں فکشن کے تشکیلی دور کے تمام اہم رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ادب کی ہلچل اور اُس کے ارتقاء کا بھی علم ہوتا ہے۔

مضامین پریم چند کے بعد قمر رئیس نے ''پریم چند فکر و فن'' صد سالہ جشن پریم چند کے موقع پر لکھی۔ اسے دسمبر 1980ء میں پبلی کیشنز ڈویژن' وزارت اطلاعات ونشریات' حکومت ہند نے شائع کیا۔ اس کتاب کے حرف آغاز میں پروفیسر قمر رئیس کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' ضرورت اس کی تھی کہ آج کی بدلتی ہوئی زندگی اور نئے افکار واحساس کی روشنی میں پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا اور ان کے فکر و فن کی سچائیوں کو' ان کی معنویت کو 'نئی پود کے قارئین سے متعارف کرایا جا تا۔آج پریم چندکے اندازواسلوب میں لکھنا پریم چند کی قدر شناسی نہیں ہے۔ہاں ان کی روایت کو سمجھ کر عصری حقیقتوں کی ترجمانی کے لئے تخلیقی اظہارکی نئی راہیں ڈھو نڈنا 'نئے اسالیب وضع کرنا'ان کی روایت کا احترام ہی نہیں 'اس کی توسیع کے مترادف ہوگا۔
>
> اردو میں پریم چند کی حیات اور کارناموں کے بارے میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں' ان میں سے بعض نایاب ہیں۔ کچھ بہت ضخیم ہیں اور بعض کی قیمت زیادہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب کے اوراق میں پریم چند کی سوانح اور ان کے ذہنی اور تخلیقی سفر کا ایک ایسا مختصر لیکن جامع خاکہ مرتب ہوجائے کہ وہ ادب کے عام قارئین اور طلبہ دونوں کے لئے مفید ہوسکے اور وہ کم سے کم وقت میں' اردو ادب میں' پریم چند کے کارنامہ کی حقیقی قدروقیمت سے روشناس ہوسکیں۔'' 14

محض سو صفحات کی اس کتاب میں قمر رئیس نے پریم چند کی پوری زندگی اور ان کے دور کی سیاسی وسماجی صورتحال کی مکمل عکاسی کی ہے۔قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں یا افسانوی مجموعوں کو الگ الگ موضوع بحث نہیں بنایا ہے بلکہ پریم چند کے ان افکار اور نظریات کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے جن کے تحت پریم چند کی تخلیقات منظر عام پر آئیں۔قمر رئیس نے اپنی عام روش برقرار رکھتے ہوئے ''پریم چند فکر و فن'' میں بھی بدلتی ہوئی زندگی اور نئے افکار

واحساس کے تجزیاتی مطالعے کو بڑی اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ فنکار جب بھی کوئی تخلیق پیش کرتا ہے تو وہ اپنے سماج اور معاشرے کے اثرات سے بچ نہیں پاتا ہے۔ سماجی عوامل اور اس کے اطراف پیش آنے والے واقعات فنکار کو متاثر کرتے ہیں جس کا اظہار وہ فطری طور پر اپنے فن میں کرتا ہے۔ قمر رئیس نے اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا۔ ہے جن کے عنوانات خود اپنے مواد کا پتہ دیتے ہیں۔ ابواب حسب ذیل ہیں:

1. سفر کی منزلیں
2. گاندھی واد سے سماج واد تک
3. فرقہ وارانہ ہم آہنگی
4. تصور حیات اور
5. پریم چند کی روایت

''سفر کی منزلیں''، میں پریم چند کی پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ ان کا ایک بہترین سوانحی خاکہ بن گیا ہے۔ پریم چند کی پیدائش کہاں ہوئی' ان کا بچپن کس ماحول میں گزرا' انہوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی' والد کی دوسری شادی کے ان پر کیسے منفی اثرات ہوئے' وہ بنارس سے گورکھپور کیوں گئے' پریم چند جب نویں کلاس کے طالب علم تھے اور ان کی عمر صرف پندرہ برس تھی تو ان کے والد نے ان کی شادی کردی' پھر ملازمت کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے کس کس طرح سے روزگار حاصل کئے۔ منشی دھنپت رائے کس طرح نواب رائے بنے اور پھر انہوں نے اپنا نام پریم چند رکھ لیا۔ اس کے بعد 1906ء میں ایک کائستھ بال بیوہ شورانی دیوی سے دوسری شادی کی۔ پریم چند اردو میں لکھتے لکھتے ہندی کی طرف کب اور کیونکر مائل ہوئے' تحریک آزادی میں انہوں نے کیسے حصہ لیا' ممبئی پہنچ کر فلمی دنیا سے ان کا کیسا سابقہ رہا اور پھر ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں انہوں نے کیسا کلیدی کردار ادا کیا اور پھر کس طرح وہ سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ ان تمام پہلوؤں کا ذکر ''سفر کی منزلیں''، میں موجود ہے۔ اختصار کی وجہ سے واقعات کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ زندگی کے کسی واقعے کی نامکمل اطلاع ملتی ہو۔ اس باب میں پریم چند کی ابتدائی تکلیفوں کو بیان کرتے ہوئے

قمر رئیس لکھتے ہیں:

"والد کی موت کے بعد زندگی کی ذمہ داریاں اور ضرورتیں، محرومیاں اور اذیتیں ایک خوفناک اژدہے کی طرح منہ پھاڑے ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ کسی طرح انہوں نے یہ دن گزارے اور دسویں جماعت کا امتحان پاس کرلیا۔ آگے پڑھنے اور ایم اے کرنے کی دھن تھی لیکن سارے راستے بند تھے۔ ایک سفارشی خط کے ساتھ انٹر میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اب اپنا اور گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لئے نوکری کی تلاش ہوئی لیکن بغیر سعی وسفارش کے نوکری ملنا آسان نہ تھا۔"15ے

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس اپریل 1936ء منعقدہ لکھنؤ میں پریم چند کے دیے گئے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے قمر رئیس نے لکھا ہے کہ:

"سماجی اونچ نیچ، استحصال، ذات پات کی ظالمانہ تفریق، غلامی اور غریبی کے خلاف پریم چند کا یہی دردمندانہ احساس اور جذبۂ احتجاج تھا جو آخر وقت تک ان کی تحریروں میں موج خون کی طرح موجزن رہا۔ اپنے خطبہ میں پریم چند نے ادیب کے تعلق سے جو باتیں کہی ہیں، جو آدرش سامنے رکھے ہیں وہ خود بھی ساری زندگی عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے بھی ان ہی مقاصد کو سامنے رکھا تھا۔ اس لئے پریم چند جب تک زندہ رہے بڑی سرگرمی سے اس تحریک کو فروغ دینے کی جدوجہد کرتے رہے۔"16ے

قمر رئیس نے پریم چند کے انتقال کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اکتوبر 1936ء کے پہلے ہفتہ میں ان کی بیماری اور تکلیف نے شدت اختیار کرلی۔ اپنے قریبی دوستوں دیا نرائن نگم اور جینند کمار کو انہوں نے بلوایا۔ ان سے باتیں کیں۔ جینند کمار

نے لکھا ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیوں میں انہیں جتنی فکر بیوی اور بچوں کی تھی اتنی ہی ہنس اور ادب کے مستقبل کی تھی۔ آخر کار وہ گھڑی آگئی جب اپنے 'وطن' اپنے ملک کے عوام' انسانیت اور ادب سے والہانہ پیار کرنے والے اس ادیب کی زبان اور اس کا علم ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا...... 8 اکتوبر 1903ء کو ان کے پہلے ناول 'اسرار معابد' کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی اور 8 اکتوبر کو ہی ان کا قلم ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس طرح ایک ایسے ادیب کا سفر حیات ختم ہوا جس کی آواز ہندستانی عوام کی آواز تھی۔" 17ے

دوسرے باب ''گاندھی واد سے سماج واد تک'' میں قمر رئیس نے پریم چند کے گاندھیائی اصولوں سے زبردست وابستگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے ابتدائی ناولوں میں سرسید تحریک اور آریہ سماجی تحریک کے اثرات تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کا چونکہ براہ راست معاملہ عوام سے تھا اس لئے پریم چند نے بھی انھیں شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیا۔ ان دونوں تحریکوں نے سماجی پستی کے خلاف آواز بلند کی اور عوام کے وقار کو بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کوششوں کا تعلق سماجی بیداری، تعلیمی بیداری اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے تئیں بیداری سے تھا۔ ان بیداریوں کے ثمر بار ہونے کی اُمید تبھی کی جاسکتی تھی جب انسان کو سامراجی قوتوں کے شکنجے سے آزاد ہوکر اپنے انداز کی زندگی گزارنے کا موقع حاصل ہو۔ یہ سامراجی قوتیں غیر ملکی حکمراں کی صورت میں بھی تھیں اور مقامی زمینداروں اور جاگیرداروں کی صورت میں بھی۔ ہندستان کے حالات ایسے تھے کہ یہاں کے عوام کو دونوں قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو غیر ملکی قوتوں سے محفوظ رہنا پھر بھی ممکن تھا لیکن مقامی جاگیرداروں کے شکنجے سے رہائی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔ پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اس نظام کے خلاف اپنا احتجاج ظاہر کیا۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

"پریم چند اپنے معاصرین سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ ان کی وطن پرستی اپنے وطن اور اپنے اسلاف کی عظمت کے گن گانے تک محدود نہیں تھی۔ وہ اپنے وطن کے کروڑوں محکوم

مظلوم اور غریب انسانوں کے مقدر سے اپنے وجود کو وابستہ سمجھتے تھے۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام کے تضادات اور اس کے جبرو استحصال کی ہمہ گیر مشین کو انہوں نے اپنے بہت سے معاصرین کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھا اور درد مندی کے ساتھ سمجھا تھا اور اس سے ان کا سماجی اور سیاسی شعور ابتداہی سے زیادہ بالیدہ اور تیکھا ہوگیا تھا۔ ان کے پہلے مجموعہ ''سوز وطن'' 1908ء کی ایک کہانی کا ہیرو جب ایک مدت کے بعد امریکہ سے اپنے وطن واپس آتا ہے اور اپنے آبائی گاؤں کی طرف جاتا ہے تو برطانوی عہد کی تباہی اور تاراجی کا ایک عجیب منظر وہ دیکھتا ہے۔

'میں گاڑی سے اترا تو میرا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ اب اپنا پیارا گھر دیکھوں گا۔ اپنے بچپن کے پیارے ساتھیوں سے ملوں گا ...... جوں جوں میں گاؤں کے قریب آتا تھا میرے قدم جلدی جلدی اٹھتے تھے۔ ہر چیز پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نگاہ ڈالتا۔ آہا' یہ وہ نالہ ہے جس میں ہم روز گھوڑے نہلاتے اور خود غوطے لگاتے تھے۔ مگر اب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چہاردیواری کھینچی ہوئی تھی اور سامنے ایک بنگلہ تھا جس میں دو تین انگریز بندوقیں لئے ادھر اُدھر تاک رہے تھے۔ نالے میں نہانے یا نہلانے کی قطعی ممانعت تھی۔ گاؤں میں گیا۔ اور نگاہیں بچپن کے ساتھیوں کو ڈھونڈنے لگیں مگر افسوس وہ سب کے سب لقمۂ اجل ہوگئے تھے۔ اور میرا گھر۔ میرا شکستہ جھونپڑا۔ جس کی گود میں برسوں تک کھیلا تھا۔ جہاں بچپن اور بے فکری کے مزے لوٹے تھے ...... وہ اب ایک تودۂ خاک ہوگیا تھا۔ مقام غیر آبادنہ تھا۔ صدہا آدمی چلتے پھرتے نظر آئے جو عدالت اور کلکٹری اور تھانہ پولیس کی باتیں کررہے تھے۔ ان کے چہرے سے تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی۔

اس برگد کے پیڑ کی طرف دوڑا جس کے خوشگوار سائے

میں ہم نے بچپن کی بہاریں اڑائی تھیں۔ جوہمارے چھپنے کا گہوارہ اور عالم جوانی کی آرام گاہ تھا۔ آہ' اس پیارے برگد کو دیکھ کر دل پر ایک رقت طاری ہوگئی اور ایسی ایسی حسرتناک' دل سوز اور درد ناک یادیں تازہ ہوگئیں کہ گھنٹوں زمین پر بیٹھ کر روتا رہا ...... اس برگد کے درخت کے قریب اب تھا نہ تھا۔ اور درخت کے نیچے ایک کرسی پر کوئی لال پگڑی والے دست بستہ کھڑے تھے اور ایک نیم برہنہ قحط زدہ شخص جس پر ابھی ابھی چابکوں کی بوچھار ہوئی تھی' پڑاسسک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔برطانوی نوآبادیاتی نظام میں ہندوستانی گاؤں کی تباہی کی یہ تصویر پریم چند نے 1908ء میں پیش کی تھی۔ اس کے بعد ہی انہوں نے بے غرض محسن اور صرف ایک آواز جیسی کہانیوں میں کسانوں پر زمینداروں کے مظالم اور چھوت چھات کی لعنت کے خلاف آواز بلند کی۔''18؎

قمر رئیس نے پریم چند کے بعض خطوط' ان کے مضامین کے اقتباسات اور ان کے بارے میں بعض دانشوروں کی رائے کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ پریم چند تحریک آزادی کے بیش تر سرگرم عمل قائدین کے نظریات سے اتفاق رکھتے تھے۔اور وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھتی تھیں اور احتجاج جلسوں جلوسوں کا انعقاد ہوتا تھا پریم چند اس کی حمایت کرتے تھے۔اس حوالے سے قمر رئیس لکھتے ہیں:

'' پریم چند نے مہاتما گاندھی کے کارناموں اور جنگ آزادی میں ان کی قیادت کا اعتراف کئی موقعوں پر کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے مظلوم کسانوں' مزدوروں اور ہریجنوں کی نجات اور بہتری کے لئے جو اقدامات کئے یہ کام وہ پہلے ہی سے انجام دے رہے تھے اور اس طرح خود اپنے قول کے مطابق وہ گویا مہاتما گاندھی کے بنے بنائے فطری شاگرد تھے۔'' 19؎

پریم چند نے قومی سطح پر سامنے آنے والے مسائل اور معاملات میں بھی گاندھیائی فلسفے اور نظریے کی حمایت کی۔ معاملہ فرقہ پرستی کا ہو، قومی نظام تعلیم کے تعین کا ہو یا ہندی، اردو اور دیوناگری کا تنازعہ ہو، ان سبھی معاملوں میں وہ گاندھی جی کے حامی تھے۔ زبان کے معاملے میں ہم سب جانتے ہیں کہ گاندھی جی نے مسئلے کا حل یوں پیش کیا تھا کہ ہندی اور اردو کی بجائے ہندستانی زبان اختیار کی جائے جس کا رسم الخط دیوناگری بھی ہو اور اردو بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے سربراہوں کی مساعی کے نتیجے میں ہندستانی کی بجائے ہندی کو ملک کی قومی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ گاندھی جی کے ایسے نظریے بھی رہے ہیں جن سے پریم چند نے جزوی طور پر انحراف کیا ہے۔ مثلاً ہریجنوں کو حق دلانے کی مہم میں گاندھی جی نے انہیں مندروں میں داخلے کی عام اجازت دلانے پر کافی زور صرف کیا جبکہ پریم چند اس سے بڑھ کر ہریجنوں کو تعلیم، وظیفہ اور نوکریوں میں رعایت دلانے کی وکالات کرتے تھے۔ اسی طرح گاندھی جی کسی بھی مسئلے کی مارکسی تفسیر کے قائل نہیں تھے۔ وہ ہر معاملے کو اہنسا کے نظریے سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ گاندھی جی کے یہاں طبقاتی جنگ کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی جبکہ پریم چند طبقاتی کش مکش کو لازمی سمجھتے تھے۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے مقابلے میں سوشلسٹ سماج کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ 1933ء کے بعد گاندھی جی کے بعض فلسفے اور خیالات سے پریم چند کو مایوسی ہونے لگی تھی اور پریم چند کی ساری توجہ سماج واد پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ قمر رئیس نے پریم چند کی ان ذہنی تبدیلیوں کے حوالے سے پریم چند کے ایک سوانح نگار مدن گوپال کا یہ جملہ لکھا ہے کہ:

> " ان کے وجود میں گاندھی جی یا تو سو گئے تھے یا پھر ان کے من مندر میں بیٹھی ہوئی مہاتما جی کی مورتی اب وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اب وہ چاہتے تھے کہ بے انصافی کے خلاف پیکار کی جائے۔"[20]

اور پھر خود قمر رئیس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ:

> " اس انحراف کے باوجود پریم چند زندگی کے آخری لمحوں تک مہاتما گاندھی کو ہندوستان کا سب سے بڑا دانشور اور سب سے ممتاز اور محبوب قومی رہنما سمجھتے رہے۔ وہ

انھیں ہندوستانی عوام کے سماجی اور سیاسی نشاۃ ثانیہ کا معمار مانتے تھے۔"21ؔ

کتاب کا تیسرا باب "فرقہ وارانہ ہم آہنگی" ہے جس میں قمر رئیس نے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہندوستانی عوام میں تہذیبی شعور اور قومیت کے احساس کی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند کے غیر متعصب ذہنیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندستان میں بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں اور غالباً غیر ملکی حکمراں کی سازش کے نتیجے میں عوام وخواص نے ہندو اور مسلمان کے زاویے سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ قومیت کا تصور بھی بدلنے لگا تھا اور کسی ایک ملک میں بسنے والی آبادی کو ایک قوم قرار دیے جانے کے بجائے لوگ اپنے اپنے مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی قوم تصور کرنے لگے تھے اور جب قوم کا تصور مذہب سے وابستہ ہو گیا تو تعصب نے بھی جنم لینا شروع کیا۔ ہندستان میں جس ہندو مسلم مشترکہ تہذیب یا تہذیبی یگانگت پر فخر کیا جاتا تھا وہاں کی تہذیب "ہندو تہذیب" اور "مسلم تہذیب" کے خانوں میں تقسیم ہو گئی۔ مذہب کے نام پر امتیاز اور تفریق کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ہر دور میں چلتا رہا اور اس کے خلاف مثبت قوتیں بھی جا بجا اپنی ذمہ داریاں انجام دیتی رہیں لیکن انیسویں صدی کا سورج غروب ہونے کے بعد ہندستان میں بیداری اور انسان دوستی کی نئی لہر آئی اور بیسویں کے اوائل میں قلم کاروں، فن کاروں، دانشوروں اور سیاستدانوں سبھوں نے اپنے اپنے طور پر قوم کو متحد رکھنے اور مشترک پلیٹ فارم پر لانے کی کافی کوششیں کیں۔ قلمکاروں کی اس جماعت میں پریم چند کا نام خصوصی طور پر اہمیت کا حامل تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ان کی تحریریں ہندی اور اُردو دونوں حلقۂ قارئین کا احاطہ کرتی تھیں۔ انہوں نے سماج کا بڑا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور اپنے اسی مشاہدے کو اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے۔ قمر رئیس نے لکھا ہے کہ:

" پریم چند گاؤں کے ایک کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں ایک مولوی صاحب کے مکتب میں اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں وہ ایسے شہروں اور دیہاتوں میں رہے جہاں ہندومسلمان کی ملی جلی آبادی تھی۔ اس لئے پنڈت نہرو کی طرح انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے

اپنے وطن کے عوام کی تہذیبی زندگی کو دریافت کیا۔ ان کی بے شمار کہانیوں او ناولوں میں اس زندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ پریم چند کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ فرقہ واریت تہذیب کی خوبصورت قبا پہن کر ہی سامنے آتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک ایک مشترک ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی زبان پر زور دیتے رہے۔ صرف یہی نہیں وہ فرقہ پرستی اور تہذیب وتاریخ کے فرقہ پرستانہ تصور کے خلاف جہاد بھی کرتے رہے۔" 22ے

اور بقول دیا نرائن نگم:

" پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمان دونوں سے نالاں رہتے تھے اور تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔" 23ے

پریم چند کو یہ بھی ہمیشہ احساس رہا کہ ہندو اور مسلمانوں میں دوری کا ایک بڑا سبب آپس کی غلط فہمی اور ایک دوسرے کے عقائد سے عدم واقفیت ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف یہ کہ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی کہانیاں پیش کی ہیں بلکہ انہوں نے دونوں فرقوں کو قریب لانے کی بھی شعوری کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں اور ڈراموں میں ایسے کئی کردار پیش کیے ہیں جنہوں نے مصیبت و پریشانی کے وقت میں دوسرے مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھنے والے کی مدد کی ہے۔ ہندستان میں قومی زبان کے تنازعہ کے موقع پر بھی پریم چند نے جو تجاویز اور نظریے پیش کئے تھے وہ ان کی مشترکہ ہندستانی تہذیب اور قومی یک جہتی سے ان کے والہانہ لگاؤ کے مظہر ہیں۔ بقول قمر رئیس:

"پریم چند ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا جو عرفان رکھتے تھے وہ اردو کے بہت کم ادیبوں کے حصہ میں آیا ہے' انہوں نے ہندوستان کے سماجی' تہذیبی اور لسانی مسائل کا جو دانشمندانہ حل پیش کیا تھا اگر اس پر عمل ہوسکتا تو کم از کم آج ملک کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی اور ہورہی ہے۔" 24ے

چوتھے باب ''تصور حیات'' میں قمر رئیس نے زندگی کے بارے میں پریم چند کے نظریے کو پیش کیا ہے۔ پریم چند کا تصور حیات جاننے کے لئے قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کے کرداروں کا بھی تجزیہ کیا ہے اور خود پریم چند کے خطوط اور مضامین کی مدد سے بھی نتائج اخذ کئے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے پریم چند کا بچپن صحیح معنوں میں بڑا دردناک گزرا۔ پہلے تو ان کی والدہ کا انتقال ہوا' پھر سوتیلی ماں سے سابقہ رہا اور جب اپنا گھر بسا اور اولاد کی نعمت ہاتھ آئی تو وہ چیچک کی نذر ہوگیا۔ ان حالات سے پریم چند کا متاثر ہونا فطری امر تھا۔ وہ زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے قائل ہوگئے تھے۔ وہ زندگی کو صرف ناپائیداری ہی نہیں انتہائی نازک بھی تصور کرتے تھے۔ البتہ ان کا یہ اعتقاد رہا کہ زندگی لاکھ ناپائیدار اور کمزور سہی انسان کو ہمت کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے اور مزاحمت کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں پریم چند جہد مسلسل کے بھی قائل رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی کم عمری سے ہی کوئی نہ کوئی کام کرنا شروع کردیا تھا جو آخر عمر تک جاری رہا۔ ذریعہ معاش کی تدبیر کے ساتھ ان کا قلم بھی مستقل چلتا رہا۔ اس کے علاوہ وہ سماجی اور فلاحی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ پریم چند نے زندگی کو کھیل سے بھی تشبیہ دی ہے یعنی انہوں نے بعض جگہوں پر ہنستے کھیلتے ہوئے زندگی گزار دینے اور دنیا کو ایک ''تماشہ گاہ یا کھیل کا میدان'' سمجھنے کی وکالت کی ہے۔ گئودان تک پہنچتے پہنچتے پریم چند کا فلسفہ حیات تھوڑی سی کروٹ لیتا ہے اور وہ زندگی کو دوسروں کی زندگی سنوارنے اور بہتر بنانے میں صرف کردینے کے قائل نظر آتے ہیں اور اس طرح کہا جاتا ہے کہ زندگی کے بارے میں ان کا عقیدہ وہی ہوگیا تھا جو ٹالسٹائی اور گاندھی جی کا نظریہ حیات تھا۔ البتہ گاندھی جی اپنے نظریے کے مطابق مقصد حیات کی تکمیل تک رسائی کا ذریعہ اہنسا کو بناتے ہیں جبکہ پریم چند کہیں کہیں جائز مقاصد کی حصولیابی کے لئے تشدد اختیار کرنے کو بھی برا نہیں سمجھتے ہیں۔ بقول قمر رئیس:

> ''آخر عمر میں ان کے تصورات میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں اگر وہ ایک واضح صورت میں سامنے آجاتیں تو ان کے فلسفۂ حیات کی نوعیت بھی دوسری ہوتی اور ان کا فکری ارتقا اپنی تکمیل کی ایک درخشاں منزل تک پہنچ

جاتا ۔ ان تبدیلیوں کے نقوش ان کے آخری اور ادھورے ہندی ناول ''منگل سوتر'' اور ان مضامین میں دیکھے جاسکتے ہیں جو انہوں نے 1933ء سے 1936ء تک اپنے رسالے ''ہنس'' میں لکھے۔ ''منگل سوتر'' کا ایک کردار دیو کمار (جو بقول امرت رائے خود پریم چند کا اپنا کردار ہے) زندگی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ اس زاویہ نظر سے بہت مختلف ہے جس کی نمائندگی پریم چند کے دوسرے ناولوں میں ہوتی ہے۔ وہ انصاف اور سچائی کے قیام کے لئے تشدد کو بھی برا نہیں سمجھتا۔ انسان کی مظلومی اور اس کے دکھوں کو دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے ''یہاں دیوتا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔''[25]

زیرنظر کتاب کا آخری باب ''پریم چند کی روایت'' ہے جس میں پریم چند کے افسانے اور ناولوں کے تمام موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ پریم چند کے موضوعات غریب کسان، مزدور اور ان کی مجبوریاں ہیں لیکن ان موضوعات کو پریم چند نے کس کس مقام پر کس کس انداز میں برتا ہے، قمر رئیس نے مثالوں کے ذریعے اس کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ پریم چند کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں فن اور تکنیک کے بے شمار نادر اور اچھوتے تجربے کئے ہیں۔ حالانکہ انھیں کلّی طور پر بیانیہ تکنیک کا ادیب سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے یہاں بیانیہ تکنیک غالب ہے اور پریم چند کے موضوعات کے لئے بیانیہ سے بہتر کوئی تکنیک ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کی کہانیاں اور ناول ڈرامائی عناصر سے بھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے پلاٹ سے عاری کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ تحلیل نفسی کا عمل بھی کئی جگہ نظر آتا ہے۔

قمر رئیس نے پریم چند کے موضوعات اور ان کے نظریے کو بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان کے عہد کے لکھنے والے ہوں یا ان کے بعد کے ادیب ہوں اکثر بڑے فنکاروں کے یہاں پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور حتیٰ کہ ترقی پسند ادیبوں کرشن چندر، احمد ندیم

قاسمی، خواجہ احمد عباس اور اختر انصاری جیسے ادیبوں کے یہاں جمالیاتی اور رومانی انداز پایا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کے سب پریم چند کی روایت سے کلیتاً انحراف نہ کر سکے۔ راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، شوکت صدیقی کے یہاں کھلے طور پر پریم چند کی روایت کی پیروی ملتی ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند کی روایت کی توسیع و تعمیر میں حصہ لینے والے فنکاروں میں جیلانی بانو، جوگندر پال، اقبال متین، رام لعل، کلام حیدری، واجدہ تبسم، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، آمنہ ابوالحسن، کنور سین، عابد سہیل، سلام بن رزاق، الیاس احمد گدی، انور قمر، سید محمد اشرف، عبدالصمد، انور سجاد، سریندر پرکاش اور بلراج مینرا وغیرہ کو شامل کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''پریم چند سے وابستہ عصر حاضر کے ادیبوں کی تخلیقات میں زندگی اپنی پنہائی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ زیادہ کثیر الجہت، تہہ دار اور معنی خیز نظر آتی ہے .... واقعہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے فن کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان کی بنیادی سچائیوں تک رسائی حاصل کی بلکہ ہندوستانی ادب کو ایک ایسے جمالیاتی مذاق سے روشناس کرایا جو فن کی اعلیٰ ترین قدروں سے ہم آہنگ ہے۔'' 26؎

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کے فکر و فن پر لکھی گئی اس مختصر مگر جامع اور مبسوط کتاب میں قمر رئیس نے پریم چند کی مکمل خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کر دیا ہے جس سے ان کی شخصیت، فکر اور فن کو سمجھنے میں پوری طرح مدد ملتی ہے۔ قمر رئیس کی مرتبہ اس کتاب ''پریم چند فکر و فن'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ظ۔ انصاری نے کتاب کی جامعیت کی داد دی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''یہ کتاب...... ...... اپنے اختصار اور معنویت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ کم سے کم لفظوں میں بات کہنا اور کم سے کم ورق میں اتنی پھیلی ہوئی شش جہت شخصیت کو سمو لینا بڑا دشوار ہے۔'' 27؎

''پریم چند فکر و فن'' کے بعد قمر رئیس نے ایک مختصر کتابچہ ساہتیہ اکیڈیمی کے لیے ''پریم چند'' کے نام سے مرتب کیا جسے ساہتیہ اکیڈیمی، نئی دہلی نے 1981ء میں شائع کیا۔ 1983ء میں قمر رئیس نے پریم چند کی شخصیت اور

اُن کے فن پر مزید ایک تصنیف ''منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے'' مرتب وشائع کی اور 1991ء میں انہوں نے ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' شائع کئے۔

''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' کے شروع میں بیس صفحات پر مشتمل ایک مدلل تحقیقی حصہ قمر رئیس نے لکھا ہے اور صفحہ 24 پر ''یہ انتخاب'' کے عنوان سے اپنے مرتبہ انتخابِ افسانے پر اظہار خیال کیا ہے۔ قمر رئیس یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اُن سے قبل ہندوستان میں دو اور پاکستان میں ایک انتخاب شائع ہوا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''اس سے قبل پریم چند کی منتخب کہانیوں کے تین مجموعے شائع ہوچکے ہیں' دو ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں۔ پہلا انتخاب دراصل ان کہانیوں پر مشتمل ہے جنھیں ایک سوال کے جواب میں خود پریم چند نے اپنی بہترین کہانیاں قرار دیا تھا۔ دوسرا انتخاب مکتبہ میری لائبریری لاہور سے 1974ء میں شائع ہوا۔ تیسرا انتخاب 1978ء میں نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔'' 28ے

قمر رئیس ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہونے والے پریم چند کے افسانوں کے انتخابات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان انتخابات میں مرتبین نے اپنی پسند کو معیار بنا کر افسانوں کا انتخاب کیا تھا۔ پریم چند کے افسانوں کا فنی ارتقاء اُن کے پیش نظر نہیں تھا۔ قمر رئیس لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس کمی کو پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''کوشش کی گئی ہے کہ صد سالہ جشن پریم چند کے موقع پر شائع ہونے والے اس انتخاب میں اس کمی کی تلافی ہوسکے۔'' 29ے

اب تک پریم چند کے حوالے سے قمر رئیس کی یہ آخری کتاب ہے۔ اُن کی مذکورہ بالا تمام کتابوں کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُنہوں نے پریم چند پر لکھتے ہوئے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی پورا پورا حق ادا کیا ہے اور حقیقت کی بازیافت اتنی صاف اور روشن ہے کہ انکار ممکن نہیں۔

حواشی و حوالے

1 پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ''اُردو تنقید اور قمر رئیس'' ص 299 مضمون مشمولہ ''قمر رئیس ایک زندگی''

2 پروفیسر عتیق اللہ ''قمر رئیس کا تنقیدی موقف اور ترجیحات'' ص 269 مضمون مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی

3 رشید احمد صدیقی، تعارف مشمولہ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' از قمر رئیس ایڈیشن 1977ء ص 13-12

4 قمر رئیس ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' طبع چہارم 1977ء ص 112-111

5 قمر رئیس ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' طبع چہارم 1977ء ص 112

6 قمر رئیس ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' طبع چہارم 1977ء ص 121

7 قمر رئیس ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' طبع چہارم 1977ء ص 23-422

8 قمر رئیس ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحثیت ناول نگار'' طبع چہارم 1977ء ص 434

9 مضامین پریم چند ص 176 بحوالہ ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' ص 12

10 مضامین پریم چند بحوالہ ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' قمر رئیس ص 8

11 مضامین پریم چند ص 184 بحوالہ ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' قمر رئیس ص 9

12 قمر رئیس ''پریم چند کے افسانے ایک جائزہ'' ص 72 مضمون مشمولہ تعبیر و تحلیل

13 ''مضامین پریم چند'' مرتبہ قمر رئیس ص 190

14 قمر رئیس، حرف آغاز، مشمولہ پریم چند فکر و فن، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء

15 قمر رئیس، پریم چند فکر و فن، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 12

16 قمر رئیس، پریم چند فکر و فن، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 30

17 قمر رئیس، پریم چند فکر و فن، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 34-33

18 قمر رئیس، پریم چند فکر و فن، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 37-35

19 قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن''، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 39

20 بحوالہ قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن''، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 54

21 قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن''، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 54

22 قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن''، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی، دسمبر 1980ء ص 59-58

23 دیا نرائن نگم ''منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے''، بحوالہ پریم چند فکر و فن، قمر رئیس ص 59

24ے قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن'' پبلی کیشنز ڈویژن' حکومت ہند' نئی دہلی' دسمبر 1980ء ص 71

25ے قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن'' پبلی کیشنز ڈویژن' حکومت ہند' نئی دہلی' دسمبر 1980ء ص 86

26ے قمر رئیس ''پریم چند فکر و فن'' پبلی کیشنز ڈویژن' حکومت ہند' نئی دہلی' دسمبر 1980ء ص 100 ,94

27ے ظ۔ انصاری ''کتاب شناسی'' ص127 سنہ اشاعت 1981ء

28ے و 29ے قمر رئیس ''پریم چند کے نمائندہ افسانے'' ص 24

☆☆☆

باب پنجم

نیاز حیدر اور قمر رئیس

نیاز حیدر ایک باکمال ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے پانچ دہائیوں تک ہندوستان کے تین بڑے شہروں حیدرآباد، دہلی اور بمبئی کو اپنے نغموں کی راگ مالا بخشی۔ نیاز حیدر، مخدوم محی الدین کی رہنمائی میں تلنگانہ کے کسانوں کے لیے حکومت وقت سے بغاوت کی۔ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن کبھی نہیں رہے لیکن اس پارٹی کے پیغام کی اشاعت میں زندگی صرف کردی اور اسی پارٹی کی حمایت کی پاداش میں بمبئی میں 1949ء میں جیل کی صُعبتیں بھی اٹھائیں۔ شہر شہر انسان دوستی کا پیغام سناتے رہے۔ اسٹیج ہو کہ فلم کا اسکرین یا کہ ٹی وی، انہوں نے اپنا پیغام عام کرنے کے لیے مزدوروں، فنکاروں، غریبوں کی آواز کو ہردم ہر جگہ ہر آن بلند کیا اور اُن پر جب تین بار فالج کا حملہ ہوا تو آخر کار داعی اجل کو لبیک کہا۔ اپنے پیچھے اپنی یادگار کے طور پر اپنی ادبی تخلیقات چھوڑی ہیں جو اُن کے لب ولہجہ، انسان دوستی اور انسانی عظمت کی پیش کش کے لئے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

نیاز حیدر کے ساتھی کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''یہ ایک المیہ ہے کہ نیاز حیدر کے سارے کلام کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا ہے۔ اور اسے جمع کرنا بھی مشکل کام ہے۔ کچھ احباب کے پاس ہوگا۔ کچھ تو اب مل ہی نہیں سکتا اور کچھ ہفتہ وار ''حیات'' کی فائیلوں میں محفوظ ہے۔ دو تین طویل نظمیں کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک تو ''جمال مصر'' ہے دوسرا کتابچہ ہے ''خون'' ایک زندہ حقیقت ہے اور تیسرا کتابچہ ''نوید عصر لنین'' ہے۔'' [1]

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ''نیاز حیدر زندہ ہے'' کے عنوان سے مضمون جنوری 1990ء میں سپردقلم کیا ہے جو غالباً نیاز حیدر کی پہلی برسی 3 فروری 1990ء کو حیدرآباد کے روزنامہ ''سیاست'' میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بعدازاں اس مضمون کو انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی سے شائع ہونے والے اپنے مجموعہ مضامین ''ادبی تناظر'' میں شائع کیا ہے جو 1991ء میں شائع ہوا ہے۔

جس زمانے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی یہ کتاب دہلی میں ترتیب وتزین کے مراحل طے کررہی تھی اُسی زمانے میں ڈاکٹر قمر رئیس، نیاز حیدر کی نظموں اور چند غزلوں کا مجموعہ ''شعلہ آوارگی'' کے نام سے مرتب کررہے تھے۔ اور بابا نیاز حیدر کے پہلے مجموعہ کلام کو انہوں نے 1992ء میں شائع کیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے تاحال نیاز حیدر کے کلام کو دریافت کرتے ہوئے دو مجموعے شائع کئے ہیں پہلا مجموعہ ''شعلہ آوارگی'' 1992ء میں شائع کیا جس میں نیاز حیدر کی نظموں کے ساتھ ساتھ چند غزلیں بھی موجود ہیں۔ ''شعلہ آوارگی'' پر قمر رئیس نے ایک مفصّل اور مدلّل مقدمہ بھی سپردقلم کیا ہے جس میں بابا نیاز حیدر کی سوانح، شخصیت اور اُن کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ''شعلہ آوارگی'' کی اشاعت کے بعد، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس کو نیاز حیدر کے کلام کی بازیافت کی جستجو مزید تیز ہوگئی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے بابا نیاز حیدر کے فن کو باوقار بنانے کی غرض سے ضروری سمجھا کہ یونیورسٹی کی سطح پر اُن کی سوانح اور فن پر تحقیقی مقالہ لکھا جائے چنانچہ انہوں نے عزیز شاگرد ظفرالدین کو اس کام کے لئے منتخب کیا جنہوں نے اپنے استاد کے حکم پر لبیک کہا اور مقالہ سپرد قلم ہی نہ کیا بلکہ 1995ء میں اُسے ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' کی حیثیت سے شائع کیا۔ ظفرالدین نے اپنے مقالے کے آخر میں یہ اطلاع دی ہے کہ انہوں نے تقریباً دو سو نظمیں مزید دریافت کی ہیں جن میں سے بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی شخصیت کا روشن پہلو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا بیڑہ اٹھاتے ہیں تو اُسے انتہا پر پہنچا دیتے ہیں۔ 1949ء میں ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت سے انھیں دلچسپی ہوئی، اس تحریک میں ایسے شامل ہوئے کہ گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں تحریک پر جمود و انتشار کو محسوس کرتے ہوئے اُردو کے نوجوان دانشوروں کو تیار کیا کہ اب

تحریک کی باگ ڈور سنبھالنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ 1972ء میں تحریک کی قیادت سنبھالی اس طرح اُسے آ گے بڑھایا کہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کو آخر کار حیات نو عطا کی۔ اسی طرح نیاز حیدر کی بازیافت کی جانب جب قمر رئیس نے توجہ دی تو پہلے اُن کی نظموں اور غزلوں کا مشترکہ مجموعہ ''شعلہ آوارگی'' مرتب و شائع کیا۔ پھر اپنے شعبہ کے اسکالر ظفر الدین سے نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری پر مقالہ لکھوایا اور پھر اُسے شائع کروایا کہ بابا نیاز حیدر کو اُردو دنیا سے از سر نو متعارف کروائیں۔ ان کامیاب کوشش کے باوجود حق کی بازیافت کی کوشش ڈاکٹر قمر رئیس نے جاری رکھی اور جب گوہر مقصود اُن کے ہاتھ آیا تو انہوں نے نیاز حیدر کی غزلوں، قطعات، رباعیات اور فردیات کو ترتیب دے کر ''نغمۂ جمال زمیں'' کے عنوان سے 2002ء میں شائع کیا۔ اور اس طرح قمر رئیس نے اُردو ادب میں جس طرح ازبکستان اور ازبیک شاعری کے ذخیرہ کا اضافہ کیا ہے اُسی طرح انہوں نے نیاز حیدر کے کلام کو مرتب کرتے ہوئے اُن کی بازیافت کی۔

قمر رئیس نے ''شعلہ آوارگی'' پر مقدمہ لکھتے ہوئے نیاز حیدر کی شخصیت اُن کے کلام کے محرکات اور اُن کے فن کی معنویت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ قمر رئیس نے نیاز حیدر کی سوانح بیان کرتے ہوئے اُن کی زندگی کے اہم واقعات کو اس طرح مقدمے میں ترتیب دیا ہے کہ نیاز حیدر کی شخصیت بھرپور انداز میں عیاں ہو جاتی ہے۔ قمر رئیس نے نیاز حیدر کے والدین کا بیان کرتے ہوئے اُن کی ملازمت اور نیاز حیدر کی پیدائش کا ذکر نیاز حیدر کی بہن کا مریڈ مرتضائی بیگم کے حوالے سے کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''نجن بھائی (نیاز حیدر) 1920ء میں پیدا ہوئے۔ ہماری امّی بتاتی تھیں ہمارا ننہال اور ددہال اونچا ہار قصبہ مصطفی آباد ضلع رائے بریلی میں تھا نجن بھائی وہیں اتوار کے دن بھرے جاڑوں میں پیدا ہوئے۔ شاید آخر دسمبر یا شروع جنوری کے زمانہ تھا۔ والد کا نام سید آلِ نبی تھا۔ نجن بھائی ابھی گود میں تھے کہ والد عثمان آباد (مہاراشٹر) منتقل ہوگئے جو اس زمانے میں نظام حیدرآباد اسٹیٹ میں شامل تھا۔ والد محکمہ پولیس میں تھانے دار تھے۔ نجن بھائی کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم عثمان

آباد میں ہوئی۔'' 2ے

نیاز حیدر کی بہن مرتضائی بیگم نے اپنے والد کا نام تو بتایا لیکن والدہ محترمہ کے نام پر روشنی نہیں ڈالی۔قومی آواز، بمبئی کے نامہ نگار سید نعمان نے نیاز حیدر سے ایک انٹرویو کیا تھا جس میں نیاز حیدر نے اپنے والد اور والدہ دونوں کا نام بتایا ہے۔اقتباس دیکھئے:

''جائے پیدائش ہے میری مصطفی آباد ضلع رائے بریلی (یوپی)۔ میرے والد کا نام ہے سید آل نبی، اور والدہ کا نام ہے کبریٰ بیگم۔'' 3ے

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی بہن مرتضائی بیگم کے حوالے سے مندرجہ بالا اقتباس لکھا ہے جس میں اُنہوں نے نیاز حیدر کی پیدائش ضلع رائے بریلی کے قصبہ مصطفیٰ آباد میں لکھی ہے۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی زندگی کا ایک طویل حصہ نیاز حیدر کے ساتھ گزرا ہے۔ وہ نیاز حیدر کی پیدائش پربھنی (سابق ریاست حیدرآباد حال مہاراشٹر) بتاتے ہیں۔اقتباس دیکھئے:

''نیاز حیدر کا آبائی وطن تو رائے بریلی تھا لیکن وہ غالباً پربھنی (سابق ریاست حیدرآباد' حال مہاراشٹر) ہی میں پیدا ہوا تھا۔''4ے

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی پیدائش رائے بریلی میں ہونے کی شہادت اُن کی بہن مرتضائی بیگم کے حوالے سے لکھی ہے اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنی معلومات کی بنا پر پربھنی میں اُن کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس ذکر کو''غالباً'' کے سابقہ کے ساتھ لکھا ہے۔یقیناً ڈاکٹر قمر رئیس کا بیان تحقیقی اعتبار سے زیادہ صحیح ہے جس کی سند سید نعمان کے نیاز حیدر سے کیے ہوئے انٹرویو سے بھی ملتی ہے لیکن ان دو اقتباسات میں جو غور طلب بات ہے وہ علاقہ پربھنی کا ذکر ہے جس کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی قمر رئیس نے شعلہ آوارگی میں نہیں کیا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نیاز حیدر کا بچپن عثمان آباد' لاتور کے علاوہ پربھنی میں بھی گزرا ہے۔ یہ علاقہ عثمان آباد اور لاتور کے درمیان واقع ہے۔

نیاز حیدر کا بچپن سرزمین دکن پر گزرا۔یہیں انہوں نے عنفوان شباب کی آہٹ محسوس کی اور اسی سرزمین پر

انہوں نے دل میں ہوک سی اٹھتی دیکھی اور اسی سرزمین پر انہوں نے انسان دوستی کا پہلا سبق پڑھا۔ نیاز حیدر کے والد کا تبادلہ رائے بریلی سے عثمان آباد ہوا۔ پھر انھیں لاتور جانا پڑا چنانچہ نیاز حیدر کا بچپن بھی انہی علاقوں میں گزرا اور ان کی ابتدائی وثانوی تعلیم انہی علاقوں میں ہوئی۔ ڈاکٹر قمر رئیس ''شعلۂ آوارگی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ نیاز حیدر نے لاتور میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی اور پھر گریجویشن کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے حیدرآباد چلے آئے جہاں اُن کی ملاقات اپنے زمانے کے مشہور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین سے ہوئی اور یہیں انہوں نے اشتراکی نظریات کا مطالعہ مخدوم کی رہنمائی ورہبری میں کیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نیاز حیدر کی حیدرآباد کو ہجرت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عثمان آباد سے سید آل نبی کا تبادلہ تعلقہ لاتور ہوگیا۔ نجن بھائی انٹر کرکے وہاں سے حیدرآباد پڑھنے گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ راؤرمبھا کی ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ یہاں وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن ہوگئے۔ اشتراکی لٹریچر بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ حیدرآباد میں ان کی ملاقات مخدوم محی الدین اور ان کے انقلابی ساتھیوں راج بہادر گوڑ وغیرہ سے ہوئی۔'' 5

ڈاکٹر قمر رئیس نے سید نعمان کے نیاز حیدر سے لئے انٹرویو کی مدد سے نیاز حیدر کی ابتدائی زندگی اور ذہنی نشو کا بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے قمر رئیس نے ایک احسن طریقہ کو اپنایا ہے۔ اگر وہ سید نعمان کی معلومات کو اپنے طور پر قلمبند کرتے تو یقیناً اس تحریر کا استناد کمزور ہوتا لیکن نیاز حیدر کا بیان جوں کا توں نقل کرتے ہوئے انہوں نے بنیادی ماخذ کو برقرار رکھا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''میرا بمبئی میں 39ء سے آنا جانا رہا جس کا سبب ترقی پسند ادبی تحریک اور ورکنگ کلاس کی سیاست ہے۔ میرے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ میرا ذہنی ارتقا مخدوم محی الدین کے ساتھ حیدرآباد میں ہوتا رہا اور میری تمام باغیانہ صلاحیتیں مخدوم اور حیدرآباد کے بزرگ اور نوجوان شاعر وادیب' حیدرآباد کے

عوام کی دین ہیں۔" 6

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ 1939ء ہی سے جبکہ اُن کی عمر صرف 19 برس تھی بمبئی کی فلم انڈسٹری سے ربط وضبط بڑھانا شروع کر دیا تھا اور گاہے ماہے وہ بمبئی کے چکر لگایا کرتے تھے۔ اُن کی کوشش اور کاوش رنگ لائی اور 1945ء میں انھیں فلم "آندولن" کے گیت لکھنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ یہ فلم 1946ء میں ریلیز ہوئی۔ سامعین نے نیاز حیدر کے گیتوں کو پسند کیا۔ فن کی ستائش ہوئی تو فطری طور پر فنکار کا حوصلہ بڑھا۔ 1945ء نیاز حیدر کی زندگی کا یوں بھی سنگ میل ثابت ہوا کہ انہوں نے حیدرآباد میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں حیدرآباد کے ارکان مخدوم محی الدین، عابد علی خاں، محبوب حسین جگر اور راج بہادر گوڑ کے ہمراہ عملی حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> "میری نسل کے لوگ نیاز حیدر سے اس صدی کے پانچویں دہے سے واقف ہیں۔ ابتدائی تعلیم کو ختم کرکے وہ شہر میں "اسپرو" کا سیلز مین تھا۔ 45-1943ء میں جب مخدومؔ اور میں سکندرآباد میں مقیم تھے، نیاز حیدر وہاں ہوتا، ہمارا اس کا مستقل ساتھ تھا۔ 1945ء کی ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں شریک تھا۔" 7

نیاز حیدر نے 1945ء ہی میں بمبئی کا رُخ کیا۔ 1946ء میں اُن کے لکھے گئے گیتوں سے مزین پہلی فلم آندولن ریلیز ہوئی۔ 1947ء ہندوستان کی سیاست میں بڑا پُر آشوب تھا۔ اسی برس ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد آزاد ہوا۔ ترقی پسند مصنّفین نے آزادیٔ ہند کا خواب دیکھا تھا لیکن اسی طرح کی صبح آزادی کا نہیں کہ جس کے اُفق پر سورج کی سرخ شعاؤں میں انسانوں کے خون کا عکس بھی شامل ہو۔ 1947ء میں ہندوستان کے اہم شہروں میں فسادات ہوئے مگر آصفیہ سلطنت میں سکون برقرار تھا لیکن یہ سکوت قیامت کی آمد سے قبل کا سکوت ثابت ہوا۔ نیاز حیدر اور اُن کے خاندان نے چین کا سانس لیا ہی تھا کہ ستمبر 1948ء میں پربھنی عثمان آباد اور لاتور میں دکن کا بدترین فساد پھوٹ پڑا۔ نیاز حیدر اس وقت بمبئی میں تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس 1948ء کے واقعات کے تناظر میں نیاز حیدر کے خاندان کے حالات مرتضائی بیگم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"1948ء میں جب حیدرآباد اسٹیٹ میں پولیس ایکشن ہوا تو ہم لوگ لاتور میں تھے۔ بہت لوٹ مار اور غارتگری ہوئی۔ ہمارے گھر کا سارا اثاثہ لٹ گیا۔ ہم لوگوں نے جوار کے کھیتوں میں پناہ لی۔ ہماری بہن کی شادی طے تھی۔ ان کا سارا جہیز لٹ گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ نجن بھائی کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ والد صاحب حیدرآباد میں رہ گئے۔" 8

ڈاکٹر قمر رئیس نے شعلۂ آوارگی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ 1959ء میں جب ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو مرارجی دیسائی مہاراشٹرا کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ انہوں نے سختی سے اپنی ریاست میں کمیونسٹوں پر پابندی لگائی اور معمولی معمولی بنیادوں پر کمیونسٹ کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جارہی تھیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ اس سختی اور گرفتاریوں کے باوجود بمبئی میں پارٹی کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ نیاز حیدر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی رکن نہیں تھے لیکن انقلابی سرگرمیوں میں وہ کسی بھی کارکن سے پیچھے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کمیونسٹ لیڈر کامریڈ ڈانگے کو گرفتار کیا گیا تو نیاز حیدر کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ انھیں پہلے پہل آرتھر روڈ جیل میں رکھا گیا پھر ناسک جیل میں منتقل کیا گیا۔ بعد ازاں انہوں نے پونا جیل میں قید کے دن بتائے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے پونا جیل میں وقوع پذیر ہونے والا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے نیاز حیدر کی اپنے نظریے سے وفاداری اور اپنے رہنما و رہبر کے لئے بے دریغ جان قربان کرنے کا جذبہ اُجاگر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"ڈانگے کی رہنمائی میں ایک بار قیدیوں نے ہڑتال اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ جیل کے اندر پولیس نے گولی چلادی۔ نیاز حیدر کامریڈ ڈانگے کو بچاتے ہوئے زخمی ہوئے۔ ان کی ایڑی میں گولی لگی۔" 9

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی سوانح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 1952ء میں انھیں جیل سے رہا کیا

گیا۔ کچھ عرصہ وہ روپوش رہے پھر 1955ء میں لکھنؤ چلے گئے۔ 1957ء میں دہلی میں سکونت اختیار کی جہاں 1958ء میں وہ بیگم قدسیہ زیدی کی ''ہندوستان تھیٹر'' سے وابستہ ہوئے اور ڈرامے نگاری پر توجہ دی۔ چنانچہ شکنتلا' امرپالی' ماٹی کی گاڑی اور سفید کنڈلی جیسے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے۔ قمر رئیس سید نعمان کے انٹرویو کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس آوارہ گردی نے مجھے ہر طرح کی مصیبت کے باوجود عوام کی زندگی کے طول وعرض مجھ پروا کردیے اور میں نے تھیٹر سے دلچسپی لینا شروع کردی۔''10

نیاز حیدر نے اپنے لکھے ڈراموں کو اسٹیج کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ڈراموں کو ہمیشہ اوپیرا اور بیلٹ کی تکنیک کے مدد سے اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ سید نعمان کو دئے گئے انٹرویو میں خود نیاز حیدر اپنے ڈراموں کی پیش کشی اور اُن کے ڈائرکٹروں کی صلاحیتوں کا بیان کیا ہے۔ اقتباسِ دیکھئے:

> '' میں نے اس (ہندستانی) تھیٹر کے لئے شکنتلا ' امرپالی' مرچھ کٹک (مٹی کی گاڑی) ویشاک وت کامدراراکشش' برطول بریخت (جرمن ڈرامٹسٹ) کا کاکشین چاک سرکل' سفید کنڈلی لکھا۔ سب ڈرامے کلاسیکی تھے اور ان ڈراموں کو پیش کرنے میں اور ان کی ہئیت اور اسٹیج تکنیک طے کرنے میں' میں نے اپنے اسٹائل کو کرداروں اور ڈائرکٹروں کے ذریعے اوپیرا اور بیلٹ کے انداز میں تکمیل کی۔ فلم گرم ہوا' کے ڈائرکٹر ایم ایس سیتھیو نے اپنے بے مثال ہدایت کارانہ کمال سے میرے تمام ڈراموں کو نقطۂ عروج پر پہنچایا۔''11

نیاز حیدر نے سید نعمان کو دئے گئے انٹرویو میں اپنی زندگی کے اس ''شعلۂ آوارگی'' کا بیان خود کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> '' تہذیبی محاذ پر کام کرتے ہوئے نہ صرف مجھے جیلوں کی ہوا کھانی پڑی بلکہ اس جدوجہد نے مجھے ایک بے باک طالب علم بننے پر مجبور کردیا۔ کیونکہ میرا خاندان شعر وادب کا

شیدائی تھا۔ اس لئے مجھے ادب اور شاعری ورثے میں ملی۔ میں نے اپنے انداز اظہار وبیان کا ایک راستہ متعین کیا۔ تحقیق اور تلاش کو اپنا شاہکار بنالیا۔ میری زندگی کا ہر لمحہ اکتساب فکر اور مشاہدے کی تمناؤں کے لئے وقف رہا۔ اور اس جستجو نے مجھے آوارہ گرد اور کسی حد تک لاابالی بنادیا۔ کیونکہ مجھے ان گنت مشکلوں' افلاس اور پابندیوں سے نجات حاصل کرنی تھی۔ یکسوئی کی آزادی ہمارے سماج میں بہت مہنگی ہے اس لئے مجھے اپنی بہت سی آرزو اور کئی قیمتی موقعوں کو قربان کردینا پڑتا جن میں میری اقتصادی ترقی کے امکانات موجود تھے۔'' 12؎

نیاز حیدر کی تھیٹر سے وابستگی انھیں فلموں کے اسکرین پلے میں مدومعاون ہوئی جس کا اظہار انہوں نے خود اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ نیاز حیدر کی فلموں سے وابستگی اور کارگزاری کا بیان کرتے ہوئے ظفر الدین لکھتے ہیں:

''نیاز حیدر تھیٹر کے ساتھ فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ 1946ء میں ریلیز ہونے والی جس فلم ''آندولن'' میں نیاز نے گیت لکھے تھے اس کے مصنف کرشن چندر تھے۔ نیاز نے بعد میں جن فلموں کے لئے منظر نامے' مکالمے اور گیت لکھے ان میں شیام بینگل کی ''آروہن'' اور سمترا کی ''سانجھی'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے آخری کہانی ممتاز ہدایت کار کیتن مہتا کے لئے لکھی۔ منگل پانڈے کی زندگی پر مبنی فلم کارتوس کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ اس کا منظر نامہ نیاز حیدر نے شیام بینگل کے لئے لکھاتھا۔ شیام بینگل کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک بار انہوں نے مے نوشی ترک کردی تھی۔'' 13؎

نیاز حیدر کی زندگی کے نشیب وفراز کا بیان کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں کہ انھیں 1960ء میں فالج ہوا تھا۔ نومبر 1988ء میں اُن کی ٹیلی فلم ''اندر سبھا'' کا اسکرپٹ منظور ہوا۔ اس خوشی میں پارٹی منعقد ہوئی جس میں نیاز حیدر بے تحاشہ شراب پی۔ رات میں دل میں تکلیف محسوس کی۔ تکلیف کی شدت بڑھتی گئی اور نومبر 1988ء میں

اُن پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ اُن کی بہن مرتضائی بیگم نے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ انھیں مول چند اسپتال دہلی میں شریک کروایا۔ علاج سے کچھ افاقہ ہوا لیکن اچانک 26 جنوری 1989ء کو ان پر فالج کا تیسرا حملہ ہوا اور اس بار یہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''دوبارہ مول چند اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں بہترین علاج میسر تھا۔ اپنی عسرت کے باوجود بھائی کے علاج پر مرتضائی بیگم نے پچاس ساٹھ ہزار روپیہ صرف کیا لیکن موت کے چنگل سے انھیں بچانہ سکیں۔ ساری زندگی بیداری کے نغمے الاپنے والا یہ انقلابی فنکار آخر 3 فروری 1989ء کو ہسپتال کے بستر پر ابدی نیند سوگیا۔'' 14

اور اُردو کے ایک جہاں گردمستانے شاعر نے 3 فروری 1989ء کو اپنی جان اُس کے مالک حقیقی کو سونپ دی۔ نیاز حیدر نے ڈرامے لکھے، اوپیرا لکھے، فلمی گیت لکھے، فلموں کے مکالمے لکھے، اسکرین پلے لکھے، شعر کہے، فی البدیہہ کہے، ہر موقع پر ہنگامی نظمیں لکھیں۔ نیاز حیدر کی آواز بارعب تھی۔ وہ بڑی جوشیلی تقریر کیا کرتے تھے۔ نیاز حیدر نے بچپن میں ذاکری بھی کی تھی۔ قمر رئیس اُن کی بہن مرتضائی بیگم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''گھر میں اکثر مجلسیں ہوتی تھیں۔ انھیں بھی مرثیہ خوانی کے آداب سکھائے گئے۔ دس گیارہ سال کی عمر میں وہ منبر پر بیٹھ کر انیس و دبیر کے مرثیے پڑھنے لگے تھے۔'' 15

نیاز حیدر کے کلام میں الفاظ کا استعمال بہت ہی سلیقے سے کیا گیا ہے۔ خیالات میں وہ بہاؤ نظر آتا ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ خوبی یقیناً اُن کی ذاکری کی دین تھی۔ بچپن ہی سے انہوں نے انیس و دبیر کے مراثی کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ انھیں منبر پر پڑھا بھی تھا۔ بچپن ہی سے مراثی کے اس مطالعہ سے اُن میں فی البدیہہ شعر کہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم بیدار ہوگئی تھی جسے انہوں نے اکثر موقعوں پر ہنگامی نظمیں کہنے میں بروئے کار لایا۔ ایسی نظمیں عموماً وہ پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں کے موقعوں پر کہا اور پڑھا کرتے تھے۔ نظمیں پیش کرنے کا اُن کا اپنا انداز تھا جس کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"وہ پارٹی کے جلسوں اور جلوسوں کے لئے بھی اکثر ایسی نظمیں لکھتے تھے۔ اور جب اپنی گونجدار اور جوشیلی آواز میں ان کو پڑھتے تھے تو آن کی آن میں جلسہ یا ریلی میں جوش وخروش کی برقی لہر دوڑ جاتی تھی .... اس نوع کی سیاسی اور احتجاجی نظموں کو ان کی وقتی مقبولیت کے باوجود نہ بابا نیاز حیدر کوئی تخلیقی کارنامہ سمجھتے تھے اور نہ ترقی پسند نقادوں نے انھیں اعلا درجے کی شاعری قرار دیا۔" 16؎

نیاز حیدر نے اپنی زندگی میں موضوعاتی نظمیں شائع کرنے کے علاوہ نظموں کا ایک مختصر انتخاب بھی شائع کیا تھا۔ اُن کی پہلی یا اولین تخلیق جو کتابچہ کی شکل میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی وہ "جمال مصر" ہے۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی یہ نظم 1956ء میں شائع ہوئی۔ "جمال مصر" کا دیباچہ سید سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔ اس مسدس پر اپنی رائے لکھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے عصر کی چند بہترین سیاسی نظموں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"نیاز حیدر ترقی پسند گروہ کے صفِ اول کے شعرأ میں سے ایک ہیں۔ ان کی شاعری میں اگر ایک طرف پختگی ہے اور زبان وبیان پر پورا قابو تو دوسری طرف جوش وخروش ہے اور فہم وادراک .... میں ان کے اس مسدس کو ان کی بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں اور میرے خیال میں اگر اس کے متعلق یہ بھی دعویٰ کیا جائے کہ یہ موجودہ زمانے کی چند بہترین سیاسی نظموں میں سے ایک ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔" 17؎

سید سجاد ظہیر کے برخلاف ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ "خود بابا نیاز حیدر کے تنقیدی شعور نے اس قسم کی نظموں کو رد کر دیا تھا" (18؎) لیکن اسی کے ساتھ ڈاکٹر قمر رئیس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا جمالیاتی کیف آج بھی معنوی حسن سے معمور ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"اپنے مسدس "جمال مصر" (1956ء) میں انھوں نے ایشیائی بیداری کا جو نغمہ گایا اور مستقبل کے امکانات کی سمت جو بلیغ اشارے کئے ہیں وہ آج بھی جمالیاتی کیف اور معنوی حسن سے معمور نظر آتے ہیں۔" 19؎

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی ایسی نظموں کو رد کرنے کی جو بات کی ہے اُس کی تائید اُن کے شاگرد رشید ظفر الدین کی تحریر سے بھی ہوتی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ ایسی بہت سی نظمیں انھیں ملی ہیں جن پر خود نیاز حیدر نے Rejected لکھا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''اس طرح کی نظموں کو خود نیازؔ نے بھی مسترد کیا ہے اور ان کے جو مسودے مجھے دستیاب ہوئے ہیں ان میں درجنوں نظموں پر نیازؔ کی تحریر میں Rejected اور Not to be Published جیسے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ نیازؔ حیدر کا یہ رویہ غالبؔ کی اس روایت کی یاد دلاتا ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کا خاصا حصہ خود ہی القط کر دیا تھا۔''20؎

''جمال مصر'' کے بعد نیاز حیدر نے بقول ڈاکٹر قمر رئیس اپنی 19 نظموں پر مشتمل مجموعہ ''نوید عصر لینن'' 1967ء میں شائع کیا۔ بنگلہ عوام کی آزادی کی جنگ و جہد کے موضوع پر بنگلہ عوام کی تائید میں 1971ء میں ایک طویل نظم ''لہو زندہ حقیقت'' ہے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جبکہ ڈاکٹر قمر رئیس نے 1992ء میں نیاز حیدر کی 60 نظموں اور چند غزلوں پر مشتمل اُن کا ضخیم مجموعہ کلام ''شعلہ آوارگی'' کے نام سے شائع کیا۔ ظفر الدین اپنی کتاب ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' میں ''نوید عصر لینن'' اور ''شعلہ آورگی'' میں شائع شدہ نظموں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعلہ آوارگی میں 60 نظمیں شامل ہیں جبکہ نوید عصر لینن میں 19 نظمیں موجود ہیں۔ دونوں مجموعوں میں تین نظمیں ''سکل سمت سجل سندری' سادہ ہے کاغذ کیا لکھیں' اور 'سنو تو مجھ سے سنو نغمہ جمال زمیں' مشترک ہیں۔'' 21؎

ڈاکٹر قمر رئیس نے ظفر الدین سے ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھوایا۔ ڈاکٹر ظفر الدین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ انھیں تقریباً دو سو (200) نظمیں دستیاب ہوئیں۔ اقتباس دیکھئے:

''نیاز حیدر کے مزید کلام یا تو اخبارات ورسائل میں

بکھرے ہیں یا پرانی کاپیوں، ڈائریوں، اخبارات کی کترنوں اور سگریٹ کی ڈبیوں پر اسی طرح (غیر مطبوعہ) باقی ہیں جس طرح نیاز انہیں لکھ گئے ہیں۔ مجھے اب تک نیاز حیدر کی تقریباً دو سو نظمیں دستیاب ہوسکی ہیں جن میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں نظمیں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض ادھوری یا انتہائی غیر واضح ہیں۔"22

1992ء میں جبکہ ڈاکٹر قمر رئیس نے شعلۂ آوارگی مرتب وشائع کیا جس میں چند غزلیں بھی درج تھیں لیکن نیاز حیدر کی غزل پر کسی اُردو کے نقاد نے اظہار خیال نہیں کیا۔ظفر الدین نے بھی اپنی کتاب میں نیاز حیدر کی نظموں کی بازیافت پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نیاز حیدر کی غزل گوئی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" نیاز حیدر غزل سے شروع ہی سے برگشتہ سا تھا۔"23

ڈاکٹر قمر رئیس نے" شعلۂ آوارگی" میں غزلیں شائع کرنے کے باوجود نیاز حیدر کی غزل گوئی پر اظہار خیال نہیں کیا اور یہ تاثر دیا کہ بنیادی طور پر نیاز حیدر نظم کے شاعر ہیں...... لیکن!

شعلۂ آوارگی کی اشاعت کے ٹھیک دس برس بعد ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی تقریباً 79 غزلوں کی بازیافت کی اور نیاز حیدر کی ایک نظم کے عنوان" نغمۂ جمال زمین" کو کتاب کا عنوان بنا کر کے نیاز حیدر کی غزلوں کا مجموعہ 2002ء میں شائع کیا۔اس مجموعہ میں انہوں نے نیاز حیدر کے چند قطعات، رباعیات اور متفرق اشعار بھی یکجا کر دیئے ہیں۔

" نغمۂ جمال زمیں" پر ڈاکٹر قمر رئیس نے مختصر تعارف لکھا ہے جس میں نیاز حیدر کی نظموں کی شہرت کا بیان کرنے کے بعد اُن کی غزل گوئی اور غزل کے فن پر نیاز حیدر کے عبور و دسترس کا ذکر کیا ہے۔اور اسی کے ساتھ نیاز حیدر کی غزلوں کی بازیافت پر روشنی ڈالی ہے۔اقتباس دیکھئے:

" چند سال قبل جب میں نے بابا نیاز حیدر کی منتخب نظمیں "شعلۂ آوارگی" کے نام سے مرتب کرکے شائع کی تھیں تو

اس میں ان کی چند غزلیں بھی‘ جو اس وقت دستیاب ہوئیں‘ شامل کردی تھیں۔ اگرچہ ان غزلوں کے شگفتہ اسلوب میں ایک خاص تازگی تھی۔ تاہم اس وقت میرا تاثر یہی تھا کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور غزل جیسی نازک غنائی اور ایمائی صنف سے ان کا مزاج مناسبت نہیں رکھتا۔ لیکن پچھلے دنوں جب محبی ڈاکٹر شاہد تسلیم نے ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات اور تحریروں کی تلاش وتحقیق کا کام شروع کیا تو بابا نیاز حیدر کی ہمشیرہ محترمہ مرتضائی بیگم کی مدد سے خاصی تعداد میں ان کی غزلیں بھی دستیاب ہوئیں۔ ان میں سے کچھ غزلیں ان کے تخلیقی سفر کے اس دور کی یادگار ہیں جب وہ ناکامؔ تخلص کرتے تھے لیکن زیادہ غزلیں ایسی ہیں جو مختلف اوقات میں انہوں نے آخری دور میں ہی لکھیں۔‘‘ 24

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مرتبہ مجموعہ میں شامل غزلوں کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ ان غزلوں میں نیاز حیدر کے ابتدائے سخن کی غزلیں بھی شامل ہیں جبکہ وہ ناکامؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ اس مجموعہ میں زیادہ تر غزلیں اُن کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی غزلوں کے موضوعات‘ محاسن کا بیان کرنے سے قبل ترقی پسند شعراؑ کی غزل گوئی پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے خصوصاً ایسے ترقی پسند شعراؑ کی مثالیں لکھی ہیں جو منفرد نظم نگار تھے اور جن کی نظم نگاری کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے مثلاً اسرار الحق مجازؔ‘ جاں نثار اخترؔ اور فیض احمد فیض۔۔۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اشعار کی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ نیاز حیدر غزل کی فنی اہمیت اور اُس کی تہذیبی معنویت سے بخوبی واقف و باخبر تھے۔ اقتباس دیکھئے:

’’ اپنے متعدد اشعار میں نیازؔ حیدر نے ایک صنف سخن کی حیثیت سے غزل کی فنی اہمیت اور تہذیبی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔

حافظ وبیدل وغالب کی حسینہ ہے غزل
خاتم شعر کا پُر آب نگینہ ہے غزل
جانِ تہذیب ہے‘ سرمایۂ دل ‘ حاصلِ فن

اپنی تاریخ ثقافت کا دفینہ ہے غزل'
کچھ تو پاسِ دل غارت شدۂ ناز کرو
زندگی تلخ ہے یارو۔ غزل آغاز کرو"25ے

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ نیاز حیدر نے فارسی اور اُردو کی کلاسیکی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا جس کی بنا پر انھیں غزل کے اشعار کی بندش پر خاص عبور حاصل ہوگیا تھا اور اسی لیے وہ غزل کے پیکر میں اپنی زندگی کے رنگارنگ تجربات کسی دقت یا عجز کا اظہار کئے بغیر ادا کرتے تھے۔ راقمۃ الحروف کا خیال ہے کہ لڑکپن میں انیس و دبیر کے مراثی کی ذاکری نے بھی نیاز حیدر کو غزل کے اسلوب پر دسترس ادا کی تھی۔ اقتباس دیکھئے:

"غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس کے کیف وکم میں ڈوب کر شاعر خود اپنے وجود کا سراغ بھی لگاتا ہے۔ زندگی کی سچائیوں کو خواہ وہ کیسے ہی معروضی یا نظریاتی زاویہ سے دیکھتا ہو' غزل کا دیا ہاتھ میں لے کر اسے اپنی زندگی' اپنے کردار کے ایسے پہلو بھی روشن نظر آنے لگتے ہیں جن کو وہ قابل' اعتنا نہیں سمجھتا۔ دراصل ذات کا یہ نفوذ ہی غزل کے پیمانے کو صہبائے دل گداز سے بھردیتا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں قاری شاعر کی جذباتی زندگی کی اونچی نیچی لہروں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس کے بشری اوصاف کو دریافت کرتا ہے۔ بابا نیاز حیدر کی باغیانہ اور رندانہ زندگی کے ایسے بہت سے گوشے بھی' جہاں وہ شدت سے جئے' ان کی غزل کے اشعار میں آسانی سے نظر آجاتے ہیں۔ صرف چند اشعار دیکھئے۔

مستانہ روی' نغمہ گری' میری عبادت
کیوں کر مجھے راس آئے گا دامن کا سہارا

☆☆

ان درد کی لہروں سے کہہ دو' یہ کھیل نہیں اچھا دل سے
وہ موج نہیں زندہ رہتی' ٹکراتی ہے جو ساحل سے

☆☆

آشنائے رازِ دل' کم ہیں بہت

ایک ہی ہم ہیں تو پھر ہم ہیں بہت

☆☆

یہ سر شام کدھر لے کے چلی تشنہ لبی

یعنی پھر قبر سے اٹھ کر کوئی گھر آتا ہے

☆☆

منفعل ہیں نہ پشیماں' نہ برے ہیں نہ بھلے

ہم ہیں انساں ہمیں ہر عیب و ہنر آتا ہے'' 26ؐ

ڈاکٹر قمر رئیس نے ''نغمہ جمال زمیں'' پر تعارف کے تحت لکھا ہے کہ نیاز حیدر کی غزل میں نظم کی طرح بلند آہنگ جوشیلا اور راست اظہار خیال نہیں ملتا حالانکہ نیاز حیدر نے ان میں سیاسی فکر کی سرکشی کو بھی باندھا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی غزلوں میں ملنے والی طنز کی ہلکی ہلکی آنچ کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

'' نیاز حیدر کی غزل میں جہاں ان کی سیاسی فکر کی سرکشی اور ان کی سوچ کی سماجی اداروں سے سرتابی کے نشانات ملتے ہیں وہاں ان کا لہجہ کچھ بدلتا ضرور ہے لیکن وہ اتنا بلند آہنگ جوشیلا اور راست نہیں ہوتا جو ان کی بہت سی نظموں میں نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں طنز کی ہلکی ہلکی سی آنچ بھی شعر میں تازگی اور تاثیر کا احساس دلاتی ہے۔

انہیں راس آئے گی کس شاخ کی چھاؤں

نظر جن کی فراز دار پر ہے

☆☆

سیماؤں کے پہلو میں

لہو کی بہتی لہر بھی ہے

☆☆

کعبہ و دیر کے گمراہوں کا انجام ہی کیا

یہی بہتر ہے انہیں دل کی طرف لے چلئے

☆☆

لرز کے رہ گئی خونخوار پیاس قاتل کی

پگھل کے بہ گئے خنجر لہو کی گرمی سے'' 27ے

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کے ابتدائے سخن میں کہی ہوئی غزلوں کے مضامین کے بین السطور سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ انہوں نے اپنے غزل کے اشعار میں کسی کافر ادا سے اپنی وابستگی کی جانب اشارے کئے ہیں۔ لیجئے ڈاکٹر قمر رئیس کی زبانی بابا نیاز حیدر کے دل میں تراز و بن کر خلش پیدا کرنے والے ''محروم طرب دل'' کا بیان ملاحظہ ہو:

'' محرومِ طرب دل ہے مرا میرے جہاں میں
واں میری غزل باعثِ تسکین وطرب ہے

بابا نیاز حیدر جب انقلابی اور اشتراکی تحریک سے جڑے تو اسی کے ہو رہے۔ اپنے شعر میں انہوں نے اپنے دل کے محرومِ طرب ہونے کی طرف جو اشارہ کیا اس میں رومانس سے دوری کا یہ پہلو بھی شامل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا دامنِ دل حسن وعشق کی کرشمہ سازی اور طرب زائی سے ہمیشہ محروم رہا۔ عنفوانِ شباب میں کم از کم ایک کافر ادا سے ان کی وابستگی کی شہادت ضرور ملتی ہے۔ اس پہلے عشق میں وہ ناکام ہوئے لیکن اس عشق کی نشاط انگیز پرچھائیاں ہمیشہ ان کے تخئیل میں رنگین پیکر تراشتی رہیں۔ ان کے تخلیقی اظہار میں جذباتی وفور اور غنائی احساس کارس گھولتی رہیں۔ اس کے نشانات ان کی غزل میں جگہ جگہ روشن نظر آتے ہیں۔

شہہ دلبراں تجھے کیا خبر دل رندِ خاک نشیں ہے کیا
اسی خاک نے اسے دل کیا یہی خاک اس کو مٹا گئی

☆☆

اک ادا۔ اک مسکراہٹ اک نظر ہے زندگی
اے حسینو ! خوبصورت کس قدر ہے زندگی

☆☆

کچھ اور ہستیٔ ویراں کی شان بڑھ جائے
اسی لئے دل وجاں میں بسالیا تجھ کو'' 28ے

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی غزلوں کے اشعار کے حکیمانہ افکار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نمونے کے طور پر

ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

''آج کرتے ہیں فراہم وہی اسبابِ فنا
رات دن جن کی زباں پر ہے ثنائے تہذیب
کس نے کس کو غمِ ہستی سے بچایا اب تک
نہ خدا اور نہ پیمبر نہ مسیحا نہ طبیب
☆☆
ہمارے ساتھ چلنا ہے تو فاتح کی طرح چلئے
کہ ہم نے کہکشاں کی سرحدوں پر فتح پالی ہے
خزاں نصیب دور میں بہار کی تسلّیاں
مگر وہ دل جسے ہے خار و خس کا آسرا بہت
☆☆
جہاں مرجھائے پھلواری وہیں کلیاں نکھرتی ہیں
خزاں سے بھی' بہاروں کو سجالے جس کا دل چاہے
☆☆
دیکھ آنکھوں کو نہ بہا جائے کہیں بے خوابی
دیر ہوتی ہے بہت خواب کی تعبیروں میں
☆☆
ان کی جھنکار فضاء میں ہے ابھی تک باقی
کن زمانوں کی فغاں جذب تھی زنجیروں میں'' 29

ان اشعار کی لفظیات ہم سے بہت کچھ کہتے ہیں۔ ان میں عصری حسیت کا بیان بھی موجود ہے۔ ان کا لہجہ وہ ہے جسے آج ہم جدیدیت کا لہجہ قرار دیتے ہیں اور ان اشعار میں زنجیروں میں محسور زمانوں کے فغاں کے جذب ہونے کا بیان بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''دراصل ذات کا یہ نفوذ ہی غزل کے پیمانے کو صہبائے دل گداز سے بھر دیتا ہے یہی وہ علاقہ ہے جہاں قاری شاعر کی جذباتی زندگی کی اونچی نیچی لہروں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس کے بشری اوصاف کو دریافت کرتا ہے۔'' 30

اور ایسے ہی کسی موقع پر مرزا غالب نے کہا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نغمہ جمال زمیں کے صفحہ 73 پر ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی غزل درج کی ہے جس میں جملہ چھ اشعار ہیں۔ نیاز حیدر کی یہی غزل وارانسی سے محمود احمد ہنر کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''شاہکار'' بابت ستمبر 1971ء کے صفحہ 116 پر شائع ہوئی ہے۔ نغمۂ جمال زمیں میں ڈاکٹر قمر رئیس نے جو غزل درج کی ہے اُسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

اب مسیحا کا تصور بھی، اگر آتا ہے
ڈوبتی نبض کا احساس، ابھر آتا ہے
ایسی آنکھوں سے ہی سورج کو، میسر ہے شفق
جن میں خونِ جگر و قلب اتر آتا ہے
بے خطر، گرمِ خرام اور یہ رفتار کی دھن
گم سے ہیں کون و مکاں، کیا یہ بشر آتا ہے
یہ سرِ شام کدھر لے کے چلی تشنہ لبی؟
یعنی پھر قبر سے اُٹھ کر کوئی گھر آتا ہے
منفعل ہیں نہ پشیماں، نہ برے ہیں، نہ بھلے
ہم ہیں انساں، ہمیں ہر عیب و ہنر آتا ہے
متبسم ہے لبوں پر جو تیرے درد نیاز
کیا کسی اہلِ بصیرت کو، نظر آتا ہے 31

''شاہکار'' میں شائع ہونے والی غزل جملہ سات اشعار پر مشتمل ہے جبکہ ''نغمۂ جمال زمیں'' کی غزل میں صرف چھ شعر ہیں۔ ''شاہکار'' کی غزل میں نغمۂ جمال زمیں کی غزل کا شعر نمبر چار موجود نہیں ہے۔ اس طرح شاہکار میں شامل غزل میں دو شعر (دوسرا اور چوتھا) ایسے ہیں جو مجموعہ میں نہیں ہیں۔ یہ دو شعر حسبِ ذیل ہیں:

''جو تیرے عارض وگیسو نے دیا تھا وہی غم

زندگی بن کے مری شام و سحر آتا ہے (شعر نمبر 2۔ شاہکار)

میں سمجھتا ہوں اسے دشمن جاں دشمن دل

جو بھی لے کر ترے آنے کی خبر آتا ہے" (شعر نمبر 4۔ شاہکار) 32؎

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کی کسی کا فراد اسے وابستگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔شاہکار میں شائع ہونے والی غزل کے ان مندرجہ بالا اشعار سے بھی اس بات کو تقویت ملتی ہے۔ نیاز حیدر کی یہ غزل ستمبر 1973ء میں شائع ہوئی ہے جبکہ انھیں لاتور سے ہجرت کئے ہوئے پندرہ برس ہوگئے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عشق کی آگ اُن سے بجھائے نہیں بجھ سکی۔

شاہکار میں شائع ہونے والی غزل کے مقطع کے مصرعہ ثانی میں معلوم ہوتا ہے کہ نیاز حیدر نے بعد ازاں اصلاح کی۔شاہکار کی غزل کا آخری مصرع یوں ہے ع

کیا کسی دیکھنے والے کو نظر آتا ہے

یہ مصرعہ مندرجہ بالا دو اشعار کے مضامین سے حالانکہ منسلک معلوم ہوتا ہے لیکن نیاز حیدر نے اصلاح دیتے ہوئے مصرعے کو بلاغت عطا کی ہے۔کیا خوب مصرع ہے ع

کسی کسی اہل بصیرت کو، نظر آتا ہے

ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر کو اُردو میں متعارف کروایا ہے۔خصوصاً نیاز حیدر کی غزلیں اکھٹا کرتے ہوئے انہوں نے جو مجموعہ شائع کیا ہے وہ ترقی پسند غزل کی عمدہ مثال ہے۔ جوش ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی کے احتجاجی لب و لہجہ کو اگر کسی نے اپنایا اور پروان چڑھایا ہے تو وہ ہیں نیاز حیدر۔ اگر قمر رئیس نغمۂ جمال زمیں شائع نہ کرتے تو اُردو غزل ان غزلوں سے ہمیشہ محروم رہتی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے "شعلہ آوارگی" میں نیاز حیدر کی شش جہت شخصیت کے انوپ روپوں پر روشنی ڈالی ہے جس سے نیاز حیدر کی شخصیت اور فن کا ادراک ہوتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

"ایک ہی شخص کی پہچان کے کتنے روپ ہیں۔ شخص
جو بنیادی طور پر ایک تخلیق کار، شاعر اور ڈرامہ نگار تھا۔

ایک آسودہ حال، شریف گھرانہ کی پہلی اولاد، بی اے تک تعلیم فطری ذہانت اور ذکاوت سے لیس۔ وہ چاہتا تو آزادی سے قبل ہی ریاست حیدرآباد یا حکومت ہند میں کوئی منصب حاصل کرکے ترقی کے درجات طے کرتا۔ آسائشوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر شعر کہتا۔ دوچار نہیں تو دس پانچ سال کے وقفے سے خوبصورت شعری مجموعے شائع کراتا۔ رابطہ عامہ کی استواری سے قومی اوارڈ حاصل کرتا، جنم دن منواتا، پدم شری بن جاتا لیکن وہ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں برہنہ پا ایک سیلانی جوگی کی طرح، نگر نگر گھومتا پھرا۔ زندگی کی آخری سانسوں تک اس کا شوق آبلہ پائی کم نہ ہوا۔ جیسے کوئی وحشی ہرن اپنے نافہ کی خوشبو سے مست وبے خود ہوکر بھاگ رہا ہو۔ تپتی چٹانوں سے اپنے جسم کو رگڑ رہا ہو۔ جس کے نتیجہ میں مشک نافہ کی خوشبو اور بھی پھیلتی ہے اور نتیجہ میں اس کی بے چینی، اس کی وحشت اور بھی بڑھتی ہے۔

بابا نیاز حیدر نے اس زندگی کا انتخاب اپنے اندر کی آواز سے، اپنے ارادہ سے کیا تھا اور اس انتخاب پر انھیں کبھی پشیمانی نہیں ہوتی۔ ان کا مشک نافہ، ارض وطن کے اور ساری دنیا کے محکوم، مظلوم اور بے مایہ انسانوں کا وہ درد تھا جو دنیا کی ہر شے سے زیادہ انھیں عزیز تھا۔ وہ ان کی آبرو، ان کا وقار اور ان کا ضمیر تھا۔ وہ کسی دنیوی جاہ ومنصب یا زرو دولت کے عوض اس کا سودا نہیں کرسکتے تھے۔ اور نہ کیا۔ ان کی شان کج کلاہی کا واحد سرچشمہ یہی، درد، تھا جس کی عظمت پر وہ ہمیشہ نازاں رہے۔'' 33

اور ڈاکٹر قمر رئیس نے نیاز حیدر اور اُن کے کلام کی جس طرح بازیافت کی ہے اُس کے لئے پورا اُردو ادب، خاص طور پر ترقی پسند مصنّفین اُن پر ہمیشہ نازاں رہیں گے۔

....

حواشی و حوالے

1 ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''نیاز حیدر زندہ ہے'' ص 152 مضمون مشمولہ ''ادبی تناظر''

2 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ص 12 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

3 سید نعمان احمد ''نیاز حیدر سے انٹرویو'' مطبوعہ قومی آواز، بمبئی، بابت 12 اکتوبر 1981ء

4 ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''نیاز حیدر زندہ ہے'' ص 151 مضمون مشمولہ ادبی تناظر

5 و 6 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ص 13 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

7 ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''نیاز حیدر زندہ ہے'' ص 151 مضمون مشمولہ ''ادبی تناظر''

8 و 9 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ص 14 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

10، 11 و 12 سید نعمان، روزنامہ قومی آواز ممبئی 12 اکتوبر 1981ء بحوالہ قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی

13 ظفر الدین ''نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری'' ص 18-17، پرنٹ آرٹ، دہلی 1995

14 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ص 20 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

15 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ص 12 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

16 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ص 22 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

17 سید سجاد ظہیر ''دیباچہ'' مشمولہ ''جمال مصر'' از نیاز حیدر سنہ اشاعت 1956ء دہلی

18 تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ مشمولہ شعلۂ آوارگی مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس

19 قمر رئیس۔شعلۂ آوارگی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

20 ظفر الدین ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' ص 125 پرنٹ آرٹ، دہلی 1995ء

21 ظفر الدین ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' ص 130 پرنٹ آرٹ، دہلی 1995

22 ظفر الدین ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' ص 130 پرنٹ آرٹ، دہلی 1995

23 ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''نیاز حیدر زندہ ہے'' ص 151 مضمون مشمولہ ''ادبی تناظر''

24 قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 9 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی 2002ء

25 قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 11 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی 2002ء

26 قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 13, 14, 15 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی 2002ء

27 قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 15 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی 2002ء

28 قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 12-11 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی 2002ء

29۔ قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 13 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی نئی دہلی 2002ء

30۔ ڈاکٹر قمر رئیس تعارف ''نغمہ جمال زمیں'' ص 14 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی نئی دہلی 2002ء

31۔ قمر رئیس ''نغمہ جمال زمیں'' ص 73 نیاز حیدر میموریل سوسائٹی نئی دہلی 2002ء

32۔ نیاز حیدر، غزل مشمولہ ''شاہکار'' وارانسی بابت ستمبر 1971ء ص 116 مدیر محمود احمد ہنر

33۔ قمر رئیس۔ مقدمہ۔ شعلۂ آوارگی ص 10 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

☆☆☆

باب ششم

ازبکستان اور قمر رئیس

"قمر رئیس نے بین الاقوامی کلچر کے فروغ اور استحکام میں جو خوبصورت اور اہم ترین خدمات انجام دی ہیں وہ بے مثال ہیں جس کے لیے ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔"[1]

ان خیالات کا اظہار ازبیکستان سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی زبانوں کے ریسرچ اسکالر جناب کھ۔این۔کمالوف نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس اُردو زبان وادب کے استاد ہیں۔ ہندوستان میں اگر اُن کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے تو یہ کوئی اہم بات نہیں سمجھی جائے گی۔ اسے اُردو کے حوالے سے ہندوستان کے ایک استاد کی خدمات کا اعتراف سمجھا جائے گا۔ لیکن جب ازبیک اسکالر اس طرح کے استاد اور ہندوستان کے نمائندے کی خدمات کا اعتراف اپنے ملک کے حوالے سے کرے تو یہ ایک غیر معمولی بین الاقوامی واقعہ بن جاتا ہے۔

ہندوستان اور ازبیکستان کے تعلقات کی قدامت کا بیان کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس اپنے ایک انگریزی مقالے میں لکھتے ہیں:

"یہ کہنا صحیح نہیں کہ زمانہ قدیم کے ہندوستانی شعراء وادبا ترکی زبان نہیں جانتے تھے۔زمانہ قدیم میں ہندوستانی شعرا نے ترکی زبان میں عبور حاصل کرنے میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی۔یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی لائبریری میں لغات ترکی فارسی اور ترکی ہندی کی بارہ جلدیں مخزون ہیں۔

یہ اس بات کا عین ثبوت ہے کہ ہندوستان میں ترکی زبان سیکھنے کا رواج تھا۔اگر ہندوستان بھر میں موجود کتب خانوں کے مخطوطات کی تلاش کی جائے تو مزید کتب دستیاب ہوں گے۔"2

ازبیکستان نے دسمبر 1991ء میں سوویت جمہوریہ روس سے براءت حاصل کی اور آج دنیا کے نقشہ پر آزاد ملک کی حیثیت سے موجود ہے۔اس کی سرحدیں قزاخستان، کرغستان، تاجکستان، افغانستان اور ترکمانستان سے ملتی ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس وسط ایشیا کے جغرافیائی تناظر میں ازبیکستان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وسط ایشیا کے مرکز میں واقع ازبیکستان سوویٹ یونین کی ایک خود مختار اشتراکی جمہوریہ ہے۔اس میں سمرقند، بخارا، خوارزم، خیوا، فرغانہ، اندیجان، خوقند اور تاشقند جیسے تاریخی شہر شامل ہیں۔ اس خاک سے رودکی، امام ابوحنیفہ، البیرونی، بو علی سینا، الغ بیغ، علی شیرنوائی، بابر اور تیمور جیسے شاعر، عالم، حکیم اور فاتح اُٹھے ہیں۔ اس کے تہذیبی سرچشموں میں عرب، ایران اور ترکی ہی نہیں، ہندوستان اور چین کی قدیم تہذیبوں اور فکری تحریکوں کا بھی نمایاں اثر رہا ہے۔ "3

اس اقتباس میں پروفیسر قمر رئیس نے جن ناموں کا ذکر کیا ہے وہ تمام عالمی ادب اور تہذیب و تاریخ کے نمائندہ ادیب، شاعر، فلاسفر اور حکمراں ہیں جن کے نام سارے عالم میں عزت و احترام سے لیے جاتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے ازبیکستان کے تہذیبی سرچشموں کا بیان کرتے ہوئے ہندوستان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ہندوستان کے قدیم باشندے یقیناً دراوڑ تھے لیکن بعدازاں آریا قبائل ہندوستان آئے اور یہیں بود و باش اختیار کی۔ ہندوستان کی تقریباً تمام مذہبی تصانیف انہی آریانسل کے مذہبی رہنماؤں نے مرتب کی ہیں۔قمر رئیس اپنے مضمون "جدید ازبیکی شاعری" میں بطور تخمیہ یہ انکشاف کرتے ہیں کہ آریا قبائل وادیٔ فرغانہ اور آمودریا کے مقامات کے رہنے والے تھے:

"یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ سوویٹ ماہرین آثارقدیمہ وسط ایشیا خصوصاً وادئ فرغانہ اور آمودریا کے بعض ساحلی مقامات کی کھدائیوں اور ان میں دستیاب اشیا اور پنجروں کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تین ہزار سال سے دو ہزار سال قبل مسیح کے درمیان ہندوستان آنے والے آریا قبائل وسط ایشیا کے انہیں علاقوں سے آئے تھے۔ ان ماہرین آثار قدیمہ میں بورس لت ونسکی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس نے وسط ایشیا اور وسطی ہندوستان میں دستیاب ہونے والے ظروف اور اوزاروں میں مشابہت کے مطالعے سے اس نظریے کی توسیع کی ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ ہندوستان میں آنے والے اولین دور کے آریا قبائل بھی دھات کا استعمال جانتے تھے۔"4

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے آمودریا سے آریاؤں کی ہندوستان آمد کو تین ادوار قرار دیتے ہوئے ہندوستان کی قدیم لسانیات میں ہونے والی تبدیلی کا بیان کیا ہے۔ ہندوستان کی تقریباً تمام جدید زبانیں آریاؤں کی آمد کی ہی بنا پر ارتقا پائی ہیں۔ ہندوستان کے بعض تہذیبی تاریخ کے ماہرین آریا قبائل کی اس آمد سے انکار کرتے ہیں اور آریا قبائل کے وسط ایشیا سے وابستگی کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس ان مورخوں سے واقف و باخبر ہیں چنانچہ ازبیک اور قدیم ہندوستان کے تعلقات کا سراغ لگاتے ہوئے وہ یہ اطلاع بہم پہنچاتے ہیں کہ ازبیک صرف شہنشاہ بابر کے ہمراہ ہندوستان نہیں آئے بلکہ گزشتہ ڈیڑھ ہزار برس سے ہندوستان اور ازبیکستان کے درمیان آمدورفت اور تہذیبی وثقافتی لین دین کے شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ازبیک لوگ صرف ظہیرالدین محمد بابر کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے۔بلکہ اس سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے وسطی ایشیا کے اس خطہ سے ہندوستان کے گہرے روابط قائم ہو گئے تھے۔ اگر وسطی ایشیا کے میدانوں سے ہندوستان کی طرف آریوں کی ہجرت کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی پہلی صدی ق ۔م سے تیسری صدی عیسوی تک کشان حکمرانوں کے عہد میں

یہ خطہ تہذیبی اور سیاسی طور پر ہندوستان سے بہت قریب رہا۔ خود کشان بادشاہ جن کی حکومت شمالی ہندوستان ' افغانستان' کشمیر اور وسطی ایشیا کے بڑے حصے پر تھی' نسلاً ترک تھے۔ جیسا کہ راج ترنگنی میں کہا گیا ہے۔'' 5

جدید ہندوستان کی تاریخ میں ڈاکٹر تاراچند کو عظیم ہندوستانی مورخ و محقق قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والوں کے فکر و تخیل اور کردار کی سند ڈاکٹر تاراچند کی تقریر سے مہیا کی ہے:

''ڈاکٹر تاراچند نے ایک خطبہ میں اعتراف کیا ہے کہ وسطی ایشیا کے وسیع و عریض میدانوں اور چراگاہوں سے ہجرت کرکے آنے والے یہ ترکستانی' ایرانی اور عربی النسل مہاجروں سے مختلف تھے۔ ان کا فکر و تخیل کشادہ' احساس جمال شائستہ اور کردار زیادہ رواداری کا حامل تھا۔'' 6

ایشیا اور یورپ کو جو شاہراہ جوڑتی ہے وہ ''شاہراہ ریشم'' کے نام سے معروف ہے۔ اسی شاہراہ ریشم کے کنارے ازبکستان کے کئی شہر شاد و آباد ہیں۔ قمر رئیس ہندوستان سے ازبکستان کے تہذیبی سرچشموں کی آویزش و آمیزش کا بیان کرنے کے بعد قدیم ازبکستان کی صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ازبیکستان کے کئی شہر عظیم ریشم شاہراہ کے کنارے واقع ہیں جو چین کو یورپ سے ملاتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ یورپ نے چین سے کاغذ بنانے کا جو فن سیکھا وہ ازبیکستان ہی سے وہاں گیا۔ شیشہ سازی کے ہنر میں بھی ازبیک لوگ یکتا تھے۔ عربی' ریاضی' طب اور فلکیات کو یہاں کے عالموں نے بڑا فروغ دیا۔ جنہیں بعد میں عہد وسطیٰ کے یورپ نے سیکھا۔'' 7

ازبیک قوم کی اس ترقی کے اسباب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر دیویندر کوشک نے لکھا ہے کہ اس ترقی کے پیچھے اس قوم کی صدیوں پر محیط انتھک محنت اور سعی و جستجو کارفرما رہی ہے۔ وسطی ایشیا کے تناظر میں ازبیکستان کی ترقی کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر دیوندر کوشک لکھتے ہیں:

''صدیوں تک وسطی ایشیا کے لوگوں نے اپنی شاندار ثقافت کو پروان چڑھایا اور زراعت ' آبپاشی ' فنون' دستکاری' علوم دینی' ادب اور فن جنگ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کا مقابلہ کسی بھی دوسری قدیم اور ازمنہ وسطیٰ کی ثقافت سے کیا جا سکتا ہے۔''8

لیکن ازبکستان پرایک عرصہ ایسا بھی آیا کہ رہنماؤں کی مجہول سرپرستی کی وجہ سے ترقی زوال میں بدل گئی۔ تہذیب وثقافت کا ارتقاایک ہی جگہ تھم سا گیا۔طبقاتی کش مکش' سیاسی عدم استحکام' معاشی عدم مساوات نے اس ملک کی تاریخ کو ماند کر دیالیکن بہت جلد ازبیک عوام نے کروٹ لی اور پھر ایک مرتبہ اپنی تہذیب' اپنی ثقافت' اپنی تاریخ کو کامیابی وکامرانی سے سجایا سنوارا۔

1923ء 1934ء میں جب وسط ایشیا کی مملکتیں اور خصوصاً ازبکستان چھ برس کی مسلسل خانہ جنگی کے بعد عظیم روس میں شامل ہوگئیں اور اس وفاق کی وجہ سے ازبیک عوام پھر ایک مرتبہ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اشتراکی انقلاب سے قبل ازبکستان کے حکمرانوں کے حالت زار اور عوام کی افلاس و بے سروسامانی کا بیان وتجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اشتراکی انقلاب سے پہلے اس علاقے کے لوگ خانوں' زمینداروں اور ملاؤں کے استحصال اور مظالم کا شکار ہو کر جہالت ' افلاس و بے سروسامانی کی جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آج بھی وہ یقین دلانے کے لیے نان نمک اور پانی کی قسم کھاتے ہیں جو اپنی کمیابی کی وجہ سے ان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت' تقدس اور قیمت رکھتے تھے۔ اس صورتحال نے ان میں محنت 'برداشت' جفاکشی اور خطر پسندی کی صلاحیت پیدا کی اور صدیوں کے مشترکہ دکھوں کے احساس نے ان کے دلوں میں انسانیت اور اخوت کے مقدس جذبات کو زندہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کی کامیابی کے بعد 1918ء میں جب سرخ فوجوں نے اس زمین پر

قدم رکھا تو سارے محنت کش عوام ان کے ساتھ ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس علاقے میں زار شاہی حاکموں' خانوں' زمینداروں اور مذہبی علما کا فرسودہ اور جابرانہ تسلط ختم ہو گیا۔'' 9ے

ازبیکی اور روسی ہر دو زبانیں یہاں بولی جاتی ہیں۔ وہاں آبادی کا 97 فیصد طبقہ زیور تعلیم سے آراستہ ہے اور اس اعتبار سے ازبیکستان کو پوری دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ زرخیز مٹی کی بدولت زراعت کے میدان میں بھی اس ملک نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی ہے۔ حالانکہ یہاں کی زراعت مصنوعی آبپاشی پر منحصر ہے۔ سابق سوویت یونین میں کپاس اہم فصل تھی اور پیداوار کے اعتبار سے اسے دنیا میں تیسرا مقام حاصل تھا۔ کپاس کی یہ کاشت دراصل ازبیکستان ہی کے علاقے میں ہوتی تھی۔ سابق سوویت یونین میں 65 فیصد کپاس' 50 فیصد چاول اور تمام اہم فصلوں کا 60 فیصد حصہ سرزمین ازبیکستان ہی سے فراہم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس بتاتے ہیں کہ اشتراکی نظام سے وابستگی کے بعد کی نصف صدی ازبیکستان میں اشتراکی نظام ہی کا تعمیری دور نہیں ہے بلکہ جدید ازبیکی زبان اور شاعری کے فروغ کا زمانہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''گزشتہ نصف صدی کا زمانہ ازبیکستان میں اشتراکی نظام کی تعمیر کا دور ہے اور یہی زمانہ ازبیکی زبان میں جدید شعر و ادب کی تشکیل اور فروغ کا زمانہ بھی کہا جائے گا۔ اس لیے جدید ازبیکی شاعری اور اس کے رجحانات کے مطالعے میں' اشتراکی سماج کی تعمیر کے اس دور کے چند حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔'' 10ے

ازبیکستان میں اشتراکی انقلاب کے بعد ہونے والی ترقی کے تناظر میں ڈاکٹر قمر رئیس ازبیک عوام کے سیرت و کردار کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے کردار میں توازن' فطرت میں بچوں کی سی معصومیت اور روح میں رزمیہ نغمہ کی سی دل نوازی' حوصلہ خیزی اور بلند آہنگی ہے۔ ان کی حالت اس مسافر کی ہے جو

برسوں کسی تپتے ہوئے بے آب و گیاہ ریگستان میں سفر کرنے کے بعد اچانک ایک غیر آباد لیکن شاداب وادی میں پہنچ جائے اور پھر وہاں اپنی تخلیقی محنت سے باغبانی اور چمن بندی کر کے زمین کو رشک ارم بنائے ' نئی فصلیں کاٹے اور ہر نئی بہار میں نئے جوش و خروش سے جشن نوروز منائے۔ ازبیک عوام کو اپنی اشتراکی محنت کی فتوحات پر بجا طور پر ناز ہے۔ ان کی سیدھی سادی غیر طبقاتی لیکن محنت ' جفاکشی اور عزم و حوصلے سے معمور زندگی کی تخلیقی ترجمانی کا نام ہی جدید ازبیکی شعروادب ہے۔"11ـ

ازبکستان میں ازبیک زبان کے علاوہ ترکی اور فارسی کا چلن زمانہ قدیم سے ملتا ہے۔ خصوصاً فارسی نے ازبیک زبان و ادب پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اُردو ہی کی طرح ازبیک ادیب وشعرا نے فارسی شاعری کے موضوعات اوراس زبان میں مروجہ اصناف ادب کو بھی نہ صرف اپنایا بلکہ اپنی فارسی اصناف شعر کو اپنے لیے منتخب کیا۔ قمر رئیس نے مندرجہ بالا اقتباس میں جدید ازبیک شعروادب کو جاگیردارانہ یا بورژوا معاشرے کے زیر اثر پروان چڑھنے والے اصول نقد کے تحت جانچنے اور پرکھنے کو غلط قرار دیا ہے۔ دراصل انہیں ازبیک زبان وادب کی روایت کا پورا پورا علم واندازہ ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ازبیک ادب کے ماخذ وامتیازات کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قدیم ازبیکی شاعری اُردو کی کلاسیکی شاعری کی طرح فارسی کے زیراثر غزل' قصیدہ' مثنوی اور رباعی جیسی اصناف پر مشتمل ہیں۔ اس کا تخیلی سرمایہ تشبیہات ' تلمیحات' استعارے کنایے بڑی حد تک فارسی سے ماخوذ ہیں۔ سولہویں صدی کے اور ازبیکی شاعری کے اولین دور کے شاعر بابرؔاور نوائیؔ کے کلام میں بھی امردپرستی کے رجحان اور جذبات کا کھلا او ربے محابہ اظہار ملتا ہے۔ تصوف اور معرفت کے مضامین کم سے کم ہیں۔ ایہام اور رعایت لفظی کی کثرت ہے۔ مطرب و ساقی اور بادہ و مستی کے مضامین اور زاہدومستحب پر اسی طرح طنز ہے جو قدیم اُردو شاعری کا خاصہ ہے لیکن

اس کے ساتھ ساتھ وطن پرستی' انسان دوستی اور دردمندی کا
جذبہ بھی قدیم ازبیکی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔"12؎

ازبیک ادب کی فارسی روایت کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قمر رئیس نے قدیم ازبیک شعریات سے مثالیں بھی درج کی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے متذکرہ بالا مقالے میں جدید ازبیک شعرا و ادبا اور ڈرامہ نگار فنکاروں کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ ازبیک شاعری کے موضوعات پر بھی بھرپور اظہار خیال کیا ہے۔ ازبیک شاعری کے مطالعے اور تجزیے کے بنا پر قمر رئیس اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ازبیکستان کے شعری سرمایہ کو ایشیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ادب کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"انقلاب سے پہلے جس زبان کا سرمایہ ادب چند دواوین اور مثنویوں تک محدود تھا آج اس کے جدید شعر و ادب کو ایشیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے فن و ادب کو جو انسانی ذہن کی اعلیٰ ترین تخلیق ہے ایک مخصوص گروہ کے اجارے سے نکال کر عام اور محنت کش انسانوں تک پہنچایا۔ ازبیک ادیبوں اور شاعروں نے شیکسپیر' گوئٹے' خیام' حافظ' کالی داس' غالب' پشکن' ٹیگور اور اقبال کے شاہکاروں اور دُنیا کی دوسری زبانوں کے قدیم اور جدید فن پاروں کے ترجمے کر کے اپنی زبان کو عالمی ادب کے معیاروں سے آشنا کیا۔ ان کے ادب میں ایسی تازگی' روشنی اور قوت ہے جو زندگی اور فن دونوں کے احترام اور دونوں کے حسن کارانہ تخلیقی امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔"13؎

1991ء میں آزادی پانے کے بعد تاریخی و تہذیبی اعتبار سے اہم شہر تاشقند کو ملک کا دارالسلطنت قرار دیا گیا۔ ازبیکستان کے دیگر علاقوں اور تاشقند میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور ایسی شخصیتوں نے جنم لیا جنھوں نے دنیا میں شہرت اور عزت کے پرچم لہرائے اور جہاں کہیں بھی سکونت اختیار کی گل سرسبد بن کر رہے۔ سمرقند' بخارا' خوارزم' فرغانہ' اندیجان' خوقند اور تاشقند جیسے تاریخی شہروں سے' امام ابوحنیفہ' البیرونی' رودکی' بوعلی سینا' علی شیر

نوائی، الغ بیگ، بابر اور تیمور جیسی تاریخ ساز ہستیاں پیدا ہوئیں اور سارے عالم میں اپنے کارناموں سے اپنی شناخت بنائی۔ اس ملک کی قدیم تہذیبی وثقافتی تاریخ کے ساتھ ساتھ موجودہ طرز زندگی، تہذیب میں دلچسپی رکھنے والے ساری دنیا کے ماہرین ومورخین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ یہاں کی تعمیرات، باغات، آب وہوا، خوشگوار فضا، رہن سہن، رکھ رکھاؤ، میل جول اور یہاں کے دیو مالائی قصے، داستانیں وغیرہ اپنے آپ میں امتیازی خصوصیت رکھتی ہیں۔ یہاں کی موسیقی، مصوری، نقاشی، رقص اور ادب وشعر ساری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین ازبکستان کی تاریخ تہذیب اور ادبی روایات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ازبیکستان کو زمانہ قدیم سے اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی عہد میں اس علاقے نے اعلیٰ پائے کے سیاسی مہم آزما اور اہل قلم پیدا کیے۔ اس علاقے کی روایات میں میر علی شیر نوائی اور بابر کے نام تابندہ ہیں۔ یہاں شاعری کی روایت ہمشہ زندہ رہی لیکن، اشتراکی نظام نے اسے نئی زندگی عطا کی ہے۔ تاشقند اس وقت روس کا بہت ہی اہم علمی اور تہذیبی مرکز ہے اور مشرق علوم پر تحقیقات کا ایک عظیم الشان ادارہ وہاں قائم ہے جہاں وقتاً فوقتاً قدیم ترین قلمی کتابوں کی نمائشیں ہوتی رہتی ہیں اور شعراء کی یادگاریں منائی جاتی ہیں۔ ابوالقاسم لاہوتیؔ وہیں اپنے دن گزار رہا ہے۔ ترمون زادہؔ اور غفور غلامؔ کی شاعری وہیں پروان چڑھ رہی ہے۔ ابھی کچھ دن قبل تک صدرالدین عینیؔ کی تصانیف نے سارے روس میں دھوم مچا رکھی تھی۔ عینی کی بعض کتابوں کے ترجمے ہندی میں بھی ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہاں شیکسپیئر، مولیرؔ، بائرن کو بھی والہانہ شوق سے پڑھا جا رہا ہے۔"[14]

پروفیسر احتشام حسین نے متذکرہ بالا مقالہ 1956ء میں یعنی ازبکستان کی آزادی کامل سے تقریباً 42 برس قبل لکھا تھا۔ اُنہوں نے ازبکستان میں اشتراکی انقلاب کے بعد کی ادبی صورتحال کا بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے انقلاب کے بعد ازبیک عوام کی زندگی اور ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا پتہ لگانے کی سعی کی ہے کہ

انقلاب کے بعد تخلیق ہونے والے ادب میں قدیم ادب وتہذیب کی روایت کی پاسداری کس حد تک کی گئی ہے۔

> ”انقلاب کے بعد ازبیک عوام کی زندگی میں جو تبدیلی اور تہذیبی ترقی ہوئی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت میرے نزدیک ہمواری' توازن اور تناسب ہے۔ اُنہوں نے ماضی کی روایات اور تہذیبی ورثے سے وہ صحت مند عناصر چن لیے جو نئی زندگی اور اشتراکی سماج کی تعمیر میں معاون یا کم از کم بے ضرر تھے۔ اُنہوں نے اشتراکی سماج اور ایک نئے انسان کی تعمیر میں مادی خوشحالی ' اخلاقی استواری اور روحانی آسودگی کے آدرشوں کو یکساں طور پر عزیز رکھا۔ اور ان کی باہمی کش مکش اور تضاد کو مٹایا۔ نئے ازبیکستان کی قومی زندگی اور تہذیب کی ہرسطح پر جو آسودگی ' عافیت ' فراغت ' خوش ذوقی ' سادگی ' بے ریائی اور بلند حوصلگی ہے وہ اسی حسن تناسب کا مظہر ہے۔ اس منصفانہ ' مساویانہ جمہوری اشتراکی معاشرے کے شعروادب کو جاگیردارانہ یا بورژوا معاشرے میں پیدا ہونے والے ادب کے معیاروں پر پرکھنا میرے نزدیک غلط ہوگا۔[15]

تہذیبی وتاریخی اہمیت کے حامل اس ملک میں قمر رئیس نے چار قسطوں میں مجموعی طور پر اپنی زندگی کے 12 بیش قیمت برس فرائض منصبی کی خوش اسلوبی کے ساتھ ادائیگی کرتے ہوئے اس طرح بتائے کہ ازبکستان کو وہ اپنے وجود میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ پہلی مرتبہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے ہند۔روس ثقافتی تبادلہ پروگرام کے تحت شعبہ السنہ ہند اورینٹل فیکلٹی آف اسٹیٹ یونیورسٹی تاشقند میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ستمبر 1962ء سے جون 1966ء کے عرصہ میں خدمات انجام دیں۔ دوسری دفعہ ستمبر 1970ء سے جون 1972ء تک انہوں نے اسی یونیورسٹی میں فرایض انجام دیئے اور تیسری بار ستمبر 1982ء سے جون 1983ء تک اسی عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔

1991ء میں سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد ازبکستان کے ایک علیحدہ اور آزاد ملک بن جانے کے کچھ

عرصہ بعد راجدھانی تاشقند میں ہندستانی سفارت خانہ اور کلچرل سنٹر قائم کیا گیا۔ قمر رئیس 1997ء میں دہلی یونیورسٹی کی توسیع شدہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے اس موقع پر حکومت ہند نے انہیں ازبکستان میں انڈین کلچرل سنٹر کے پروقار عہدے ڈائرکٹر کی ذمے داری تفویض کی۔ قمر رئیس نے بحیثیت ڈائرکٹر انڈین کلچرل سنٹر پانچ برس بحسن و خوبی خدمات انجام دیں۔ اس طرح تاشقند میں قمر رئیس کے قیام کی مدت بارہ برس ہوتی ہے۔ انہوں نے آخری پانچ برس ازبکستان میں ہندوستان کے ایک اعلیٰ ثقافتی عہدیدار کی حیثیت سے بتائے۔ تاہم انہیں ازبکستان سے جو والہانہ لگاؤ پیدا ہوا ہے' اُس میں اُن کے پہلے تین اسفار نے کلیدی کردار نبھایا ہے۔ اُن تینوں ہی مواقع پر وہ اردو کے ایک استاد کی حیثیت سے وہاں گئے تھے اور اُن کے گرد محبت کرنے والے شاگردوں کا حلقہ بن گیا تھا جو بہت وسیع تھا اور قمر رئیس ان طلبہ کے ایک ہردلعزیز استاد قرار پائے تھے۔ ازبکستان میں انہوں نے بے شمار طلبہ و طالبات کو اردو پڑھائی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ازبکستان میں اردو تعلیم کے آغاز و فروغ کا سہرا قمر رئیس ہی کے سر بندھتا ہے۔ ازبکستان کے ادب دوستوں اور شاگردوں نے انہیں بے پناہ پیار دیا اور وہ خود بھی ازبکستان اور وہاں کے باشندوں سے غیر معمولی محبت انسیت و عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سرزمین سے متعلق اپنی پہلی نگارش ازبکستان اور علی شیر نوائی کے دیباچہ میں ازبکستان اور اپنے تعلق خاطر کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" میں نے اس کے حسین اور دلکشا آغوش ...اس کے تاریخی شہروں 'سر سبز کوہستانی سلسلوں 'اسکے رنگا رنگ موسموں' بہار و خزاں کی البیلی ہوائیوں اور اس کی گل اندام حسینائوں سے پیار کیا ہے۔وہاں کی قدیم بستیوں کے حسین کوچوں اور پُررونق الف لیلوی بازاروں میں اپنائیت اور محبت کی فصلیں کاٹی ہیں۔اسکے پر فضا اور خوبصورت چائے خانوں میں پہروں خوش گپیاں کی ہیں۔ دور دراز کی دیہی بستیوں میں افسانوی میزبانی کی انجانی مسرتوں سے ہمکنار ہوا ہوں ۔تاشقند کی شاید ہی کوئی گلی' کوئی بستی ایسی ہو 'جہاں اردو زبان سے محبت کرنے والے میرے عزیز طالب علم نہ ہوں' اور پھر بہت ہی مخلص اور دلدار میرے رفقائے کار

اور دوست جن میں سب کچھ ...پردئہ خاک میں پنہاں ہو چکے ہیں۔ان سب کے مسکراتے چہرے بہار کے خوش رنگ اور شاداب پھولوں کی طرح آج بھی نظروں کے سامنے ہیں۔ان سب نے مجھے ہندوستانی دوست کی حیثیت سے بڑی عزت دی ہے'پیار دیا ہے۔از بیکستان میرا ماضی نہیں۔وہ میرے وجود میں سانس لیتا ہے۔''16

قمر رئیس کی ازبیکستان ۔ سے بے پناہ محبت اور لگاؤ سارے وسط ایشیا اور ہندوستان میں اظہر من الشمش ہے۔وہ ایک ذی علم ادیب ہی نہیں بلکہ روسی اور ازبیکی زبان سے کما حقہ واقف و باخبر ہیں۔اور اسی لیے انہوں نے وہاں کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا راست انہیں کی زبانوں میں مطالعہ کیا۔کسی بھی ادب کو اس کی اصل زبان میں پڑھنے اور سمجھنے کی کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ترجموں میں کئی بار مصنف اور قاری کے درمیان مترجم حائل ہو جاتا ہے اور کبھی مترجم کا نقطہ نظر موضوع میں ابہام پیدا کر دیتا ہے۔قمر رئیس نے ازبیکستان کے ادیبوں کے اُنہیں کے شہر میں رہ کر اُنہیں کی زبان میں پڑھا چنانچہ زبان کے ساتھ ساتھ ادب کے تہذیبی و سماجی پس منظر اور اُس کے بین السطور موجود مفاہیم کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ازبیکستان کے ادب نے قمر رئیس کو بے انتہا متاثر کیا ہے خاص طور پر وہاں کی شاعری سے وہ خصوصی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔وہاں کی شاعری میں قمر رئیس کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپریل 1968ء میں جب اُن کے مضامین کا پہلا مجموعہ 'تلاش و توازن' شائع ہوا تو اس میں جدید ازبیکی شاعری پر تیس صفحے کا ایک طویل لیکن مبسوط مقالہ بھی شامل تھا۔انہوں نے دیبا۔چہ میں لکھا ہے کہ یہ مضمون 1965ء میں تاشقند کے زمانہ قیام میں ہی شروع کیا جا چکا تھا یعنی ازبیکستان پہنچنے کے ساتھ ہی انہیں وہاں کے ادب نے صرف اپنی جانب متوجہ ہی نہ کیا تھا بلکہ انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔جدید ازبیکی شاعری پر مذکورہ مضمون کے علاوہ 1968ء ہی میں انہوں نے ازبیکستان کے قومی اور سب سے ممتاز انقلابی شاعر غفور غلام کی نظموں کا ترجمہ ''ارمغان تاشقند'' کے نام سے شائع کیا۔انہوں نے سوویت ازبیکستان کے پچیس (25) اہم شاعروں کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ بھی کیا جسے انہوں نے ''شعرائے ازبیکستان'' کے نام سے 1973ء میں تاشقند سے شائع کیا۔اسی کے ساتھ

ازبیکی زبان میں قمر رئیس کی نظموں کا ترجمہ ''اشعرلار'' کے عنوان سے غفور غلام نے کاری اشاعت گھر تاشقند سے 1973ء میں شائع کیا۔قمر رئیس کی نظموں کے اس ازبیکی ترجمہ پر ممتاز ترقی پسند مفکر اور نقاد سجاد ظہیر نے پیش لفظ لکھا تھا۔ان کی کتاب October revolution:Impact On Indian literature کا ترجمہ ترقی اشاعت گھر ماسکو نے 1980ء میں روسی زبان میں شائع کیا۔قمر رئیس نے اردو اور روسی و ازبیکی ادب کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے ازبیکی شعرا و ادباء کا اردو میں اور اردو کے شعرا و ادباء کا ازبیکی میں بڑے پیمانے پر تعارف کرایا۔

اردو کے متعدد شعراء کے کلام کو ازبیکستان کے مترجم نے اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔قمر رئیس نے ازبیک زبان میں کیے جانے والے ایسے بیشتر تراجم شدہ تصانیف پر اپنے پیش لفظ' دیباچوں اور مقدموں کے ذریعہ دونوں زبانوں کے ادب کو قریب لانے کا مستحسن اقدام کیا ہے۔چنانچہ ازبیکی زبان میں کلام غالب کا جو ترجمہ ہوا اس پر قمر رئیس نے مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔انہوں نے اقبال' فیض' منٹو' مجاز' مخدوم' کرشن چندر' بیدی اور کئی دوسرے ادیبوں کی نگارشات کا انتخاب کر کے انہیں ازبیکی زبان میں ترجمے کے لئے ماحول سازگار بنایا۔ان خدمات کے بعد ہندوستان میں انہوں نے ازبیکستان اور وہاں کے ادب کے تعلق سے چار کتابیں شائع کیں جن میں ازبیکستان اور علی شیر نوائی (1994ء) ازبیکستان :انقلاب سے انقلاب تک (1997ء) بیسویں صدی کی ازبیک شاعری (2001ء) اور ظہیر الدین محمد بابر شخص' شخصیت اور شاعری (2002ء) شامل ہیں۔اس طرح قمر رئیس ازبیکستان کے حوالے سے چھ کتابوں کے مصنف' مترجم یا مولف ہیں اور جن میں سے ایک کتاب ازبیکی زبان میں اور دوسری روسی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔یہ تصانیف ازبیکستان اور ہندوستان کے حوالے سے انتہائی ٹھوس اور قابل ذکر کارنامے قرار دیئے جائیں گے۔بے شمار مضامین' مقدمے' تقریظ' اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی رہنمائی ان کارناموں سے علیحدہ اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔

قمر رئیس کو جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملا انہوں نے ازبیکستان اور وہاں کی تہذیب و ثقافت اور ادب کی تفسیر و تعبیر کی ہے۔اس ضمن میں ہند ازبیکستان فرینڈ شپ سوسائٹی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔قمر رئیس نے یہ

سوسائٹی 1994ء میں تشکیل دی تھی۔ انہوں نے اپنے شاگرد ڈاکٹر خالد اشرف کے تعاون سے سوسائٹی کے اصول و ضوابط مرتب کیے اور پھر اس سوسائٹی کا باقاعدہ طور پر رجسٹریشن کرایا۔ سوسائٹی میں قمر رئیس اور خالد اشرف کے علاوہ جناب اندر کمار گجرال، کنور سٹور سنگھ، پروفیسر رشید الدین خان اور بیگم حامدہ حبیب اللہ بحیثیت عہدیدار شامل ہیں۔ اس سوسائٹی کے تحت 1994ء سے 1997ء تک متعدد پروگرام منعقد کیے گئے۔ 1997ء میں قمر رئیس کے ڈائریکٹر انڈین کلچر سنٹر تاشقند نامزد ہونے کے بعد وہ پانچ برس کے لیے تاشقند روانہ ہوئے۔ اُن کے غائبانے میں پانچ برس تک دہلی میں تشکیل شدہ اس سوسائٹی کی سرگرمیاں بند ہوگئی تھیں۔ اب جبکہ وہ دہلی واپس ہو چکے ہیں یہ سوسائٹی پھر سے متحرک ہوگئی ہے اور قمر رئیس کی ازبکستان سے متعلق دو تصانیف یعنی ''بیسویں صدی کی ازبک شاعری'' اور ''ظہیر الدین بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع کی گئی ہیں۔

تاشقند میں اردو کے ایک استاد کی حیثیت سے قمر رئیس کی بے پناہ مقبولیت ہے۔ ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے قمر رئیس پر لکھے گئے ایک مضمون میں روس میں ان کی مقبولیت کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ روس میں ہندوستان کی خیریت دریافت کرنے والا ہر آدمی قمر رئیس کے بارے میں ضرور پوچھتا ہے۔ وہاں اردو بولنے والا ہر ایک شخص یا تو قمر رئیس کا شاگرد ہے یا ان کے شاگرد کا شاگرد ہے۔ مجتبیٰ حسین نے سوویت یونین کے ایک اشاعتی ادارے ''رادوگا'' میں اردو زبان کے سربراہ میاں رخصت الا ئیوغفور جہاں گستری کا' جو تاشقند میں مجتبیٰ حسین کے مترجم اور ترجمان تھے' ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> '' ابتدائی دو تین کلمات کے بعد ہی انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا ''کیا آپ پروفیسر قمر رئیس کو جانتے ہیں ؟'' مان لیجیے امیں یہ کہوں کہ میں پروفیسر قمر رئیس کو نہیں جانتا تو میرے اس بیان کا آپ پر کیا رد عمل ہوگا؟''
>
> وہ بولے ''تب تو مجھے آپ کی اردو دانی پر شک کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔'' 17

مجتبیٰ حسین نے اس طرح کے اور بھی کئی واقعات بیان کیے ہیں جن میں یقیناً اُن کا اپنا مخصوص طرز اظہار

بھی شامل ہے لیکن روسیوں میں قمر رئیس کی مقبولیت کا اندازہ خود ہندوستان آنے والے روسی ادیبوں اور فنکاروں اور یہاں مقیم اُردو داں سفارتکاروں کے رویے سے بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگ قمر رئیس کو بے پناہ چاہتے ہیں اور قمر رئیس بھی پوری طرح حق دوستی نبھاتے ہیں۔ اُن کی یادوں کے نہاں خانوں میں تاشقند کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ اپنے سفر نامے ''ازبیکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' میں رقم طراز ہیں:

> ''تاشقند کے گل رخوں اور ماہ وشوں کا حسن بے پناہ ہے۔اس لیے کہ صدیوں سے یہاں ایرانی ‘عرب اور ازبیک شیرو شکر ہو کر رہے ہیں۔یا سمینی ‘چمپئی‘گندمی اور گلا بی رنگتوں کی نسلیں اپنے حسین نقش ونگار ایک دوسرے کو دیتی رہی ہیں۔ شکلوں‘رنگوں اور خوشبوؤں کے پھو لو ں سے یہ چمن ہمیشہ کھلتا اور مہکتا رہا ہے 18ء... تا شقند کا قیام میرا ماضی نہیں ہے۔ اس کے حسین کو چوں‘ الف لیلوی با زا روں‘ بہارو خزاں کی البیلی ہوا وں اور اس کی گل اندام حسینا وں کی یادیں آج بھی میرے وجود میں دھڑکن کی طرح زندہ ہیں۔میرے دوستوں ‘رفیقوں اور عزیزطا لب علموں کے دمکتے ‘مسکراتے چہرے آج بھی میرے سا منے ہیں۔ بیکراں حسن اور محبتوں کا یہ گہوار ہ میری نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔19ء

قمر رئیس کا یہ سفر نامہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں قمر رئیس نے اگر چہ اپنے سفر کی تفصیل اور ازبیکستان میں قیام کے دوران پیش آئے نمائندہ واقعات بیان کیے ہیں لیکن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں انقلاب روس (1917) سے لے کر حالیہ انقلاب ازبیکستان کی آزادی (1991) تک کی روداد بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اور خصوصاً روس کے اکتوبر انقلاب (1917ء) کے بعد ساری دنیا میں نئے انقلابی تصورات فروغ پانے لگے تھے۔ روس میں عظیم اشترا کی انقلاب کے نتیجے میں لینن نے روسی زار شاہی حکومت کا تختہ الٹ کر خود قیادت سنبھالی اور عارضی اشترا کی حکومت قائم کردی۔ اس حکومت نے شروع ہی سے

نو آبادیاتی ظلم واستحصال کے خاتمے اور محنت کش عوام کو مساوی حقوق دلانے کی بات کی۔ ابتدا میں اس حکومت کو خانہ جنگیوں اور نظریاتی طور پر مخالف ممالک کی سازشوں کے صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا لیکن بالآخر حکومت مضبوط ہو گئی اور ایک طویل مدت تک وہاں امن وامان قائم و برقرار رہا۔ بنی نوع انسان کے احترام' انسانیت کی بقا' مساوات' دولت اور محنت میں توازن اور فرسودہ خیالات کی پسپائی کا یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ انقلاب روس 1971ء کے نتیجہ میں تقریباً پانچ چھ برس خانہ جنگی ہوتی رہی اور جب خانہ جنگی ختم ہوئی تو لسانی اور قومی بنیادوں پر از سر نو حد بندی کی گئی اور اسی حد بندی کے نتیجے میں سوویت اشتراکی جمہوریہ ازبکستان کا قیام عمل میں آیا۔ ازبکستان میں حکمراں بدلتے رہے مگر حکومت کا بنیادی نظریہ اور ترقی کی اصل رفتار ہمیشہ قائم رہی جو انسان دوستی' اخوت اور باہمی میل جول کی مثال بنی رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ 1991ء کا وہ انقلاب بھی سامنے آیا جس میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ وفاقی حکومت کی ریاستیں خود مختار ہوگئیں اور نئی نئی مملکتوں کا وجود عمل میں آیا۔ ازبکستان کو بھی آزادی حاصل ہوگئی۔ یہ بھی ایک علاحدہ اور خود مختار ملک بن گیا۔ قمر رئیس نے اپنے سفر نامے ''ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' میں ازبکستان کی تاریخ' تہذیب وثقافت کے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے دو انقلابوں کے درمیان اس ملک کی کہانی اور اس کے اثرات ونتائج بیان کیے ہیں اور اس تمام تفصیل کے باوصف لطف یہ ہے کہ یہ کتاب تاریخی دستاویز نہیں بلکہ قمر رئیس کا ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انہوں نے خوبصورت تخلیقی نثر میں اپنا اور اپنے ساتھ ساتھ ازبکستان کا سفر نامہ قلم بند کیا ہے۔ اس میں اُن کے اپنے احساسات اور بیکراں جذبات شامل ہیں۔ اُن کی اپنی آسودگیوں کے ساتھ ساتھ محرومیوں کا بھی بیان ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''چھ ماہ سے تاشقند میں دو چیزوں کو ترس گیا ہوں۔ ایک چڑیوں کی چہچہاہٹ اور دوسرے کسی خوش گلو موذن کی آواز۔ شاید اسی محرومی کی وجہ کبھی کبھی میں سارا دن چڑ چڑا سا رہتا۔ لیکن پھر اس کی تلافی ہو گئی۔ بلبل کی صدائے جاں سوز بھی سنی اور پرانے شہر اسکچوا میں موذن کی آواز بھی۔ موذن کی آواز سن کر کئی ماہ بعد میں نے جو نظم لکھی وہ ہندوستان میں شائع ہوئی۔ ''تحریک'' کے

مدیر گوپال متل نے اس کے حوالے سے ایک اداریہ بھی سپرد قلم کیا
کہ "کمیونسٹ کے اندر خوابیدہ مسلمان بیدار ہو گیا۔" 20

یہاں سوال یہ نہیں کہ کسی کمیونسٹ کے اندر خوابیدہ مسلمان بیدار ہوا یا نہیں؟ کسی ادیب و فنکار کے تعلق سے یہاں یہ بھی ایک لا حاصل بحث ہوگی کہ آیا اس کمیونسٹ نظریے کی حامل شخصیت کے اندر کا مسلمان پہلے سے بیدار تھا یا خوابیدہ؟ اصل بات تو یہ ہے کہ اس نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا اُس کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ کسی واقعے یا کیفیت کی پیش کش میں اُس کے یہاں کتنی تازگی، اثر انگیزی اور ترقی پسندی پائی جاتی ہے۔

قمر رئیس لکھتے ہیں کہ وہ چھ ماہ سے کسی خوش الحان کی آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ طلب صادق تھی۔ خدا نے اُن کے دل کی پکار سن لی اور پھر چھ ماہ کی تشنگی اس طرح سیرابی میں بدل گئی کہ قمر رئیس کی روح بھی سرشار ہو اُٹھی اور اُنہوں نے موسم بہار میں بلبل ہزار داستان کا نغمہ سنا۔ اقتباس دیکھئے:

" موسم بہار کے شباب میں بھی کسی مدھر آواز والے
پرندے کی آواز سے محروم تھا۔

اچانک وہ دن اور وہ لمحہ میرے حافظہ میں بجلی کی
طرح کوند گیا جب اسی شہر میں میں نے بلبل ہزار داستاں کا
پہلا نغمہ سنا تھا۔ میں شہر کے مضافات میں واقع ایک نو تعمیر
اپارٹمنٹ کے فلیٹ میں رہتا تھا فلیٹ کی پشت پر سیب اور
چیری کے باغات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ میں نے ڈائری
کھولی تو 1963ء کے ایک نوشتہ پر نظر پڑی۔

بلبل ہزرا داستان

24 مارچ 63ء روز یکشنبہ

" گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک نیم وا کھڑکی سے آنے
والی کسی اجنبی اور سہانی آواز نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔
اٹھ کر کھڑکی کھول لی۔ باغ میں بلبل از خود رفتگی کے عالم میں
نغمہ الاپ رہی تھی۔ میں نے اگرچہ آج زندگی میں پہلی بار بلبل
کی مدھر تان سنی تھی مگر فارسی اور اردو شاعری میں اس
آواز کی مدح و ستائش میں اتنا کچھ پڑھا تھا کہ اسے پہچاننے

میں ایک پل کی دیر نہیں ہوئی ۔اس کی درد بھری شیریں آوازدل میں تیر کی طرح ڈوبتی جا رہی تھی ۔میں سوچنے لگا یہ نغمہ بار ساحرہ کہاں سے آگئی ؟کل تک تو کچھ بھی نہیں تھا۔ایک نغمہ الاپنے کے بعد اس نے کچھ دیر کے لیے چپ سادھ لی۔میں ڈر گیا کہیں ایسا نہ ہو وہ اڑ جائے ۔لیکن دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے ایک دوسری لے میں دوسرا نغمہ شروع کر دیا۔محسوس ہوا جیسے اس نغمہ میں درد کچھ کم لیکن شیرینی اور جدت زیادہ ہے۔خاموشی سے اسے سنتا رہا اور سر دھنتا رہا۔اس وقت کسی دوسری شے کا مجھے ہوش نہ تھا۔پوری کائنات اور کائنات کا سارا حسن اس ''قفس رنگ'' کے درد بھرے گیت میں سمٹ آیا تھا۔اٹھارہ بیس منٹ کے وقفہ میں اس آسمانی پرندے نے کوئی پانچ چھ نغمے الاپے لیکن ہر نغمے کی دھن دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ہر نغمہ کا تاثر جداگانہ تھا۔جو دل کی گہرائی میں اتر جاتا تھا۔مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز میں جو سوز اور درد ہے وہ بے شک کوئل کی آواز سے مشابہ ہے لیکن قدرت نے اس کی آواز کو جو تنوع اور تخلیقیت عطا کی ہے وہ کسی دوسرے پرندے کو حاصل نہیں ۔وہ ایک بار جو نغمہ گاتی جو دھن بناتی ہے اسے پھر دہراتی نہیں ۔جبکہ کوئل کی پکار میں ہمیشہ ایک یکسانیت سی رہتی ہے۔''[21]

اقتباس طویل ہے لیکن اجنبی ملک میں قمر رئیس کی تشنگی اور پھر سرآبی کی ترجمانی کے لیے ضروری تھا کہ اس تحریر کو مکمل درج کیا جاتا۔قمر رئیس نے بلبل ہزارداستاں کی نغمگی اور اُس کی تاثیر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ماحول کی کیفیت اور دل شاعر کے محسوسات اور تطہیر جذبات کا بیان بھی پورے خلوص کے ساتھ کیا ہے۔قمر رئیس نے اسی صبح جس رات ''بلبل کی صدائے جاں سوز'' سنی تھی موذن کی آواز بھی سنی۔بلبل کے نغمہ کا بیان اوپر درج کیے گئے اقتباس میں آیا ہے۔قمر رئیس نے موذن کی اذان سننے کا تاثر اپنی مختصر آزاد نظم ''قید'' میں کیا ہے جسے اُنھوں نے ''صدائے مانوس'' کے عنوان سے معنون کیا ہے۔نظم دیکھیے:

''آج اسکیجوا کی بستی میں
اک صدا میرے کان میں آئی
صاف شیریں، متین اور مانوس
مڑکے دیکھا کہ صحن مسجد میں
اک موذن اذان دیتا ہے
مست لہروں کی گود میں جیسے
صبح دم، رات کا تھکا ہارا
کوئی ملاح گنگناتا ہو
خود ہی سنتا ہو خود ہی گاتا ہو'' 22

قمر رئیس نے اس کتاب میں انتہائی شگفتہ نثر کے ذریعے ازبیکستان کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھوسا جاتا ہے۔قاری خود کو بھی ازبیکستان کی الیلی اور الف لیلوی گلیوں میں گھومتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔کسی فنکار کا فنی کمال، تو یہی ہوتا ہے کہ وہ قاری کو اپنی تحریر سے باندھ دے اور اُسے پوری طرح Involve کر لے۔Involvement کی وہ انتہا بھی مناسب نہیں جہاں قاری اپنا وجود کھودے اور تحریر کی رو میں بہتا چلا جائے۔اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں۔قمر رئیس کی نثر، خاص طور پر اس کتاب کی نثر قاری کو محویت کی حد تک متاثر کرتی ہے مگر اس کے ہوش وحواس باقی رہتے ہیں۔منفرد انداز بیان اور لب و لہجے کی حامل یہ تصنیف ازبیکستان کی تاریخ کے باب میں ایک اہم سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

قمر رئیس نے اپنی اس تصنیف کو کہیں ڈائری (23) کہیں تزک (24) اور کہیں سفر نامہ (25) لکھا ہے اور لطف یہ کہ تینوں ہی تعریفیں صحیح ہیں۔دراصل قمر رئیس نے اپنے پہلے سفر ازبیکستان کے موقع پر یادداشت کے طور پر ڈائری لکھنا شروع کی جسے وہ 'تزک' بھی کہتے ہیں۔یہ اصطلاح یقیناً انہوں نے بابر سے اپنی ذہنی ہم آہنگی کی بنا پر تحریر میں استعمال کی ہے۔قمر رئیس نے چونکہ اپنی تزک کی مدد سے اس ملک کو کیے گئے اسفار قلم بند کیے ہیں اس لیے اسے سفر نامہ قرار دیا ہے۔ڈائری اور سفر نامہ کا امتزاج مشہور ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین نے بھی کیا ہے۔ احتشام حسین کی تصنیف ''ساحل اور سمندر'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''احتشام حسین نے اپنے امریکہ کے سفر سے متعلق تاثرات قلم بند کیے ہیں جس کا نام 'ساحل اور سمندر' ہے۔ یہ سفرنامہ اور ڈائری دونوں کی ملی جلی سی چیز ہے۔ اگرچہ اس میں خارجی مشاہدات کا بیان کم اور اپنی داخلی کیفیات کا عکس زیادہ نمایاں ہے۔ پھربھی امریکہ کے بجائے احتشام حسین کو سمجھنے میں یہ کتاب بہت مدد دے سکتی ہے۔'' 26؎

بیسویں صدی میں اُردو ادب سے تعلق رکھنے والے متعدد ادیب و شعرا نے ازبیکستان کی سیر کی اور اپنے سفر کی روداد کتابی شکل میں شائع کی ہے چنانچہ راقمۃ الحروف کو ذیل کے سفرناموں کا علم و اطلاع ہے:

1۔	لینن گراڈ تا سمرقند	از	عشرت علی صدیقی	1944ء
2۔	تاثرات روس	از	عبدالحامد قادری بدایونی	1957ء
3۔	مہ و سال آشنائی۔ یادوں کا مجموعہ	از	فیض احمد فیض	1958ء
4۔	روس میں آٹھ دن	از	احسان بی۔اے	1965ء
5۔	روس میں مسلمان قومیں	از	آباد شاہ پوری	1974ء
6۔	ماہ و روز۔ روزنامچہ سفر روس	از	حکیم محمد سعید	1980ء
7۔	سرخ اندھیروں میں	از	خلیل احمد حامدی	1981ء
8۔	کوہ قاف کے دیش میں	از	کوثر نیازی	1985ء

مندرجہ بالا فہرست میں صرف ایک تصنیف ایسی ہے جو درحقیقت سفرنامہ نہیں ہے۔ وہ ہے آباد شاہ پوری کی تصنیف ''روس میں مسلمان قومیں'' لیکن اس تصنیف کی حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے دوسرے ادیبوں کے لکھے سفرناموں ہی کی مدد سے اپنی کتاب مرتب کی ہے۔ اسی بنا پر اسے سفرنامے کے ضمن میں شمار کیا گیا ہے۔ ان تمام سفرناموں میں ''ازبیکستان انقلاب سے انقلاب تک'' بالکل منفرد حیثیت و مقام کا حامل ہے اس لیے کہ اس کا مصنف وہ ہے جس نے ازبیکستان کی سرزمین پر اپنے قدموں کے نشانات چھوڑے ہیں، جس کی سانسوں میں

ازبیکستان سانس لیتا ہے، جس نے روح کی گہرائیوں سے سرزمین ازبیکستان پر اپنی فکروآ گہی، تلاش وتوازن اور تعبیر وتحلیل کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

قمر رئیس اُردو میں لکھے گئے سفرناموں اور اپنے تحریر کردہ سفرنامہ کے مندرجات، موضوع اور مواد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گزشتہ دہوں میں اُردو میں جو سفرنامے لکھے گئے اور مقبول ہوئے اُن میں مصنفین نے مشاہدات کو بے کم و کاست بیان کرنے کے بجائے دلچسپی اور مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ نتیجہ میں اصل حقائق کچھ مسخ ہو کر سامنے آئے ہیں۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی ۔ جوکچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے کسی رنگ آمیزی یا حاشیہ آرائی کے بغیر سادگی سے بیان کر دیا۔ اور اخلاق یا نظریاتی نقطہ نظر سے بھی کسی واقعہ یا واردات پر پردہ نہیں ڈالا۔ زندگی کا حقیقت پسندانہ انکشاف میرے نزدیک بجائے خود دلچسپ ' حیرت زا اور رومان انگیز ہوتا ہے۔'' 27

قمر رئیس نے سرزمین ازبیکستان کے لیے انجام پائے اپنے اسفار کا بیان مختصر لیکن جامع انداز میں خود بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''اتفاق سے اُرد وکے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مجھے تاشقند میں 1962ء سے 1983ء تک کی مدت میں سات سال رہنے کا موقع ملا۔ اگست 1962ء میں جب میں پہلی بار گیا تو سوویت اشتراکی سماج کی ہر شے میرے لیے نئی عجیب اور حیرت خیز تھی۔ میں نے اپنے تاثرات اور تجربات ڈائری کی شکل میں لکھنا شروع کیے۔ ابتدا میں کچھ پابندی سے لکھتا رہا۔ بعد میں جب میں وہاں کی زندگی اور اس کے مظاہرمیرے لیے زیادہ اجنبی نہیں رہے تو ڈائری لکھنے کا معمول تقریباً ترک ہوگیا۔ کبھی کوئی اہم واقعہ متاثر کرتاتو لکھ لیتا۔

1983ء کے بعد بھی مجھے کئی بار ازبیکستان جانے اور وہاں کی سیر کرنے کا موقع ملا۔ جمہوری انقلاب کے بعد 1995ء میں مجھے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ تاشقند کے رکٹر ابراہیموو صاحب نے جدید ادب پر لکچر دینے کی دعوت دی۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر جہاں میں اپنے ازبیک احباب اور عزیز طلبہ سے ملا وہیں سیروسیاحت کے کئی پروگرام بھی بنے تاکہ جمہوری دور کی بدلتی ہوئی زندگی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اس سیروسفر کے تاثرات کو میں نے ایک سفرنامہ کی صورت میں ترتیب دیا۔ لیکن یہ صرف سفرنامہ نہیں۔ اس میں' میں نے اپنی تزک کے ان خاص نوشتوں کو بھی شامل کر لیا جو کسی نہ کسی پہلو سے وہاں کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غیرملکی زبانوں میں ازبیکستان میں انگریزی کے بعد اُردو ہندی اور عربی کو ہی سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔

1995ء کے سفرنامہ میں بھی جگہ جگہ تلازمہ خیال نے ماضی کے بہت سے نقوش کو اجاگر کر دیا ہے۔'' 28ؔ

قمر رئیس نے ''ازبیکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' کا آغاز مئی جون 1995ء کے واقعات سے کیا ہے اور پھر ناول کی فلیش بیک تکنیک سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حال سے ماضی کا سفر اختیار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا آغاز مئی جون 1995ء کے ''سفرنامہ'' سے ہوتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ میری اس ''تزک'' (Memoirs) کے وہ اوراق بھی شامل ہو گئے ہیں جن کی ابتدا 1962ء میں ہوئی تھی۔ لیکن تاشقند کا قیام میرا ماضی نہیں' اس کے حسین کوچوں' الف لیلوی بازاروں' بہاروخزاں کی البیلی ہواؤں اور اس کی گل اندام حسیناؤں کی یادیں آج بھی میرے وجود میں دھڑکن کی طرح زندہ ہیں۔''29ؔ

سرزمین ازبیکستان پر پہلی دفعہ قدم رکھنے کے بعد جو کچھ اُن کے ذہن ودل پر گزری اس کا بیان بھی اُنہوں نے بڑی سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"21 اگست 1962ء کو جب میں پہلی بار مہمان پروفیسر کی حیثیت سے تاشقند آیا تھا تو اسی شاہراہ سے گزر کر تاشقند ہوٹل پہنچا تھا۔ میں نے پہلی بار ایک سوویت ' اشتراکی ملک کی زمین پر قدم رکھا تھا۔ دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ حیرانی سے ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت یہ صاف' کشادہ سرخ پرچموں ' لینن' کارل مارکس' اینگلز اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں کی تصویروں اور مجسموں سے سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ کمیونسٹ پارٹی' سوشلزم' مزدوروں کے اتحاد اور محنت کی عظمت کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ میں گردوپیش کے ہر منظر میں اسی طرح اشتراکی معنی تلاش کر رہا تھا جس طرح ساختیاتی نقاد ادب پاروں کی خاموشیوں میں معنی ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن اب تاشقند تیزی سے بدل رہا تھا۔"[30]

قمر رئیس نے حال کے سفر سے ابتدا کرتے ہوئے ماضی کا سفر اختیار کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ اُنہوں نے ماضی کے تجربات اور حال کے ازبکستان کے مشاہدات کے ذریعہ مستقبل کے ازبکستان کے بارے میں بھی اشارے کیے ہیں۔

ازبکستان انقلاب سے انقلاب تک کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قمر رئیس کو اس ملک اور اس کی سرزمین سے جو انسیت اور روحانی لگاؤ ہے وہ اپنی جگہ لیکن اس ملک کے صدر مقام تاشقند کا جب وہ ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے عشق بلاخیز کا بیان کر رہے ہیں۔ اپنی تصنیف میں تاشقند کا ذکر اُنہوں نے بڑی اپنائیت سے کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"مشرق اور مغرب کے دوسرے شہر بھی میں نے دیکھے ہیں' لیکن جو اچھوتی رعنائی تاشقند کے حصے میں آئی ہے وہ کہیں نہیں۔ شاید اس لیے کہ یہ مشرق اور مغربی تہذیب کا سنگم ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ چین' ہندوستان' یونان' ایران اور خوارزم کی عظیم تہذیبوں کو گلے لگاتا رہا ہے۔

اس کے مشرق میں تیان شان کا کوہستانی سلسلہ ہے

جو چین تک چلا گیا ہے۔ شمال مغرب میں قزل قم کا صحرا ہے جو بحیرہ ارال تک پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں سمرقند اور بخارا جیسے تاریخی شہر ہیں۔ جنوب مشرق کی سمت فرغانہ اور اندیجان کی حسین وادیاں ہیں۔ تاشقند کے نواح مشرق میں ۔ چرچک نام کا نخلستان ہے جو چرچک دریا کے ساحل پر آباد ہے اور جو آگے جاکر دریائے سیحوں (سیردریا) میں مل جاتا ہے۔ چرچک کے گرد شاداب پہاڑیاں ہیں جو پھلدار درختوں اور پھولوں کی خوشبو سے مہکتی رہتی ہیں۔"[31]

قمر رئیس نے اپنی تصنیف کے ذریعے تاشقند کے حوالے سے یہ انمول اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ انیسویں صدی میں ازبیک زبان و ادب کی کئی کتابیں ہندوستان میں اُردو پریس کے اہم شہروں کانپور، دہلی اور لکھنؤ میں طبع ہوئیں۔ اقتباس دیکھئے:

"تاشقند میں انیسویں صدی کی ازبیکی زبان کی چھپی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ان میں سے بیشتر کانپور، دہلی اور لکھنؤ کے لیتھو پریسوں میں طبع ہوئی تھیں اور تاجر لوگ یہ کتابیں طبع کراکے ازبیکستان لے گئے تھے۔ اگرچہ برطانوی حکمرانوں نے اس خطہ سے ہمارے تہذیبی اور تجارتی تعلقات منقطع کر دیے تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد سوویت دور میں یہ تعلقات پھر بحال ہوئے۔"[32]

قمر رئیس نے ازبیکستان میں سات برس اُردو کے مدرس اور ہندوستان کے کلچرل ڈائرکٹر کے طور پر پانچ برس بتائے ہیں۔ ازبیکستان میں اُن کی دوستی حمید غلام سے ہوئی جو ایک اشاعت گھر کے سربراہ ہیں۔ قمر رئیس کے دل میں اُردو کی محبت نے کروٹ لی اور انہوں نے اپنے دوست حمید غلام کو اس طرح صلاح دی:

"میں نے ان سے کہا کہ وہ اُردو کے ادب عالیہ کا ترجمہ شائع کریں۔ باغ و بہار، امراؤ جان اور گئودان کے علاوہ کرشن چندر، بیدی اور منٹو کے افسانے شائع کرنے کی تجویز اُن کے سامنے رکھی۔ فیض اور علی سردار جعفری کا منتخب کلام ان

کے ادارے سے جلد شائع ہونے والا ہے۔'' 33ؔ

قمر رئیس کی متذکرہ بالا تصنیف معلومات کا ذخیرہ چھپائے ہوئے ہے۔اس تصنیف کے صفحہ 88 پر انہوں نے ایک ایسی اطلاع دی ہے جس سے عام اردوداں اور عام ہندوستانی ہی نہیں بلکہ خواص کو بھی اس کا یقیناً علم نہ ہوگا البتہ یہ بات اور ہے کہ تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں اس واقعے کا اندراج ضرور ملے گا۔قمر رئیس انہی دوست ''زیبا غنی ایوا''؟ کا ذکر کرتے ہوئے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ مملکت روس کے مردِ آہن اسٹالین کی بیٹی نے ایک ہندوستانی سے شادی کر لی تھی۔اقتباس دیکھئے:

''...وہ کٹر مسلمان تھیں اور مے نوشی سے سخت نفرت کرتی تھیں۔میں ماسکو جاتا تو میری ضیافت ضرور کرتیں اور پارٹی یا شہر کی کچھ معزز ہستیوں کو بھی بلاتیں۔انہوں نے ہی اسٹالین کی بیٹی سویتلانا سے مجھے ملوایا جنہوں نے ایک ہندوستانی سے شادی کر لی تھی۔'' 34ؔ

قمر رئیس نے اپنی اس تصنیف کی موجودہ عہد میں ضرورت اور اہمیت کی وجوہات بھی بیان کی ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں۔

'' افسوس اس کا ہے کہ ہندوستان میں ازبیک عوام کی زندگی اور تہذیب کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔بیسویں صدی میں ازبیک عوام کی اجتماعی زندگی میں تعمیر و ترقی کے کون سے کام ہوئے؟ کس طرح کی تبدیلیاں روبہ عمل آئیں ؟اور آج انہیں کون سے مسائل کا سامنا ہے۔؟اس کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔

اس کتاب کی طباعت کا ایک جو ازیہی ہے کہ اپنے ہمسایہ ملک ازبیکستان کی تہذیب وتمدن کے بارے میں ہماری دلچسپی اور معلومات دونوں میں اضافہ ہو۔''35ؔ

''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ازبیکی شعر و ادب کے تعلق سے قمر رئیس کی ایک اہم تصنیف ہے۔انہوں نے

اپنی دوسری تصانیف کی بہ نسبت اِس میں ازبکستان کے بارے میں زیادہ راست طور پر تفصیلات بیان کی ہیں۔ 120 صفحات پر مشتمل یہ کتاب دسمبر 1994ء میں ہریانہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع کی گئی۔ کتاب کے ٹائٹل اور اندرون صفحات پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ علی شیر نوائی کے کلام کے ترجمے میں رحمان بیردی محمد جانوف قمر رئیس کے معاون و مددگار کے طور پر شامل تھے۔ رحمان بیردی ازبکستان میں اردو کے محترم استاد اور وہاں کے ممتاز ہندشناسوں میں شامل ہیں۔ قمر رئیس اپنی تصنیف کی اشاعت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تاشقند کے زمانہ قیام میں' اب سے بیس بائیس سال قبل جب میں نے ازبیکستان کے نمائندہ شاعروں کے کلام کا ترجمہ ''ارمغان تاشقند''اور ''شعرائے ازبیکستان ''کے نام سے کیا تو اُسی زمانے میں ازبیک زبان کے دو باکمال کلاسیکی شاعروں علی شیر نوائی اور محمد ظہیر الدین بابر کی شاعری کے بارے میں بھی کچھ مواد جمع کیا۔ سوچا یہ تھا کہ اگر کتاب نہیں تو اُن کی شعری خدمات پر چند مضامین ضرور لکھوں گا۔ بابر کی ازبیکی شاعری کے بارے دو مختصر مضامین میں نے لکھے بھی لیکن علی شیر نوائی کے کارناموں کے بارے میں کچھ لکھنے کی سعادت سے محروم رہا۔
>
> 1982ء میں جب مہمان پروفیسر کی حیثیت سے آخری بار تاشقند گیا تو میرے عزیز دوست اور ازبیکستان میں اردو کے سب سے محترم استاد اور عالم رحمان بیردی محمد جانوف نے مجھے اس سلسلہ میں یاد دہانی کرائی اور میری گزارش پر مزید مواد ترجموں کی صورت میں فراہم کیا۔ ان کی مدد سے ازبیکی زبان میں شائع ہونے والا سوانحی مواد بھی دستیاب ہوا۔''36ؔ

قمر رئیس پیش لفظ میں یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ دراصل یہ تصنیف ازبکستان کے آزاد جمہوری مملکت کی حیثیت حاصل کرنے کے ایک سال بعد یعنی 1992ء ہی میں لکھی جا چکی تھی اور اُسی برس ہریانہ اردو اکیڈمی کی

اشاعتی کمیٹی کو ارسال کر دی گئی تھی جسے ملک کے ممتاز سیاست داں اور دانشور اندر کمار گجرال جو کہ اکیڈمی کے چیر مین بھی تھے، اس تصنیف کی اشاعت کی تجویز منظور کر لی تھی تاہم اسے منظر عام پر آتے آتے مزید دو برس لگ گئے۔

قمر رئیس نے اپنی تصنیف میں ازبکستان کی قدیم تاریخ کا بیان کرتے ہوئے اس کے تہذیبی رشتوں کو موجودہ حالات کے تناظر میں پیش کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ماضی اور حال کے مشترک عناصر کو صرف اجاگر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اُن کی ہم آہنگی کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے چھٹے باب میں علی شیر نوائی کے عہد اور اس کی حیات و سرگرمیوں کو مفصل طور پر لکھا گیا ہے اور اس کے بعد علی شیر نوائی کے کلام کو دو حصّوں میں پیش کیا ہے۔ پہلے حصّے میں اس کی غزلیں ہیں جبکہ دوسرے حصّے میں اس کے حکیمانہ اشعار و اقوال شامل کیے گئے ہیں۔

قمر رئیس نے ازبیک قوم کی حیثیت اور اُن کی شناخت پر اظہار خیال کرتے ہوئے تفصیل سے ازبیک کی اصل بیان کی ہے اور اس حقیقت کی بازیافت کی غرض سے انہوں نے وسط ایشیاء اور ازبکستان کی تاریخ و تہذیب پر مشتمل بے شمار کتابوں کا مطالعہ و محاکمہ کیا اور اُن کی مدد سے ازبیک اور ازبکستان کے بارے میں اردو قاری کو واقف کرایا ہے۔ ازبکی کتاب' تاریخ ادبیات ازبکستان کے حوالے سے قمر رئیس لکھتے ہیں:

''وسطی ایشیا میں کئی ہزار سال قبل مسیح میں خوارزمی 'سوغد' پرفیان جیسے قبیلے آباد تھے۔ کھدائیوں اور قدیم دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہزار سال ق۔م میں اس علاقہ کے لوگ لوہے سے آلات اور ہتھیار بناتے تھے۔ دور دواز علاقوں سے تجارت کرتے تھے۔ زراعت اور آبپاشی میں خاصی ترقی کر چکے تھے۔ اکثریت ایرانی خاندان کی زبانیں بولتی تھی' لیکن ترکی کا چلن بھی شروع ہو گیا تھا۔ دستاویزات میں ہونوں کی آمد کا ذکر دوسری صدی ق۔م میں آتا ہے وہ آلتائی خاندان کی ترکی زبانیں بولتے تھے۔ پانچویں صدی ق۔م یہاں آرامی رسم خط رائج تھا۔ اسی کی بنیاد پر مختلف علاقائی زبانوں کے رسم خط آوستا' خوارزمی ' سوغری ' کوشانی

اُیفوری پیدا ہوئے۔ یونانی رسم خط بھی ملتا ہے۔"37؎

قمر رئیس لکھتے ہیں کہ نصف چودھویں صدی گزرنے تک ازبکستان خانہ جنگیوں میں الجھارہا۔ اس دوران خوارزم کے حکمرانوں نے سلجوقیوں کو پسپا کیا اور پھر منگول حملہ آوروں نے خوارزم کو تباہ و برباد کیا۔ پھر تیمور لنگ نے چغتائی امیروں اور خانوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی اور سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ تیمور لنگ کے بعد اس کے پوتے شاہ رخ (1405-1447) اور پھر الغ بیگ (1447-1449) نے تخت و تاج سنبھالا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا قتل کر دیا گیا اور پھر کئی حکمراں تخت نشیں ہوئے وہ یا تو قتل ہوئے یا بعد میں تخت سے اتار دئے گئے۔ آخرکار سلطان حسین بالقرا (1470-1505) نے حکومت کو استحکام عطا کیا۔ امن و امان ہوا تو علوم وفنون کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے دربار سے مصوری، موسیقی اور شاعری کے ممتاز فنکار بہزاد جامی اور علی شیر نوائی وغیرہ وابستہ تھے۔ اسی زمانے میں ایک طرف ماورالنہر میں ظہیر الدین محمد بابر نے شکست کھا کر کابل سے ہندوستان کا رخ کیا اور دوسری طرف سیر دریا اور آمو دریا کے درمیان محمد شیبانی خاں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہی شیبانی خاں ازبکوں کا سردار تھا۔ وہ ایک مشہور عالم اور ازبکی زبان کا شاعر تھا۔ لیکن اس کے ایک جانشیں عبداللہ ثانی (1583-1598) کے بعد شیبانی کی قائم کردہ مملکت بکھر گئی۔ قمر رئیس ازبیک کی وجہ تسمیہ لارنس کریڈلر کی کتاب "Peoples of Central Asia" کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چغتائی ترکی کو اپنانے والے بیشتر ازبیک لوگ دشت قپچاق کے رہنے والے تھے ان میں برلاس، چغتائی جلیر اور منگیت قبیلوں کے لوگ شامل تھے۔ اسی کا کہنا ہے کہ اس علاقہ میں خان ابیک نے 1313ء سے 1341ء تک حکومت کی۔ شاید اسی نسبت سے اس علاقہ کے لوگ ازبیک کہلائے۔ اس سلسلہ میں مشہور مستشرق Rad loff کا یہ استدلال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ ازبیک دو لفظوں سے مل کر بنا ہے ایک ہے "اُز" جس کے معنی ہیں خود یا اپنے آپ 'اور دوسرا ہے "بیک" جس کے ترکی زبان میں معنی ہیں مالک یا آقا۔ ازبیک کا مطلب ہوا خود اپنے حاکم یعنی آزاد قوم۔"38؎

قمر رئیس مزید لکھتے ہیں کہ ازبیک دراصل چار مختلف اقوام کا مجموعہ ہیں۔(1) دشت قپچاق کے ترکی بولنے والے(2) منگول جو وسط ایشیا میں پڑے رہے(3) دوسرے مقامی و مہاجر ترک اور(4) قدیم ایرانی جنھوں نے ماوراالنہر میں رہ کر ترکی کو اپنالیا۔یہی چار مختلف اقوام تھے جن کے ملنے سے ایک ازبیک قوم کی تشکیل ہوئی اور اُن کی باقاعدہ ایک شناخت قائم ہوئی۔قمر رئیس نے ازبیکستانی عوام کی علمیت اور ہنرمندی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں کے کئی شہر زمانہ قدیم سے تجارت کے بڑے مراکز اور علم وہنر کا گہوارہ تھے۔کاغذ، ریشم اور شیشہ سازی کے ہنر اور عربی، ریاضی، طب اور فلکیات کو یہاں بڑا فروغ حاصل ہوا۔کئی صوفی سلسلے بطور خاص شطاری اور نقشبندی کا اسی خطے سے تعلق ہے۔یہاں زراعت، آبپاشی، فنون، دستکاری، علوم دینی، ادب اور فنون جنگ میں بھی بڑی ترقی ہوئی لیکن اٹھارہویں صدی کے آتے آتے معاشرے میں انتشار پیدا ہوگیا۔ازبیکستان کے ایک بڑے حصے پر ایرانیوں نے قبضہ کرلیا۔بخارا، خوقند اور خیوا میں جھڑپوں اور بغاوتوں کا سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔روس کی زار حکومت کی نظریں پہلے ہی سے اس علاقے پر لگی ہوئی تھیں۔اندرونی خلفشار کا فائدہ اٹھا کر روسی افواج اور حکمراں ازبیکستان کے مختلف حصوں پر اسی طرح مسلط ہوتے چلے گئے جیسے برطانی حکومت نے ہندوستان کو اپنے ماتحت کرلیا تھا۔یہ سلسلہ 1860ء سے شروع ہوا تھا اور 1890ء تک پہنچتے پہنچتے ازبیکستان پر عملی طور پر روسی قبضہ ہو چکا تھا۔اسی دوران اور اس کے بعد بھی برطانی حکومت جس کی ازبیکستان میں تجارتی دلچسپیاں تھیں، ازبیکستان کے خانوں اور امیروں کی خفیہ طور پر مدد کرتے ہوئے انہیں روسیوں کے خلاف اکساتی رہی۔قمر رئیس کا ماننا ہے کہ روس کے سیاسی تسلط سے ازبیکستان کو کئی میدانوں میں، بطور خاص ریل لائنوں اور زراعتی فیکٹریوں کی تنصیب میں بڑے فوائد ہوئے۔1917ء میں زار حکومت کا خاتمہ کر کے لینین نے روس کی قیادت سنبھالی۔1923ء تک وہاں خانہ جنگی ہوتی رہی لیکن بقول قمر رئیس:

> ”آہستہ آہستہ ساری انقلاب دشمن طاقتیں پسپا ہو گئیں، اور سوویت اقتدار یعنی محنت کش عوام کی فتح ہوئی۔
> 1924ء سے 1991ء تک کم و بیش سر سٹھ 67 سال کا زمانہ ازبیکستان کی قومی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی

تشکیلِ نو کا زمانہ رہا ہے۔اس مختصر عہد میں ازبیکستان اور دوسری وسط ایشائی ریپبلکوں نے صنعتی،زراعتی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے میدان میں جو شاندار کارنامے انجام دئیے ہیں ان کی مثال شاید ہی دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں دستیاب ہو سکے۔"39

قمر رئیس کا خیال ہے کہ 1924ء سے 1991ء تک کا عرصہ ازبیکستان کی ترقی کا انتہائی زریں دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ جبکہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اشتراکی نظام حکومت کے دوران روسیوں نے ازبیکستان کا استحصال کیا ہے لیکن قمر رئیس کہتے ہیں کہ یہ درست نہیں ہے۔وہاں کی ترقی، مختلف فیکٹریوں اور کارخانوں کا قیام، تیل اور گیس ذخائر کی دریافت، خواتین کی آزادی، خواندگی کی شرح میں غیر معمولی اضافہ اور قومی معیشت میں نمایاں بہتری ایسے بنیادی حقائق ہیں جو استحصال کی قیاس آرائیوں کی نفی کرتے ہیں۔قمر رئیس نے اشتراکی نظام حکومت کے تحت ازبیکستان کی ترقی وخوشحالی کے ساتھ ساتھ اس حکومت کی بعض کوتاہیوں کا اعتراف بھی کیا ہے کہ بعض فیصلوں میں غلطی ضرور ہوئی لیکن ارادتاً مظالم یا زیادتی نہیں کی گئی اور دوسری طرف یہ کہ وہاں مجموعی طور پر کافی ترقی ہوئی اور وہاں کے عوام نے امن وامان سے زندگی گزاری۔واضح رہے کہ قمر رئیس نے ازبیکستان میں اپنے قیام کے دوران جو کچھ بھی محسوس کیا اُسے "ذاتی مشاہدات" کے تحت قلم بند کیا ہے۔اُن کے یہ مشاہدے 1983ء تک یعنی آزادئ ازبیکستان سے کافی عرصہ پہلے تک محدود ہیں۔اس لیے ان مشاہدات میں آزادی کے بعد کی صورتحال پر کوئی تبصرہ نہیں ہے۔قمر رئیس لکھتے ہیں کہ اشتراکی نظام حکومت کے ماتحت ازبیکستان میں خوشحالی، اطمینان اور مساوات کا دور دورہ تھا۔وہاں کے ہر گھر میں بنیادی آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔تعلیم اور صحت کی سہولتیں مفت دستیاب تھیں۔ سنیما گھروں اور تھیٹروں میں مختلف زبان اور مختلف نوعیت کے تفریحی پروگرام ہوا کرتے تھے۔کم قیمت پر ضروریات زندگی کی چیزیں مہیا تھیں۔عوام کسی بھی ترقی مثلاً کسی پل کی تعمیر یا فصل کی کٹائی پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے اور اُن کے چہرے افتخار وانبساط سے کھل اُٹھتے تھے۔عالمی ادب کے ترجمے اور مختلف علوم کی کتابیں ازبکی زبان میں سستی قیمتوں پر دستیاب تھیں۔اُنہوں نے مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قصہ چہار درویش کے دو ایڈیشن ایک

لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اسٹاک ختم ہوگیا۔ اس سے وہاں کے لوگوں کے ذوقِ ادب کا پتہ چلتا ہے۔ عوام الناس کی سطح پر اس طرح کا ذوق عموماً خوشحال اور بے فکری کے زمانے ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ قمر رئیس آزادی کے بعد ازبکستان اور اس کے ہمسایہ ممالک کے روابط پر روشنی ڈالتے ہوئے ازبکستان میں سیکولر سماجی بنیادوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ازبیکستان کے بعض ہمسایہ اسلامی ممالک اس نو آزاد جمہوریہ میں اسلامی احیا پرستی کی تحریک کو ابھارنے کی تگ و دو کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ازبیکستان ایک اسلامی مملکت بن جائے۔ اس کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس لیے کہ وہاں سیکولر سماجی فکر کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ عوام میں اشتراکی نظریے کے حامیوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے اور وہ اشتراکی نظام کی بے مثل فتوحات پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ازبیک عوام نے مُلائیت کی گرفت اور ''جدیدیت پرستوں'' کی سازشوں سے بڑی کڑی جدوجہد کے بعد نجات حاصل کی تھی۔ اب دوبارہ وہ اس جال میں گرفتار نہیں ہوں گے۔ البتہ وہ اپنے ماضی کے عظیم ورثہ کو ازسرنو دریافت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اسلامی علوم بھی یقینا اُس ورثہ کا ایک حصہ ہیں۔'' (40)

''ازبکستان اور علی شیر نوائی'' میں قمر رئیس نے ازبکستان کی تاریخ سیاست، ثقافت اور عوام کے بارے میں مدلل اور مستند انداز میں مختصر طور پر اظہار خیال کیا ہے جو کہ ص 13 تا 28 یعنی پندرہ صفحات پر محیط ہے۔ کتاب کا دوسرا اہم حصہ علی شیر نوائی کے عہد حیات اور سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے کا آغاز علی شیر نوائی سے متعلق عبدالحلیم شرر کے مضمون کے اقتباس سے ہوتا ہے جو دلگداز کے شمارے بابت ستمبر 1913 میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں شررؔ نے نوائیؔ کو ''شریف النفس با کمالان اسلام میں ایک'' (41) قرار دیا ہے۔ نوائی نے ایک ایسے زمانے میں جنم لیا جب ازبکستان اور اُن کے پڑوسی ملک ایسی خانہ جنگیوں میں الجھے ہوئے تھے اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے

درمیان ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ عوام پریشان تھے۔ بغاوتیں جارحانہ انداز میں سر اٹھا رہی تھیں۔ ایسے دور میں ماہر علم قاموس 'تہذیبی زندگی کے سرپرست اور معروف و مدبر معلم' علی شیر نوائی نے ملک میں خانہ جنگی، کے خاتمہ اور ملک کی ترقی وخوشحالی کے فروغ میں بہت ہی نمایاں رول ادا کیا۔ ازبیک' تاجک اور افغان آبادی پر مشتمل شہر ہرات نوائی کا مولد تھا۔ ان کی پیدائش 9 جنوری 1441ء کو ہوئی۔ ان کے یہاں کی خواتین چونکہ شہزادوں کی کھلائیاں تھیں اس لئے ان کا بچپن بھی ان لوگوں کے ساتھ شاہی محل میں گزرا۔ ان کے سر سے باپ کا سایہ بچپن ہی سے اٹھ گیا تھا لیکن انہیں بادشاہ ابوالقاسم بابر کی سرپرستی حاصل تھی۔ اُنہیں بچپن ہی سے شعروسخن کا شوق تھا۔ چنانچہ دس بارہ سال کی ہی عمر سے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ انہوں نے منطق' فلسفہ' ریاضی اور عربی' فارسی و ازبیک ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ انہوں نے ابتداء میں بزرگ ازبیک شاعر میر شاہی سے اصلاح لی اور جب انہوں نے مشہد میں کچھ عرصہ سکونت اختیار کی تو یہاں انہوں نے سید حسین آرداشیر اور کمال تربتی سے مشورہ سخن کیا اور اپنے کلام پر اصلاح لی۔ علی شیر نوائی نے اپنے تخیل کے گل بوٹے ازبیکی اور دری دونوں زبانوں میں اس طرح کھلائے ہیں کہ ان کے خیالات کی تازگی آج بھی پڑھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ علی شیر نوائی نے اپنے کلام کے ذریعہ ازبیک شاعری کو ارتقاء عطا کیا۔ انہوں نے اپنے کلام میں دنیائے ادب اور خصوصاً فارسی کے کلاسیکی ادب کو اس سلیقہ اور ہنر کے ساتھ پیش کیا کہ آج اُن کا شمار ایشیا کے ممتاز فنکاروں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> " علی شیر نوائی کی تخلیقات قدیم ازبیکی ادب کا نقطہ کمال تھیں۔ وہ ازبیک زبان وادب کو ایک نئی منزل' نئی سطح تک لائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے مستقبل کا راستہ بھی روشن کیا۔ وہ اپنے بعد کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ یہ علی شیر نوائی ہی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ ازبیکی کلاسکی ادب کو دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا شمار ایشیا کے بہترین ادب کے نمائندوں میں ہونے لگا۔ نوائی نے دنیا کے سامنے جو شاہکار پیش کیے انہوں نے شاعر کو عظیم ایشیائی فنکاروں کالی داس' رودکی' فردوسی' امیر

خسرو، رومی اور نظامی جیسے اکابر کے برابر لا کھڑا کیا۔'' 42

علی شیر نوائی صرف ایک شاعر نہیں بلکہ اس کی شخصیت کے کئی رخ اور کئی پہلو ہیں۔ انسان دوستی اور فلاح انسانیت کا جذبہ اس کی سیرت و کردار کا اہم ترین حصہ تھا۔ اُس نے کئی بادشاہوں اور اُن کے ادوار کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اسے ایک ظالم بادشاہ ابوسعید نے ہرات سے جلاوطن کر دیا تھا۔ جلاوطنی کا عرصہ انہوں نے سمرقند میں گزارا۔ ہرات کے برخلاف سمرقند میں اُن دنوں امن وامان تھا اور شعروسخن کی شمعیں بھی روشن تھیں۔ نوائی کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی چنانچہ جب وہ سمرقند پہونچے تو ان کا یہاں استقبال کیا گیا' ان کی عزت افزائی کی گئی۔ انہیں بھی یہ ماحول پسند آیا لہٰذا وہاں کے ماحول میں وہ رچ بس گئے اور انہوں نے سمرقند کو اپنا وطن ثانی قرار دیا اور اس شہر کی تہذیبی زندگی کو نکھارنے اور یہاں کے فنون وادب کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ نوائی کی جلاوطنی کے کچھ عرصہ بعد ابوسعید مرزا کا انتقال ہوا اور حسین بالقرا نے خراسان کے تخت کو زینت بخشی' یہ بادشاہ نوائی کا قدرداں تھا چنانچہ وہ ہرات چلے آئے جہاں اُن کا استقبال ہوا اور انہیں شاہی جواہرات کا محافظ مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت سے وہ حکومت کے نظم ونسق میں بھی شریک رہے اور سلطنت کی سالمیت اور عوام کی خوش حالی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے اور اپنے فرائض کی بخوبی انجام دہی کی اور بدامنی اور اضطراب کے دور میں حکومت کو منظم رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے کئی سازشوں کو بے نقاب کیا جس کی وجہ سے انہیں عوام میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب بادشاہ کے دربار میں ان کی ضرورت نہیں ہے تو انہوں نے حکومت سے علاحدگی اختیار کر کے علمی وادبی سرگرمیوں پر خصوصی توجہ کی لیکن بادشاہ نے انہیں دوبارہ طلب کر لیا اور انہیں وزیر مقرر کر دیا۔ اس دور میں بھی انہوں نے کئی علاحدگی پسند قوتوں کو پسپا کیا اور حکومت سے ان کی مصالحت کرادی۔ اپنے دورِ وزارت میں علی شیر نوائی نے بے شمار ادیبوں وفنکاروں کی سرپرستی کی۔ ملک وقوم کے لیے اُن کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی ذاتی آمدنی اور دولت بھی عوامی وفلاحی مقاصد پر صرف کر دی۔ قمر رئیس نے علی شیر نوائی کی ان خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''انہوں نے اپنی ذاتی دولت کو بھی علوم وفنون کی ترقی اور ملک اور قوم کی فلاح وبہبود کے کاموں پر صرف کیا۔ انہوں

نے متعدد عمارتیں بنوائیں 'باغات لگوائے نہریں اور تالاب کھدوائے۔وہ اکثر ان کاموں کی خود ہی نگرانی کرتے اور مزدوروں کے ساتھ مل کر محنت بھی کرتے تھے۔

نوائی کی یہ سرگرمیاں خود غرض عہدیداروں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھیں۔انہوں نے نوائی کے خلاف بادشاہ کے خوب کان بھرے۔بات یہاں تک پہنچی کہ ان کو اپنے عہدے سے دست بردار ہونا پڑا۔

جب یکسوئی ہوئی تو نوائی شعر و شاعری کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے۔'' 43

علی شیر نوائی جہاں بھی رہے وہ عوام کی بہبود اور حکومت کے استحکام کی فکر کرنے کے ساتھ ساتھ سلطنت میں چین سکون قائم رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔اسی کے ساتھ ہی وہ جہاں کہیں ہوتے شعر وسخن کی محفلیں آباد کرتے رہتے۔اُن کے سانحہ ارتحال سے بھی ایک ایسا ہی واقعہ جڑا ہوا ہے جو اُن کی انسانی دوستی اور اخوت انسانیت کے جذبے کی واضح دلیل ہے۔1500ء کے آخری دنوں میں جب ہرات کے بادشاہ حسین بالقرا کی اس کے بیٹے سے صلح ہوگئی تو نوائی کو بے حد خوشی ہوئی۔انہوں نے 28 دسمبر کو اپنی علالت کی پرواہ کیے بغیر بادشاہ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر جا کر اپنی خوشی ومسرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔نقاہت کی وجہ سے راستے ہی میں بے ہوش ہو گئے۔یہ بے ہوشی اُن کی موت کا بہانہ بن گئی۔3 جنوری 1501ء کو ہرات میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ان کے انتقال کا غم سارے علاقے میں منایا گیا۔مرثیے کہے گئے اور اُن کے کارناموں اور خدمات کی ستائش کی گئی۔

علی شیر نوائی سے چالیس تصانیف یادگار ہیں۔جن میں اُن کے تین دواوین' پانچ مثنویاں جس میں حیرت الابرار' فرہاد شیریں' لیلیٰ مجنوں' سبعہ سیار' سدّ سکندری' رسالے تارخمل عجم' حالات سعید حسن اردشیر' معمہ' پندرہویں صدی کے چار سو سے زیادہ شعرا کے حالات پر مبنی تذکرہ مجالس النفائس' عظیم تاجک شاعر اور فلسفی عبدالرحمٰن جامی کے حالات زندگی سے متعلق کتاب خمسۃالمتاخرین' مکتوبات کا مجموعہ میزان الاوزان' فارسی تاجکی (دری) کلام کا

مجموعہ دیوان فانی' لسانیات سے متعلق رسائل لسان الطّیر' فلسفے سے متعلق رسالہ محبوب القلوب اور مذہب سے متعلق رسالے وقفیہ اور نظام الجواہر حکمت کی کتاب منطق السطیر وغیرہ شامل ہیں۔

نوآئی کے کلام کا بنیادی فلسفہ انسان دوستی ہے اور لہجہ غنائی ہے۔ اُن کے کلام میں مناظر فطرت اور جزئیات انسانی کا ماہرانہ بیان ملتا ہے۔ گرچہ انہوں نے کئی مثنویاں اور نثر میں متعدد رسائل یادگار چھوڑے ہیں لیکن اُن کا اصل میدان سخن غزل تھی۔ غزل سے اُن کے لگاؤ کا ثبوت اُن کے ازبیکی اور تاجکی دواوین ہیں جو بالترتیب 45 اور 12 ہزار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں غزل کے عام موضوعات یعنی حسن و عشق' وفا و جفا' ہجر و وصل اور اسی کے ساتھ ساتھ فلسفہ' اخلاقیات' دوستی' محنت' تعلیم' آداب و اخلاق' ہمت' سخاوت' حق گوئی اور ایمانداری وغیرہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ قمر رئیس نے نوائی کے کلام کے تنقیدی جائزے میں انتہائی فراست اور وضاحت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے نوائی کے کلام کے انتخاب میں کم و بیش تمام موضوعات اور تمام شاعرانہ پہلوؤں کی مثالیں پیش کی ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے نوائی کی مثنویوں کے ماخذات پر بھی سیر حاصل اظہار خیال کیا ہے اور اُن کے پیش رو شعرا کے یہاں مماثل حصوّں کی تلاش بھی کی ہے۔ انہوں نے نوائی کی سبھی مثنویوں کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اُس سے قبل تمہید بھی بیان کی ہے جس سے قاری کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ نوائی نے مثنوی میں کس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کی کہانی قصہ کیا ہے' فنی خوبیاں کیا ہیں۔ یہی خوبی دوسرے ازبیک شعرا کے یہاں کہاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ نوائی نے کس کس مقام پر اپنے پیش روؤں کا تتبع کیا ہے اور کہاں آگے نکل گئے ہیں' اور کس مقام پر انہوں نے اپنے معاصرین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کا تیسرا حصّہ نوائی کے منتخب کلام کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ انتخاب نوائی کے صرف ازبیک شاعری پر مشتمل ہے اور قمر رئیس نے ''اصل شعر کی تخیلی کیفیت اور معنوی ندرت کا صحیح اندازہ'' (44) کی غرض سے ترجمہ نثر میں کیا ہے۔ اکثر مقام پر انہوں نے ردیف قافیہ میں ہم آہنگی پیدا کر کے ترجمے میں شعری حسن بھی پیدا کر دیا ہے لیکن ترجمے کا اصل مقصد شاعر کے تخیل اور کلام کی معنوی تہ داری سے اردو قاری کو واقف کرانا ہے۔ قمر رئیس نے نوآئی کے حکیمانہ اشعار و اقوال کا ایک مختصر انتخاب بھی کتاب کے آخری صفحات پر کیا ہے۔ اسی انتخاب سے ذیل میں

چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو شاعری اور ترجمے دونوں ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اچھے اور برے میں ہوتا بہت فرق ہے
دو کشتیوں میں جو سوار ہو بیڑا اسی کا غرق ہے (ص 111)

دوسروں کو جس کی ذات سے پہنچے آزار
اس کا دنیا میں رہنا سرا سر بے کار (ص 111)

بولو کم اگر چاہتے ہو عزت
کھاو کم اگر چاہئے صحت (ص112)

حیا اور وفا کا چولی دامن کا ساتھ ہے
حیا اساس وفا کا ' وفا ہی سے حیا ہے (ص112)

ذرا سی بات پر ہرگز عتاب نہ کر
سیاست اور قتل میں شتاب نہ کر (ص 112)

صبر سے کام لینے والے الجھنیں سلجھا تے رہتے ہیں
جلد بازی کر نے والے ٹھوکریں کھاتے ہیں (ص 112)

بادشاہ عادل ہو تو دور ہو شب کی سیاہی
شاہ ظالم کے ہاتھوں آئے ملک میں تباہی (ص112)

بے کار کی باتوں سے تو پرہیز کر
بات کام کی سننے سے نہ گریز کر (ص 113)

سچ میں جھوٹ کی نہ کر ہرگز ملاوٹ
منہ میں لینے کی نہیں یہ غلا ظت (ص 113)

بنا عالم جس کسی نے پوچھ پوچھ سیکھا علم
جو شرمایا 'نہ پوچھا ' کیا اپنے آپ پر ظلم (ص114)

وہ سارا علم جو آن مجھ کو حاصل ہے
سیکھا میں نے یقینا جاہلوں سے 45؎ (ص114)

جو تھا کرنا کر نہ پایا ' جو کیا نہ سوچا سمجھا
دکھ یہ جو دانا کو ہوگا' ہو گا وہ جاہل کو کیا؟ (ص110)

جو ایک ٹکڑا روٹی کا غلامی کر کے کھائے
سرِ بازار اس کے منہ سیاہی سے پوتی جائے (ص116)

دل میں کینہ کدُورت رکھنے والوں سے دور ہٹ
کمینوں کی رفاِقت ' لاتی ہے صرف ذلّت (ص116)

ضرورت پڑنے پر گر تم نہ سچ بولو
تو جھوٹ بولنے کو بھی ہرگز نہ منہ کھولو (ص116)

پروانہ گر نہ ہوتا بادہ عشق سے چوُر
تو کیوں وہ آگ میں کودتا' نہ رہتا آگ سے دور؟ (ص117)

نمک اور قند دیکھنے میں ایک سے ہیں ہر چند
مگر پھر بھی ایک نمک ہے اور دوسرا قند(ص118)

بد اخلاق اونچا نہیں اٹھ پاتا ہے
اسے چرخ بلند چت گراتا ہے (ص118)

کر کے بھلا کسی کا ' کبھی نہ لا زبان پر
ظلم نہ کر انسانیت پر احسان جتا کر (ص119)

ان اشعار سے نوائی کے شعری مزاج اور اُن کے فکری رویے کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ یہی رویہ ان کی عملی زندگی میں بھی موجود تھا اور شاعری میں بھی انہوں نے اسی رویہ کو روا رکھا تھا۔ یہی سبب ہے کہ نوائی ازبکستان کے ممتاز ترین شعرا میں شامل ہیں۔ انہیں نہ صرف وہاں علمی اور اعلیٰ ادبی سطح پر مقبولیت حاصل ہے بلکہ انہیں لوگ ایک عوامی رہنما اور مصلح کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ آج غالباً ازبکی زبان میں سب سے زیادہ تضمین نوائی ہی کے کلام پر کی جاتی ہے۔ قدیم کلاسیکی شعرا میں نوائی کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کا کلام سب سے زیادہ محافل موسیقی میں گایا جاتا ہے۔ ایسے شاعر کو اردو زبان میں متعارف کرانے کا سہرا قمر رئیس کے سر ہے۔ انہوں نے یقیناً ایک بڑا علمی کام انجام دیا ہے۔ کتاب کے ابتدائیے میں ناشرادارہ ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری اور ممتاز ادیب کشمیری لال ذاکر نے نوائی اور قمر رئیس کے حوالے سے ایک مختصر نوٹ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ” علی شیر نوائی ازبیکستان اور ازبک عوام کے ایسے شاعر اور دانشور تھے جنہوں نے پانچ سو سال قبل ازبیکی زبان کو اس لائق بنایا که اس میں نثر و نظم کی تصنیف ہو سکے' اور ازبیکی زبان کے ادب کو دوسری زبانوں کے سامنے پیش کیا جا سکے ۔علی شیر نوائیؒ مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابرؒ کے معاصر تھے۔یہ کتاب نہ صرف علی شیر نوائیؒ کی ادبی زندگی اور اُن کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتی ہے بلکہ ازبیکستان اور ہندوستان کے ثقافتی اور ادبی ورثہ کو بھی فروغ دیتی ہے اور ہندوستان کے اردو ادب کے قارئین کو ازبیک زبان وادب سے روشناس کراتی ہے۔“ 46

قمر رئیس کی اس تصنیف کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں کیا جارہا ہے۔ توقع ہے کہ جلد ہی ان کی اشاعت عمل میں آئے گی۔

ازبکستان اور علی شیر نوائی 1994ء میں منظر عام پر آئی ۔ اس کے چند ماہ بعد قمر رئیس اسٹیٹ اورینٹل انسٹیٹیوٹ تاشقند کی خصوصی دعوت پر لکچر دینے کے لیے تاشقند تشریف لے گئے ۔ ازبکستان کے آزاد مملکت بننے

کے بعد یہ اُن کا پہلا سفر تاشقند تھا۔ وہاں انہوں نے کیا دیکھا اور بدلی ہوئی سیاسی و جغرافیائی صورتحال میں انہوں کیا محسوس کیا' اس کا اظہار انہوں نے شمالی ہند کے مشہور روزنامے قومی آواز کے ادبی ضمیمے کے لئے ایک خصوصی انٹرویو میں بڑی وضاحت کے ساتھ کیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس سے یہ تفصیلی انٹرویو نمائندہ قومی آواز ظفر الدین نے کیا تھا جو 30 جولائی 1995ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ازبکستان میں اُن کے سابقہ تجربوں کی روشنی میں موجودہ ازبکستان (1995 کا ازبکستان) میں راہ پانے والی تبدیلیوں کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

> '' وہاں بہت سی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ ان کا پرچم نیا ہے۔ نشان نیا ہے۔ دستور نیا ہے۔ لوگوں کو فکر و اظہار' عمل' عبادت اور تجارت کی آزادیاں ملی ہیں۔ سیکڑوں پرائیوٹ دکانیں کھل گئی ہیں۔ نئی مسجدیں ہی نہیں گرجے بھی تعمیر ہو رہے ہیں یا پرانی عبادت گاہوں کی تعمیر نو ہو رہی ہے جہاں عبادت کے لیے لوگ جا بھی رہے ہیں۔ بوڑھے زیادہ' جوان کم۔ لوگ ان آزادیوں اور انسانی حقوق سے جو انہیں ملے ہیں بظاہر خوش نظر آتے ہیں۔'' 47

قمر رئیس ازبکی عوام کی ''بظاہر خوشی'' اور آزادی کو فال نیک تو قرار دیتے ہیں لیکن ان کی نگاہ میں ایک دوسرا منظر نامہ بھی ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ صرف آزادی' حقوق اور اختیارات دے دینے سے ترقی اور خوشحالی نہیں آجاتی ہے بلکہ اس کے لئے وسائل کا ہونا ضروری ہے۔ عوام میں قوت خرید پیدا کرنا لازمی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

> '' ازبیکستان ہندوستان کی طرح ایک جمہوری ریاست بن گیا۔ اس میں ہر فرد کے لیے جملہ جمہوری آزادیوں کا اعلان کر دیا گیا۔ ان میں یہ بھی تھا کہ ہر شہری زمین اور ملکیت کا مالک بن سکتا ہے۔ نجی طور پر صنعت کاری اور تجارت میں حصہ لے سکتا ہے لیکن کارخانے وہی لگائے گا' تجارت وہی کرے گا جس کے پاس کثیر رقم ہو۔ جو لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ دوسری طرف وہاں نوے فیصد شہر اور گاؤں کی زمین جو اشتراکی دور میں قومیائی گئی تھی آج بھی ریاست کی ملکیت ہے۔ اسے

خریدنے کے لیے پیسہ درکار ہے۔ جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔البتہ پنچایتی اور ریاستی فارم بعض کاشتکاروں کو یہ زمین پٹے پر دیتے ہیں لیکن مجھے گاؤں میں ایسے کاشتکار بس خال خال ہی نظر آتے ہیں۔''48؎

قمر رئیس چونکہ بنیادی طور پر اشتراکی نظریے کے حامی ہیں اور انہیں اشتراکی نظام سے عقیدت کی حد تک محبت یا وابستگی ہے لہٰذا وہ ازبکستان کے اُس دور کے بارے میں زیادہ مثبت رائے رکھتے ہیں' جب وہاں اشتراکی نظام رائج تھا۔ وہ ازبکی عوام کا معیار زندگی ہندوستانی عوام سے بہتر بتاتے ہوئے اس کا کریڈٹ اشتراکی نظام کو دیتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ ان کی خوشحالی اشتراکی نظام کی ہی دین ہے۔ اس میں احساس مساوات تھا۔ سماجی انصاف تھا۔ وہ زندگی طبقاتی امتیاز اور استحصال سے تقریباً پاک تھی۔ اس میں غریبی اور امیری دونوں چیزیں غائب تھیں۔ لوگ آسودہ حال تھے۔''49؎

دوسری طرف موجودہ صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''وہ پہلے سے زیادہ کرپٹ یعنی بد اعمال ہیں۔ آج پہلے سے زیادہ رشوت لی جاتی ہے۔ میں ایک ہندوستانی سفارت کار کی گاڑی میں جا رہا تھا۔اس کے ازبیک شوفر سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی ۔ٹریفک پولیس افسر نے اس کو روک لیا مگر چالان کرنے کے بجائے اس سے 25 روپے لے لیے۔میں اپنے ویزا میں صرف دودن کی توسیع چاہتا تھا۔ایک سابق وزیراعظم نے میرے لیے کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔پھر ایک ایجنٹ نے مجھ سے کہا کہ صرف 25 ڈالر میں وہ یہ کام کرادے گا۔آخر میرے ایک پرانے شاگرد نے یہ مسئلہ حل کرایا۔میرے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ اس طرح کی رشوت ستانی پرانے نظام میں نہیں تھی اس کرپشن کو بڑھاوا دینے میں غیر ملکی تاجروں خاص کر بر صغیر کے

تاجروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔"[50]

یہ ایسے first hand تجربے ہیں جن سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے اور یہ تجربے نئے ازبکستان کی معاشرتی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ سماجی برائی اور اخلاقی انحطاط کا یہ سلسلہ صرف ازبکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ قمر رئیس چونکہ 1995ء میں بارہ برس کے طویل وقفے کے بعد ازبکستان پہنچے تھے اور اس دوران وہاں سے اُن کے پسندیدہ نظامِ حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لیے فطری طور پر انہیں وہاں بہت بڑا فرق نظر آ رہا تھا۔ ہر بات کا وہ یقیناً پچھلے نظام سے موازنہ بھی کر رہے ہوں گے اور اُن کی نگاہ ہر بدلے ہوئے طور طریقے اور رویے پر ٹھہر رہی ہوگی۔ ایسے میں جب اُن سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ درست ہے کہ معاشرہ انحطاط پذیر ہے اور وہاں کے عوام نے عالمی مزاج کو اپنانا شروع کر دیا ہے لیکن اُن کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ تبدیلیوں کے باوجود وہاں اطمینان کی وہ کیفیت کیوں نظر نہیں آتی ہے جو نظر آنی چاہئے؟ قمر رئیس کہتے ہیں:

> "دراصل میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ازبیکستان کی ریاست اور عوام کا سب سے بڑا مسئلہ ان کے لیے ایک قومی تشخص کی تلاش ہے۔ اشتراکی تعمیر و ترقی کے دوران ان کا جو تشخص بنا تھا اس پر سوویت سوشلزم کی چھاپ تھی۔ اس نے ان کے ماضی کی تہذیبی اور علمی فتوحات' اسلامی وراثت اور اس کے اکابرین اور ان کے ہیروز مثلاً تیمور لنگ' بابر وغیرہ سے محروم کر دیا تھا۔ اس لیے قومی تشخص کے لیے ماضی کی بازیافت ناگزیر ہے۔ اسلام بھی اس کے شاندار ماضی کا ایک حصہ ہے۔"[51]

ازبکستان میں اسلام بھی ایک اہم موضوع ہو سکتا ہے۔ وہاں زیادہ تر مسلمان بستے ہیں۔ عوام اور حکمراں دونوں ہی سطح پر مسلمانوں کا غلبہ ہے لیکن ازبکستان اسلامی نہیں بلکہ ایک سیکولر جمہوریہ ہے۔ دُنیا کے جس کسی ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں شریعت کے قوانین کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ ازبکستان کے بارے میں بھی یہ سوال اُٹھتا رہتا ہے کہ کہیں وہاں جمہوریت کے نام پر اسلامی طرزِ حکومت حاوی تو نہیں ہے۔ قمر رئیس کا تجزیہ کہتا ہے

کہ ازبیکستان کے عوام مذہبی حکومت سے زیادہ سماجی انصاف پر مبنی جمہوری حکومت کے قائل اور حامی ہیں۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے وہاں کے دانشوروں اور مذہبی علما سے جو بات چیت کی اُس کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں نے نہ صرف دانشوروں بلکہ سمرقند کے بعض مذہبی علما سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کی۔ شریعت کے قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک عائلی یعنی وراثت 'شادی بیاہ وغیرہ کے قوانین اور دوسرے حدود یعنی جرائم کی سزا کے قانون۔ آخرالذکر قوانین تو وہاں کے ایک فیصد لوگ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ عائلی قوانین میں بھی ایک دو فیصد مذہبی لوگ ہی کچھ ترمیم چاہتے ہیں لیکن اکثریت سماجی انصاف اور انسانی حقوق کی ضمانت دینے والے عائلی قوانین کو ہی رائج رکھنے کے حق میں ہیں... یہ صحیح ہے کہ وہاں مذہب کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی ہے۔ دکانوں میں مذہبی کتابیں جیسے نماز کیسے پڑھیں؟ ارکان اسلام کے بارے میں 101 سوال و جواب وغیرہ مل جاتی ہیں۔ خواتین خاص طور پر پڑھتی ہیں لیکن ان کے دستور میں مذہب' مذہبی جماعتوں اور مذہبی تعلیم کو اسٹیٹ کی ذمہ داریوں سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔''[52]

اس بیان سے یہ بڑی صحت مند بات سامنے آتی ہے کہ عوام کو اپنے مذہب سے لگاؤ ہے اور وہ اس سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کا جمہوری نظام پر ہی اعتبار قائم ہے۔ اسے جمہوری قدروں کی ایک اعلیٰ مثال بھی کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ جمہوریت میں سب کے لیے مذہبی آزادی کی زبردست وکالت کی جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو قمر رئیس کے نظریے یا اُن کے مطالعے اور مشاہدے کے مطابق ازبیکستان میں بدعنوانی نے اپنے پیر تو پھیلا لیے ہیں لیکن لوگوں کا اپنے مذہب پر ایمان قائم ہے اور وہ جمہوری طرز حکومت پر یقین رکھتے ہیں۔ قمر رئیس نے اپنے دورۂ ازبیکستان کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''جدید ادب پر کچھ لکچر دینے گیا تھا لیکن ایک بڑا مقصد اپنے پرانے دوستوں اور عزیز شاگردوں سے ملنا بھی تھا۔

پھر ظہیرالدین بابر کی زندگی اور شاعری پر مواد جمع کرنا بھی ایک مقصد تھا۔ میں نے اُردو کی لکچرر ڈاکٹر مہیا رحمان کی مدد سے بابر کی سو سے زائد غزلوں اور قریب 50 رباعیوں کا ترجمہ کیا ہے جو جلدہی کتابی صورت میں شائع ہو گا۔''53ء

قمر رئیس نے درج بالا اقتباس میں جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کتاب 2002ء میں پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ ''ظہیرالدین محمد بابر: شخص، شخصیت اور شاعری'' کے نام سے لکھی گئی اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا ہے جبکہ اس کا اہتمام ہند۔ازبکستان دوستی سوسائٹی نے کیا ہے۔ کتاب کی دوسری تمام خصوصیات سے قطع نظر، ہندوستان کے موجودہ تناظر میں بابر پر لکھی گئی اس کتاب کی ایک علیحدہ شناخت اور اہمیت بھی ہے۔ قمر رئیس نے بابر سے منسوب اجودھیا کی مسجد پر بڑی مدلل بحث کی ہے اور اس پورے جھگڑے کو غلط فہمیوں کا پہاڑ قرار دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس متنازعہ مسجد سے شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر کا اصلاً کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں شہنشاہ بابر کی شخصیت، شادی، عشق، درویشوں سے عقیدت، حسن انسانی و حسن فطرت سے لگاؤ، گرونا نک، اجودھیا مسجد، ہندوستان سے اس کا رشتہ اور اس کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے میں باؔبر کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ دیا گیا ہے۔ قمر رئیس نے کتاب کے پیش گفتار میں اس موضوع سے اپنی دلچسپی، بابر کے کلام کا ترجمہ کرنے اور پھر اسے ایک مکمل کتابی صورت میں پیش کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دراصل ہندوستان کے تاریخی پس منظر میں وہ بابر کو ایک حکمراں اور فاتح ہی سمجھتے تھے لیکن اُنہوں نے جب جب ازبکی ادب اور بطور خاص ازبکی شاعری کا مطالعہ کیا تو اُنہیں یہ احساس ہوتا چلا گیا کہ بابر دراصل وہاں کے اہم ترین کلاسیکی شعرا میں سے ایک ہے۔ اپنے قیام تاشقند کے دوران اُنہیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ ازبکی عوام بابر کو البیرونی، امام بخاری اور حکیم بوعلی ابن سینا کے مصداق ایک قابل فخر تہذیبی نمائندہ تصور کرتے ہیں۔ حدتو یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے گھروں میں بابر کی تصویر محبت وعقیدت سے آویزاں کرتے ہیں۔ یہ عقیدت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کوئی قوم اپنے کسی عالم اور دانشور شخصیت سے رکھتی ہے۔ دوسرا مرحلہ

قمر رئیس کے سامنے اس وقت آیا جب اُنھوں نے ظہیر الدین محمد بابر کی مشہور زمانہ کتاب ''تزک بابری'' کا مطالعہ کیا۔ اس خودنوشت کے مطالعے نے بھی بابر کی شخصیت کے کئی دلآ ویز پہلو قمر رئیس پروا کیے چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

''ایک شاعر ادیب' عاشق' فطرت کا پرستار' موسیقی کا دیوانہ اور رومانوی فکر و احساس رکھنے والے انسان کے روپ میں' بابر کی پہلودار' پرکشش شخصیت دل کو چھوتی رہی۔ ایسی خلّاق شخصیتیں کسی خاص دور کی میزان اقدار اور ضابطوں سے بندھی نہیں ہوتیں اور اکثر ان سے اوپر اُٹھنے کی بنا پر ہی وہ انسان کے ثقافتی ورثہ میں کچھ اضافہ کرنے یا اسے موڑ دینے کا موجب ہوتی ہیں۔''54

قمر رئیس نے پیش گفتار میں بابر کے اُن کارناموں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے بابر کو دنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں مقبولیت حاصل ہے مثلاً ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں اُس کا رول' ہندوستان میں بحیثیت بادشاہ اُس کی خدمات' اس کی فتوحات' جنگی مہمات' بہادری' جنگی مہارت اور تیغ زنی جیسی اُس کی شخصیت کی داخلی خصوصیات وغیرہ۔ اس کے علاوہ بابر کی اُن خصوصیات کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں جن کے تحت مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی رشتوں کی تجدید ہوئی اور مشترکہ کلچر کا تصور پروان چڑھا۔ تاہم قمر رئیس نے ان اشاروں کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہ اُن کا موضوع نہیں بلکہ وہ تو بابر کی شخصیت اور اُس کی علمی خدمات کے بعض تہذیبی پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں بابر کی اِنہیں صفات نے اپنی جانب متوجہ کیا اور یہ وہ پہلو ہیں جس سے ہندوستان کے لوگ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ہندوستانی عوام میں تو بابر کی شناخت مغلیہ سلطنت کے ایک فاتح حکمراں کی حیثیت سے ہے جبکہ وہ ایک رومان پرور شخصیت' انوکھا شاعر' مال وزر کی حرص و ہوس سے بے نیاز اور عوام کے دلوں پر حکومت کرنے والا بادشاہ تھا۔

قمر رئیس نے ایک محقق کا پورا پورا فرض ادا کرتے ہوئے بابر کے تمام کلام کا مطالعہ کیا۔ اُن کی نثری کتابوں بالخصوص تزک کا بڑا عمیق مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ بابر پر لکھی گئی مغربی ادیبوں کی بے شمار کتابیں اور مضامین بھی اُن کے مطالعے میں رہے ہیں۔ یہی نہیں قمر رئیس وادیٔ فرغانہ کے شہر اندیجان بھی جا پہنچے جہاں 14 فروری 1483ء کو

بابر کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے بابر کے محلے کو دیکھا جہاں اُن کا بچپن گزرا تھا۔ وہ اُس مدرسے کو دیکھنے بھی گئے جہاں بابر نے تعلیم پائی تھی اور اب اُسے وہاں کی حکومت نے میوزیم میں تبدیل کر دیا ہے۔ قمر رئیس نے بابر کی آل اولاد سے ملاقات یا تبادلہ خیال کا کوئی ذکر تو نہیں کیا ہے لیکن انہوں نے اُن عمارات، باغات، محلات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جن کے ساتھ بابر اور ان کے اجداد کے نام جڑے ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی مدد سے قمر رئیس نے بابر کی حیات و خدمات (غیر شاہی) کی بڑی شاندار مرقع کشی کی ہے۔ کتاب کے پڑھنے کے بعد بابر کی شخصیت کا ایک الگ ہی پہلو سامنے آتا ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی ہے۔

بابر کے اجداد میں چھٹی پشت پر والد کے سلسلے میں امیر تیمور اور والدہ کی طرف سے چنگیز خاں کے نام ملتے ہیں۔ اس طرح دونوں ہی طرف سے اُن کے رگ و ریشے میں حاکموں کا خون دوڑ رہا تھا۔ ان کے والد وادیٔ فرغانہ کے حکمراں عمر شیخ مرزا تھے جن کا انتقال ایسے وقت میں ہو گیا جب بابر صرف گیارہ برس کے تھے۔ انہیں وراثت میں فرغانہ کی حکمرانی مل گئی لیکن اسی کے ساتھ اُنہیں دشمنوں اور حریفوں کی بڑی تعداد بھی حاصل ہوئی۔ وہ ایک بہادر اور حوصلہ مند انسان تھے۔ انہوں نے اپنی تاج پوشی کے چھ برس کے اندر ہی سمرقند پر قبضہ کر لیا لیکن اس کے فوری بعد حالات نے اتنی تیزی سے کروٹ لی کہ ان کے ہاتھ سے نہ صرف سمرقند بلکہ اندیجان بھی نکل گیا۔ بابر کی زندگی کا یہ بدترین دور تھا۔ انہوں نے قریب دس ماہ جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے گزارے۔ اسی دوران کابل کے حکمراں اور بابر کے چچا الغ خاں کا انتقال ہو گیا۔ بابر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کابل پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 21 برس تھی۔ اندیجان سے دور ہو جانے کے بعد بابر نے دوبارہ پھر کبھی وہاں مستقل طور پر سکونت اختیار نہیں کی۔ تاہم اُن کے دل و دماغ میں وہاں کے قدرتی مناظر اور خوبصورت جھیل اور باغات نے انمٹ نقوش بنا لیے تھے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں خوبصورت مناظر اور ان سے والہانہ عشق نے بابر کے مزاج میں وہ لطافت اور نزاکت پیدا کی جس کے سرے شاعری سے جا ملے۔ بابر کے وطن اندیجان کی خوبصورتی کے بارے میں قمر رئیس لکھتے ہیں:

> "جب مجھے دوسری بار اندیجان کی سیر کا موقع ملا
> تو وہاں بابر فاؤنڈیشن کے صدر جناب ذاکر جان مشرب کا
> مہمان ہوا۔ زمین پر اترنے سے پہلے جب ہوائی جہاز نے اس شہر کا

چکر لگایا تو میں نے دیکھا کہ شہر کی شاہراہیں، عمارتیں، دریا سب سر سبز و شاداب درختوں کے ہجوم میں گم ہو گئے ہیں۔اس وادی میں یہ موسم بہار کے شباب کا زمانہ تھا۔سڑکوں پر دونوں جانب اُگے ہوئے چناروں اور دوسرے پیڑوں کے باہمی مل جانے سے محراب نما سر نگیں سی بن گئی تھیں ...سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے فرغانہ کی کوہستانی وادی کو جو بے پایاں حسن عطا کیا ہے بابر اس کا دیوانہ تھا۔فطرت کے اسی رنگین اور شاداب گہوارہ میں اس کے شاعرانہ تخیل کی تربیت ہوئی۔اس کے باغوں، چناروں اور شیریں پھلوں کی تعریف کرتے وہ کبھی نہیں تھکتا۔"55

تزک بابری میں بھی شہر اندیجان، وادی فرغانہ اور اس کے مختلف علاقوں کی خوبصورتی کا بہت تفصیل سے بار بار ذکر آیا ہے۔متعدد مرتبہ تذکرہ کیے جانے سے نہ صرف اُس علاقے کے پرکشش اور سرسبز و شاداب ہونے کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس سے بابر کے میلانِ طبع کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ان کے سینے میں ایسا دل تھا اور خدا نے انہیں ایسی نگاہ بخشی تھی کہ وہ قدرت کی نیرنگیوں کو محسوس کر سکتے تھے۔اُس سے متاثر ہوتے اور اُن کی طبیعت مچل اٹھتی تھی۔بابر نے جس تفصیل اور باریک بینی سے وادی فرغانہ کا ذکر کیا ہے اور وہاں کے موسم، باشندوں، پھلوں اور آبشاروں کی جزیات بیان کی ہیں اُن سے ان کی متاثر ہونے کی شدت اور جذباتی مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔تزک بابری سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

"فرغانہ کا یہ ملک جس کی بادشاہت سے میں سرفراز ہوا گو کوئی بڑا ملک نہیں ہے مگر اس میں غلوں اور میوں کی پیداوار خوب ہے۔ دریائے سیحوں اس ملک میں شمال و مشرق کی سمت سے داخل ہوتا اور ملک کے وسط سے گزرتا، مغرب کو بہنے لگتا ہے۔ کسی قدر آگے جا کر شمال کی طرف مڑتا، ترکستان کا رخ اختیار کرتا ہے۔ اندیجان اس ملک کا پایہ تخت ہے۔ جو حد درجہ سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں کا انگور اور خربوزہ(سردہ) بہت اچھا اور عمدہ ہوتا ہے۔ اندیجان کی ناشپاتی تو اپنی مثال

آپ ہے۔

> اندیجان کا قلعہ بہت مضبوط اور سمرقند اور کیش کے قلعوں کی ہمسری کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے تین دروازے ہیں اور نو نہریں مختلف حصوں میں بہتی ہیں۔ اندیجان کے لوگ بہت خوبصورت ہیں۔''56؎

ظہیر الدین محمد بابر نے اسی طرح فرغانہ کے دوسرے شہروں مثلاً اوش، مرغینان، اسفرہ اور خوقند وغیرہ کی بھی منظر کشی کی ہے۔ قمر رئیس نے مناظر فطرت سے بابر کی دلچسپی کے ساتھ اِرد گرد بولی جانے والی زبانوں یعنی دیہات کی پرانی ترکی، کوچہ و بازار کی فارسی (clocial)، اہل علم کی فارسی اور عربی وغیرہ میں ان کی دلچسپی پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ چغتائی، ازبکی اور ترکی ان کی اصل زبانیں تھیں جن میں ان کی تحریریں موجود ہیں۔ قمر رئیس نے بابر کے عشق اور شادیوں کا بھی مفصل بیان کیا ہے اور اس بیان کے ذریعہ بابر کے جمالیاتی حس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ بابر کی پہلی شادی اُس کی چچازاد بہن عائشہ سے انجام پائی جس سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کے چالیس دن بعد وہ مرگئی۔ اس دوران بابر کو ایک لڑکے سے عشق ہو گیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد بابر نے عائشہ کی چھوٹی بہن معصومہ سے شادی کی۔ ان دونوں میں بے پناہ محبت تھی لیکن معصومہ بھی ایک بچی کو جنم دینے کے بعد جلد ہی فوت ہو گئی۔ اس کے بعد بابر کی شادی عم زاد بہن زینب سلطان سے انجام پائی لیکن دو سال کے اندر چیچک کے عارضہ کے سبب اُس کا بھی انتقال ہو گیا۔ سمرقند اور کابل میں شکست سے افسردہ اور ملول بادشاہ بابر کی حساس طبیعت مزید حساس ہو گئی۔ اس دوران یعنی 1511ء کے بعد انہیں کیفیات سے دوچار ہو کر وہ شاعری، موسیقی اور طرب و نشاط کی طرف مائل ہوا۔ اکثر وہ مفتوح قبیلوں کی حسیناؤں کو اپنے حرم میں داخل کر لیتا تھا۔ شراب اور نشے کی دوسری اشیاء کا بھی وہ عادی ہو گیا۔ ہندوستان کی فتح کی تیسری کوشش کے دوران اُس نے قبیلہ یوسف زئی کے بادشاہ ملک شاہ منصور کی دختر افغان بیگم کو بھی داخل حرم کیا۔ بابر اپنی اس بیگم کو بہت چاہتا تھا اور اسی کے کہنے پر اس نے یوسف زئی قبیلے کو معافی دے دی تھی اور یہی بیگم (اصل نام مبارکہ بیگم) بابر کے انتقال کے نو سال بعد آگرہ آکر یہاں سے اپنے شوہر کی باقیات لے گئی تھی اور اسے کابل کے باغ بابر میں دفن کیا۔ بہر حال! عیش پرستی کی طرف جھکاؤ

کے باوجود بابر مسلسل اپنا روز نامہ لکھتا رہا جس میں واقعات کے ساتھ افراد و مقام کے نام وغیرہ بھی درج ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک مے پرست نہیں تھا کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ قمر رئیس نے مغربی محققین کی مدد سے یہاں تک پتہ لگایا ہے کہ بابر نے پہلی بار شراب کا مزہ کب چکھا تھا۔ 1506ء میں جب وہ اپنے چچا زاد بھائیوں کی دعوت پر کابل کی راجدھانی ہرات پہنچا تو وہاں کی شان و شوکت اور عیش و نشاط کے ساز و سامان میں کھو سا گیا۔ اس کی زبردست ضیافت اور پذیرائی بھی کی گئی۔ یہیں اس کا شراب سے رشتہ قائم ہوا اور یہ رشتہ کنواہہ کی جنگ تک قائم رہا جب بابر نے مے نوشی ترک کر دی۔ محققین کی یہ بھی رائے ہے کہ بابر نے اس موقع پر صرف شراب نوشی ترک کی تھی۔ دیگر منشیات کا استعمال جاری رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ محض 47 برس کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملا۔

قمر رئیس نے بابر کی انسان دوستی، انصاف پسندی، شرافت نفسی، بے نیازی، خود اعتمادی، جنگ آرائی، صف آرائی اور محفل آرائی کے بے شمار قصے اور واقعے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف میں درج کیے ہیں۔ ان واقعات کا اہم ترین ماخذ خود بابر کی تزک ہے۔ اس لیے ان کی صحت پر شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قمر رئیس نے بابؔر کے کلام کا مطالعہ بالراست اُس کے دیوان سے کیا ہے چنانچہ بعض مشہور و معروف اشعار و ضرب المثل سے منسوب واقعات کی تشریح و تعبیر بھی بیان کی ہے۔ مثلاً

> ''بابر نے کابل میں ایک پسندیدہ کوہستانی شراب کے لیے سرخ رنگ کے سماق (نرم پتھر) کا حوض تعمیر کرایا تھا۔ موسم گرما کی پرفضا راتوں میں یہاں ارباب نشاط کے رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں۔ اسی حوض کے کنارے پر بابر مرزانے ایک شعر کندہ کرایا تھا جو بعد میں ضرب المثل بن گیا ؎
>
> نوروز و نوبہار و مے دلبرے خوش است
> بابرؔ بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست
>
> دراصل اسی مضمون کے متعدد اشعار اور رباعیات بابر کے دیوان میں ملتے ہیں۔ فارسی اور ترکی میں خمریاتی شاعری

کی جو روایت تھی اس کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ
محض رسمی شاعری تھی یا شعراکی، حقیقی زندگی کی مے
گساریوں کی ترجمان تھی۔ لیکن بابر کے بارے میں تو رائیں نہیں
کہ شراب و شعر کی محفلیں اس کی، رومان انگیز زندگی کا
خاص حصہ بن گئی تھیں۔‘‘57

بابر کا یہ مصرعہ کہ ’’بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست‘‘ صرف ازبکستان یا ایران ہی میں نہیں بلکہ برصغیر ہندوپاک میں بھی اتنا مقبول عام ہے کہ اسے ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے۔(58)

قمر رئیس نے مختلف واقعات سے پیوستہ بہتیرے اشعار کا ترجمہ کیا ہے اور مختلف موضوعات کے تحت اُن کا تنقیدی محاکمہ بھی کیا ہے۔ بابر کی شاعری کے زیادہ تر موضوعات حسن و عشق اور قدرتی مناظر ہیں۔ اُس کے کلام میں موضوعات کے ساتھ لفظیات اور اشعار کی کیفیات میں بھی نازکی اور جمالیاتی حس موجود ہے۔ بابر نے عمر کا اول نصف حصہ گرچہ شراب وغیرہ سے دوری میں گزارا لیکن بعد کی زندگی عیش و عشرت میں گزری؛ شاید یہی وجہ ہے کہ اُس کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں:

آیا رمضاں تو ہوا بادہ پرست
اور عید کا دن آیا تو ہوں جام بدست

کیا فکر نماز و روزہ کی ہو بابر
دن رات ہوں معجون و مے میں سرمست59

شراب اور حسن کے ساتھ بابر کی شاعری میں وصل کی شادکامی اور ہجر کی کلفت کے مضامین بھی موجود ہیں۔ حسن کے بیان یا ہجر و وصال کے مضامین میں بابر کی وضع داری، ایثار نفس اور بنیادی طور پر سادگی اور شرافت کے عناصر موجود ہیں۔ سادگی اور دلکشی کی خوبیاں بابر کی شاعری کے ساتھ اُس کی نثر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

’’بابر کے ذوق جمال کی داستان اس کے تمام مشغلوں اور
تمام تحریروں میں بکھری ہوئی ہے۔ فن شاعری کی طرح نثر کے

بارے میں بھی اُس کا اپنا موقف تھا۔ اپنی تصانیف خصوصاً ''تزک'' میں ابتدا سے آخر تک اس نے جو نثری اسلوب اختیار کیا ہے وہ منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ دلکش اور معیاری بھی ہے۔ ہر چند کہ تزک اس نے مختلف اوقات میں لکھی اور زمانہ قیام آگرہ میں اس نے اس پر نظرثانی بھی کی لیکن اٹھارہ سال کی اس خودنوشت میں سادگی کے پہلو بہ پہلو بے مثل ہمواری، روانی اور دلکشی ہے۔''60؎

قمر رئیس نے زیرِنظر کتاب کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو انہوں نے تحقیق کا بھی پوری طرح حق ادا کیا ہے اس لیے کہ انہوں نے بابر کے حالات زندگی کے سلسلے میں مغربی، ازبکی اور بعض ہندوستانی ادیبوں کی تصانیف اور مقالوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ مغربی اور ہندوستانی دانشوروں کے یہاں عام طور پر بابر کا بحیثیت ایک حکمراں تصور و مطالعہ ملتا ہے۔ اس کے برعکس ازبکی مفکرین، دانشوروں اور علما و ناقدین مثلاً واحد زاہدوف، صادق میرزائف، سعید بیگ حسنو اور الیاس ہاشمو وغیرہ نے بابر کا مطالعہ ایک شاعر، ادیب، دانشور، مفکر، تہذیب کے پاسدار اور حسن کے شیدائی کی حیثیت سے کیا ہے۔ ان ادیبوں کے مطابق بابر ایک انسان دوست، مہذب، روشن ضمیر، حسن پرست اور آزاد خیال شخصیت کا مالک تھا۔

قمر رئیس نے بابر اور اجودھیا کی متنازعہ مسجد کے تعلق سے بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور بڑے مختصر مگر مدلل طریقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ بابر کا نام اس مسجد یا تنازعے سے جوڑنے کی کوئی تاریخی حقیقت یا جواز نہیں ہے۔ انہوں نے کئی مورخین مثلاً پروفیسر آر ناتھ، پروفیسر سوشیل سریواستوا، پروفیسر ہنس کھیا، پروفیسر محبّ الحسن اور بابر نامہ کی مترجم اینٹی سوسانہ بیوراج کے حوالے سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ مسجد بابر کے حکم یا مرضی سے نہیں بنائی گئی تھی۔ اس سلسلے میں قمر رئیس نے سب سے پہلے تو صوفیوں، درویشوں اور دیگر مذاہب سے بابر کی عقیدت اور محبت بیان کرتے ہوئے پس منظر تیار کیا ہے۔ اس کے بعد قمر رئیس نے ایک ایسی شہادت پیش کر دی ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد غالباً کوئی باہوش انسان یہ خیال بھی نہیں کر سکے گا کہ بابر نے اجودھیا میں مندر کو منہدم کر کے مسجد کی تعمیر کروائی ہوگی۔ یہ شہادت بابر کی وصیت ہے جو اس نے اپنے جانشیں ہمایوں کے نام کی تھی:

''تم پر لازم ہے کہ تم اپنی لوحِ دل سے، تمام مذہبی تعصبات کو سٹا دو اور مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو۔ تم خاص کر گائے کی قربانی چھوڑ دو۔ اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرسکو گے۔ پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی۔ جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اُن کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرنا۔ عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔''61؎

اس وصیت میں بابر نے اپنے جانشیں کو زندگی اور حکمرانی کے جو طریقے بتائے ہیں اُن کو پڑھنے کے بعد یہ کبھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اُس بادشاہ نے اجودھیا کی عبادت گاہ کو منہدم کیا ہوگا۔ قمر رئیس نے اجودھیا کی مسجد کے طرزِ تعمیر کا بھی تجزیہ کیا ہے اور اس کا موازنہ وسطی ایشیا کی قدیم مساجد سے کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ طرزِ تعمیر کے اعتبار سے بھی ''بابری مسجد'' شہنشاہ بابر کی ایما پر بنائی گئی مسجد معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ قمر رئیس نے لفظ ''بابری'' کے حوالے سے مسجد کے نام پر بھی بحث کی ہے اور یہ کہا ہے کہ وسطی ایشیائی ممالک میں افراد کے نام سے مساجد کو موسوم کرنے کی مثالیں شاذ و نادر ہیں اس لیے یہ بعید از قیاس ہے کہ ''بابری مسجد'' کے نام کا تعلق بابر سے ہی ہو۔ قمر رئیس نے بعض مورخین کے نظریے پیش کرتے ہوئے اپنی بات اس جملے پر ختم کی ہے کہ:

''الغرض تاریخی شواہد کی روشنی میں جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ صاف کہتے ہیں کہ اجودھیا میں شہید کی جانے والی مسجد کا شہنشاہ بابر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔''62؎

قمر رئیس کی تحریروں کا ایک خاصہ ہے کہ وہ محض مخصوص موضوع یا صرف ادب کے نکات تک محدود نہیں رہتیں بلکہ ان میں عصری حسیات اور سماجی کیفیات کے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں۔ قمر رئیس اپنی اکثر تحریروں میں تہذیبی و تاریخی واقعات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ بابری مسجد کا موضوع چونکہ ہندوستانی قارئین کے لیے ایک انتہائی اہم اور نازک موضوع ہے اس لیے بابر سے متعلق کتاب میں اس پہلو کو نظر انداز کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس پہلو کی اہمیت کا اندازہ کتاب کے مختصر سے ''پیش گفتار'' سے بھی ہوتا ہے جس میں انہوں نے بڑے منفرد انداز

میں ''بابری مسجد موضوع'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اب تک ہندوستانی عوام بابری مسجد تنازعہ کو ہندو مسلم تنازعہ تصور کرتے رہے ہیں یا پھر اسے سیاسی مقاصد کے لیے چھیڑی گئی ایک بحث قرار دیتے ہیں لیکن قمر رئیس نے اسے عالمی اتحاد اور اخوت کے زاویے سے دیکھا ہے۔ پڑوسی ممالک اور ہم خیال دوست ممالک کے قومی ورثے کا احترام کرنا اور اُن کے جذبات کا خیال کرنا کسی بھی ملک سے دوستی کی برقراری اور اس کے مزید فروغ کے لیے نہایت ہی ضروری ہوتا ہے۔ ہندوستان نے شروع ہی سے اور بطور خاص آزادی کے بعد سے اپنے سبھی پڑوسی ممالک سے اچھے مراسم بنا کر رکھنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ پڑوسی ممالک سے عام طور پر تاریخی وتہذیبی رشتے ہوتے ہیں اور پڑوسی ملکوں کے کلچر میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ ازبکستان میں ہندوستان کی فلموں اور سیریلوں کو کافی مقبولیت حاصل ہے۔ ہندوستانی حکومت نے رامائن اور مہابھارت جیسے تاریخی اہمیت اور مذہبی عقیدے سے وابستہ سیریل ازبکستان کو بلا معاوضہ تحفتاً پیش کیے جنہیں وہاں کے قومی ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ ان سیریلوں کا کرشمہ ہے یا پھر وہاں کے عوام کی جذباتی وابستگی کا نتیجہ ہے کہ ان سیریلوں کے متعدد کردار، جو ہندوستانی عوام کے لیے دیوی دیوتاؤں کا درجہ رکھتے ہیں، آج ازبکی عوام کے دلوں میں گھر کر گئے ہیں۔ ایسے ماحول میں وہاں کے ایک قومی ہیرو یعنی بابر سے متعلق بے بنیاد قصے مشہور کر کے اُن پر تنازعہ کھڑا کرنا انتہائی بدنصیبی کی بات ہے:

> ''ہمارے ملک میں گزشتہ دہائی میں کچھ 'جنونی' لوگوں نے بابر مرزا کے نام کے ساتھ جو اضافی صفات جوڑی ہیں وہ کسی بھی طرح جائز اور مناسب نہیں۔ یہ عاقبت نااندیش اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ رویہ ہمارے قومی مفادات کے خلاف ہے۔ ہمسایہ ملکوں مثلاً افغانستان ' ازبیکستان اور نیپال وغیرہ سے قریبی دوستانہ مراسم رکھنا ہماری خارجہ پالیسی کا ایک ستون رہا ہے۔ بابر آج بھی ازبیکستان اور افغانستان کے عوام کے دلوں میں ہیرو کا درجہ رکھتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو ان کے اس جذبے کا احترام لازم ہے جس کے بغیر ہم ان کا دل نہیں جیت سکتے۔ دوستی کے رشتہ کو عوام تک نہیں لے جا سکتے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک موقع پر کہا ہے کہ بابر کی بڑائی اس میں

نہیں کہ اس نے ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اس میں ہے کہ اس نے ہندوستانی عوام کے دلوں کو فتح کیا۔''63

قمر رئیس نے ''ہندوستانی عوام کے دلوں کو فتح'' کرنے والے اس شہنشاہ شاعر کی غزلوں، رباعیات اور قطعات کا منظوم ترجمہ کتاب کے حصہ دوم میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ قمر رئیس کی بے پناہ صلاحیت کے ساتھ اُردو شاعری اور اس کے عروض پر اُن کی غیر معمولی دسترس کا بھی ثبوت پیش کرتا ہے۔ شاعری کا ترجمہ یوں بھی نثر کے مقابلے میں مشکل تصور کیا جاتا ہے اور اگر منظوم ترجمے کی بات ہو تو یہ مزید مشکل ہو جاتی ہے۔ قمر رئیس اس مشکل ترین مرحلے سے بڑے کامیاب و کامران گزرے ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ اُن کا تخلیقی ذہن اور خود اُن کا شاعر ہونا ہے۔ اُنہوں نے بابر کی 30 غزلوں، 20 رباعیوں اور 12 قطعات کا انتخاب کر کے اُنہیں اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے فٹ نوٹ میں بعض ازبکی الفاظ اور محاوروں کی وضاحت بھی درج کر دی ہے۔ انہوں نے تمام رباعیات اور قطعات پر موضوع کی مناسبت سے عنوان لگا دیے ہیں۔ اُردو محققین کے یہاں یہ روایت ملتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے کلیات محمد قلی قطب شاہ مرتب کرتے ہوئے ان کی نظموں پر موضوع کے اعتبار سے مناسب عنوان لکھے ہیں۔ اسی روایت کی پاسداری پروفیسر سیدہ جعفر نے بھی کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے غالباً اسی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان عنوانات کی وجہ سے بیک نظر ان نظموں کے موضوعات کا علم ہو جاتا ہے مثلاً ایک قطعہ ہے:

''انسان کو پوچھتا نہیں، غربت میں آدمی
رہتا ہے رنج و درد و مشقت میں آدمی
میں جب سے بے وطن ہوں، عجب حالِ زار ہے
گم کردہ راہ جیسے ہو وحشت میں آدمی''64

اس قطعے کا عنوان پروفیسر قمر رئیس نے ''دشت غربت'' درج کیا ہے جو یکدم درست معلوم ہوتا ہے۔ ایک رباعی کو ''نیا منظر'' سے معنون کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

بابر جو پہنچ جائے لنگر کی سمت
ہرگز نہ وہ پھر دیکھے کوثر کی سمت
درکار ہے بس تیری کمک شاہ غیاث
جب کوچ کروں میں نئے منظر کی سمت'' 65

اس رباعی میں ازبکستان کے ایک مقام لنگر اور ایک بزرگ کا نام موجود ہے جس کی قمر رئیس نے فٹ نوٹ میں وضاحت فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہرات سے کابل کی طرف جانے والی شاہراہ پر ایک مقام شاہ غیاث کا لنگر کہلاتا ہے اور یہ کہ شاہ غیاث ایک بزرگ تھے۔ اس طرح ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قمر رئیس نے محض متن کے ترجمے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے بابؔر کے کلام میں استعمال ہونے والے اسماء و مقامات کی تعبیر و تشریح بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ازبکستان کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید' پروفیسر قمر رئیس کی اس تصنیف کا محاکمہ کرتے ہوئے ترجمے کی خوبی یوں بیان کرتے ہیں:

''پروفیسر قمر رئیس نے ڈاکٹر عبدالرحمانووا کے تعاون سے اس کلام کے بڑے حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں غزلوں' قطعات اور رباعیات کے ترجمے شامل ہیں۔ ہرچند کہ ترجمہ ترجمہ ہوتا ہے اور پھر شاعری کا لیکن جس لگن اور توجہ کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے اس سے بابر کی شاعری کی تفہیم میں آسانی ہوئی ہے۔ بیشتر اشعار کا ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ پڑھتے ہوئے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' 66

کسی بھی ترجمے کے بارے میں یہ عام رائے ہے کہ ترجمہ اپنے کمال کو اُس وقت پہنچتا ہے جب وہ ترجمہ کے بجائے اصل معلوم ہونے لگے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس میں اصل متن سے ذرا بھی انحراف نہ کیا جائے۔ ''انحراف'' کا اندازہ تو وہی کر سکتا ہے جو اُردو کے ساتھ ساتھ بابؔر کے ازبکی کلام کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ قمر رئیس نے کلام بابؔر کو اُردو کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے اس میں اصلیت کا رنگ پیدا کر دیا ہے اور یہی قمر رئیس کے شعری ترجمے کا کمال ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر غزلوں کے اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جا

سکتے ہیں:

''کہتے ہو جو ہے کانٹوں سے بھری' وہ راہ تمہیں معلوم نہیں
جو دل میں گھر کر لیتی ہے' وہ چاہ تمہیں معلوم نہیں''(ص98)

''پھر موسم گل کی شامیں ہوں' اربابِ نظر کی صحبت ہو
پھر جام اُٹھے پھر دور چلے' اک محفلِ شعر و حکمت ہو'' (ص96)

''ساقی غافل مت ہو جانا' موسمِ گل اک نعمت ہے
عیش کی گھڑیاں لافانی ہیں' ہاتھ میں جام غنیمت ہے'' (ص 92)

''پیکر نازشِ جمال' اے ماہ
کیوں ہوں محروم' تیری دید سے آہ'' (ص 88)

''آسماں نے جو کیا' جور و جفا کیسے کہوں
دل پہ ٹوٹا کس طرح ' سیل بلا کیسے کہوں '' (ص 80) 67ء

ان اشعار میں جو روانی' آہنگ اور شعریت ہے اُس کی وجہ سے ان اشعار کے ترجمہ ہونے کا احساس اُس وقت تک ہوتا ہے جب ہمیں اس کا علم ہو ورنہ ترجمہ ہونے کا احساس جاتا رہتا ہے۔قمر رئیس نے اپنے طویل تمہیدی مقالے میں بابر کے کلام کی جن جن خصوصیات کا احاطہ کیا ہے اُن تمام کی مثالیں انتخاب میں پیش کی ہیں جن کی بنا پر انتخاب کلام میں تنوع ملتا ہے۔قمر رئیس نے یوں تو ازبکستان کے درجنوں شعرا کے کلام کا ترجمہ کیا لیکن علی شیر نوائی اور ظہیر الدین محمد بابر پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔نوائی سے متعلق کتاب شائع ہونے کے آٹھ برس بعد ظہیر الدین باؔبر پر اُن کی کتاب شائع ہوئی۔ان دونوں تصانیف کا آپس میں بڑا گہرا معنوی تعلق موجود ہے اور دونوں کے مطالعہ سے اس کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔بابر پر تحقیق و تصنیف کے دوران قمر رئیس کو یہ شدید احساس ہوا

کہ بابرؔ، علی شیر نوائی سے زیادہ خلاقانہ صلاحیتوں اور ذہانت کا مالک تھا لیکن اُسے اتنا اطمینان اور فرصت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے عین مطابق تخلیقات پیش کر سکتا اور پیش کی گئی تخلیقات کو بہتر طریقے سے منظر عام پر لا سکتا۔ بابر کی پوری زندگی مہم جوئی میں گزری۔ قمر رئیس ان دونوں شعرا کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل بابر مرزا کا المیہ یہی ہے کہ اس کو علی شیر نوائی جیسی فراغت اور عافیت میسر نہ آئی ورنہ اپنی تخلیقی ذہانت اور اختراعی فکر (Originality) کے اعتبار سے وہ ملّا علی شیر نوائی سے کم نہیں بلکہ زیادہ بلند و بالا ہی تھا۔ اپنے معاشرہ اور اپنے تہذیبی ورثہ کے بارے میں اس کا رویہ زیادہ ناقدانہ اور باغیانہ تھا۔ زندگی کے معاملات اور حقائق کے بارے میں اس کا طرزِ احساس اور طریق فکر نوائی سے زیادہ تعقل دوست اور حقیقت پسندانہ تھا۔ بابر مرزا کے تجربات کی دنیا بھی زیادہ وسیع اور متنوع تھی اور اس سے اس کے تخیل میں زیادہ جولانی اور کشادگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس سچائی سے انکار بھی مشکل ہے کہ دوسرے کلاسیکی شعرا کے مقابلہ میں بابر کا ذوقِ جمال زیادہ پہلو دار اور نفیس و نازک تھا لیکن افسوس کہ اس کی شخصیت کے ان کمالات کا اس کی شاعری میں بھر پور اظہار نہ ہو سکا۔''68

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے پروفیسر قمر رئیس کی اس تصنیف کو بجا طور پر ''بابر شناسی کی ایک نئی جہت'' قرار دیا ہے۔ وہ پروفیسر قمر رئیس کی بابر شناسی و بابر فہمی کی انفرادیت کی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر قمر رئیس کی بابر کے سلسلے میں جو فہم ہے وہ روایتی نہیں ہے بہ الفاظ دیگر وہ دوسرے بابر شناسوں سے مختلف ہیں۔ یہاں بابر کی وہ شخصیت جو ایک فاتح اور حکمراں سے عبارت ہے۔ اس کا تذکرہ ذیلی اور محض حوالوں کے طور پر آیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس تصنیف کے پس پردہ جس مقصد کی کارفرمائی ہے وہ بابر کی افہام و تفہیم کے علاوہ اس

کی معترضانہ شخصیت کو صاف و شفاف بھی کرنا ہے۔سچ تو یہ کہ اس کتاب سے جہاں بابر فہمی کے نئے باب کھلتے ہیں وہیں اصل بابر کی روحانی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔"69

قمر رئیس نے بابر کے کلام کا ترجمہ بھی اپنی تصنیف میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ترجمہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ترجمہ سادہ سلیس اور رواں ہے۔ ان میں سحرانگیز تازگی اور حلاوت کا احساس ہوتا ہے۔ دو مصرعوں میں موسیقی کی کیفیات ' ایجاز بیان اور شعری اظہار و استعاراتی جدت اور وزن و بحر کے فطری التزام نے ترجمے کو تخلیقی حسن عطا کر دیا ہے۔"70

ازبیک شعرا کے تعلق سے قمر رئیس کی ایک اور اہم کتاب' اُن کی تازہ تصنیف "بیسویں صدی کی ازبیک شاعری" ہے جس میں بیسویں صدی کے 33 شعرا کے منتخب کلام کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 2001ء میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے تعاون سے ہند۔ازبکستان دوستی سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ جون 2001ء میں قمر رئیس تاشقند میں پانچ برس خدمات انجام دینے کے بعد ہندوستان لوٹ آئے۔ اسی اثنا میں انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسرشپ کی پیش کش کی گئی۔ متذکرہ بالا اکیڈمی کچھ ہی عرصہ قبل قائم ہوئی ہے۔ جہاں وسطی ایشیا خصوصاً ازبکستان کی زندگی' زبان' تہذیب و معاشرت پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ چونکہ قمر رئیس کو جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر نے خصوصی طور پر اس اکیڈمی میں خدمات انجام دینے کی پیش کش کی اس لیے اُنہوں نے ازبکستان کی تاریخ' تہذیب اور عوام سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کے سبب اس ذمہ داری کو قبول کر لیا اور وہاں اس اکیڈمی کی بنیادی پیش رفت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ قمر رئیس گزشتہ 35-30 برسوں سے جدید ازبیکی شاعری کا مطالعہ اور گاہے گاہے ترجمہ کر رہے تھے' تاشقند سے واپسی کے ساتھ ہی جامعہ ملیہ سے وابستگی پر انہیں یہ مناسب موقع محسوس ہوا کہ بیسویں صدی کے جن شعرا کے کلام کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے اسے ترتیب

دے کر کتابی صورت میں شائع کیا جائے چنانچہ ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' منظر عام پر آئی۔

2001ء جمہوریہ ازبیکستان کی تشکیل یا اس ملک کی آزادی کے دس سال تکمیل ہونے کا سال بھی تھا اور اس مناسبت سے کتاب کی اشاعت بہت موزوں تھی۔ اس موقع پر ازبیکستان میں دس سالہ تقریب کا اہتمام بڑے شان وشوکت سے کیا گیا تھا۔ قمر رئیس نے تقریب کے موقع سے کتاب کی اشاعت کی خوشگوار نسبت کا ذکر اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں تراجم کے حوالے سے وہی باتیں لکھی جاسکتی ہیں جو نوآئی اور بآبر کے تراجم کے سلسلے میں درج کی گئی ہیں یعنی شعرا کے کلام کے انتخاب میں ان کی نمائندہ غزلوں یا نظموں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ترجمے کے دوران فٹ نوٹ میں مقامی الفاظ، رسوم اور محاوروں کی وضاحت کردی گئی ہے۔ شعرا کے انتخاب میں بھی قمر رئیس نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اُن کی شعوری کوشش رہی ہے کہ وہ ایسے شعرا کا انتخاب کریں کہ ہر نظریے، مکتبہ فکر اور ہر لب و لہجے کی نمائندگی ہو جائے۔ ان شعرا میں ارکن واحدوف، اسعد مختار، آئبیک آئدین حاجی ایوا، جمانیاز جباروف، حسن الدین شریپوف، حمید عالم جان، حمید غلام، رمز بابا جان، زلفیہ خانم، سعیدہ ذالنونووا، شااسلام شامحمدوف، شکراللہ، شہرت، صابر عبداللہ، عبداللہ عاریپوف، غفور غلام، کلچھرہ نورالاوا، مقصود شیخ زادہ، میر تیمیر، میر محسن، یوسف شاہ منصور، اقبال، امان متجان، امیر فیض اللہ، بھرام رضی محمد، خورشید دوراں، رؤف پرفی، عثمان قچقار، محمد علی، مختصر تاجی ممانووا، یولداش الیش بیک اور یولداش سلیمان شامل ہیں۔

ان شعرا کے زیادہ تر کلام کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے لیکن بعض موقعوں پر نثری ترجمے کو ترجیح دی گئی ہے۔ کتاب پر قمر رئیس کا دس صفحات پر مشتمل مقدمہ انتہائی معرکۃ الآرا ہے۔ جس میں ازبیکستان کی تاریخ، ہندوستان سے اس کے تہذیبی وتاریخی رشتے، ازبکی زبان، اُس میں اُردو اور ہندوستانی الفاظ کی موجودگی، ترجمے کے مسائل اور خاص طور پر شاعری کے ترجمے کی دشواریوں پر اختصار کے ساتھ بڑی اہم اور کارآمد نکات پیش کیے ہیں۔ زیر نظر کتاب کے معرض وجود میں آنے کا سبب قمر رئیس نے اس طرح بیان کیا ہے۔ اس میں اُن کی انکساری بھی ہے اور دوسری قوم کے شعر وادب کے ترجمے کے تعلق سے بہت اچھی رائے بھی:

''ازبیک شعرا کی نمائندہ نظموں کا یہ ترجمہ کسی

خاص پروجکٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ میرے بارہ سالہ زمانۂ قیام میں یہ کام وقفوں اور قسطوں میں ہوتا رہا ہے۔ اس میں میرے عزیز احباب رحمان بیردی محمد جانوف (مرحوم)اور امیر فیض اللہ کے پرخلوص تعاون کا اہم حصہ رہا ہے۔ بول چال کی ازبیکی زبان سے میرا کچھ تعارف ضرور ہے لیکن شعری زبان کی رمزیت' اس کی نزاکت اور لطافت کو سمجھنا اور سمجھانا اہل زبان ہی کا کام ہے 71۔... میں اس خیال کا بھی حامی رہا ہوں کہ دوسری قوم کے شعروادب کے ترجمہ کا مقصد صرف اس کے ادبی شاہکاروں سے لطف اندوز ہونا نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کا مدعا' اس قوم کی زندگی' اس کے تہذیبی شعائر اور اس کے مسائل کو سمجھنا ہے۔ اس کی ذہنی' جذباتی اور روحانی وارداتوں میں شریک ہونا ہے۔ اس کی بدلتی ہوئی قدروں' اس کے انسانی رشتوں اور ساری انسانیت کے تئیں اس کے رویوں کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ موثر وسیلہ ہے جو دو قوموں کے درمیان دوستی' خیرسگالی اور محبت کے رشتوں کو استحکام بخشتا ہے۔'' 72

ترجمے اور خاص طور پر شاعری کے ترجمے کے بارے میں قمر رئیس کا ماننا ہے کہ یہ انتہائی مشکل اور نازک کام ہے۔شاعری کے ترجمے کا کوئی مخصوص فارمولا بھی نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ ہر شعری صنف یا ہر شعری نمونہ فن' مخصوص لب و لہجے اور مخصوص مزاج کا حامل ہوتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''دراصل شاعری کے ترجمے کے مسائل بہت نازک اور دشوار ہیں(ان پر گفتگو کا یہ موقع نہیں)۔ہر نظم مترجم کے سامنے' اکثر اپنے الگ مسائل لے کر آتی ہے جو مترجم کو محنت اور تخلیقی بصیرت سے حل کرنا پڑتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر نظم یا شعری تخلیق کے تاروپود(Texture) میں صرف معنوی نہیں بلکہ تہذیبی' تخیل' لسانی اورجمالیاتی عناصر باہمی طور پر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح ہے کہ

ہر شعری تخلیق میں کچھ ایسے اجزاء و عوامل ضرور ہوتے ہیں جو دوسری زبان (خاص طور پر ایک مختلف تہذیب و معاشرت کی پروردہ زبان) میں بجنسہ منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن اگر دونوں زبانوں نے ایک طرح کے افکارو عقائد' ایک جیسی تہذیب اور مشترک اوصاف کے تخیلی' لسانی اور جمالیاتی ماحول میں پرورش پائی ہو تو نظم اور اس کے تخلیقی تاروپود کو ایک سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے۔ ''73ؔ

شعری ادب کے ترجمے کے دوران قمر رئیس کو اُردو اور ازبیک زبانوں میں الفاظ کی غیر معمولی مماثلت کا بھی احساس ہوا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''اُردو اور ازبیک زبان اور ان کے سرمایۂ شعری میں گہری مماثلتیں ہیں۔ دونوں زبانوں میں فارسی'عربی اور ترکی (اُردو کے حوالے سے) کے ہزاروں الفاظ مشترک ہیں۔ ایسے تین ہزار مشترک الفاظ کی ایک لغت میرے ایک شاگرد انصارالدین نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ لیکن انہیں اور دوسرے علما کو اس بات کا اعتراف ہے کہ شاعری میں استعمال ہونے والے مشترک الفاظ کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ شعری اصناف' غزل' قصیدہ' مثنوی' رباعی' قطعہ' مسدس' مخمس وغیرہ بھی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کلاسیکی اور نوکلاسیکی شاعری میں دونوں زبانوں کا تخیلی سرمایہ اور صنائع بدائع بھی یکساں اور مشترک ہیں۔ تشبیہ' استعارے' کنایے' تلمیحات' تمثیلات' شعری اظہارات یہاں تک کہ محاورات کا بڑا سرمایہ بھی دونوں زبانوں اور ان کی کلاسیکی شعری لفظیات میں مشترک حیثیت رکھتا ہے۔'74ؔ

ان مماثلتوں کا تذکرہ اُنہوں نے ایک دوسرے مقام پر بھی کیا ہے اوران کا سارا زور اس بات پر رہتا ہے کہ جب دو زبانیں بولنے والے ممالک کے درمیان ماضی میں کوئی تہذیبی رشتہ ہوتا ہے تو ہزاروں برس گزر جانے

کے بعد بھی، جب تہذیبیں اور زبانیں ارتقا کی منزلیں طے کرلیتی ہیں، ایسی صورت میں دونوں زبانوں کے الفاظ کہیں نہ کہیں یکساں ضرور ہوتے ہیں۔ دراصل تہذیبی اور تاریخی جڑوں کی مماثلت وقت کے ارتقائی سفر کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے اور یہ مماثلت کسی نہ کسی شکل میں قائم رہ جاتی ہے۔

قمر رئیس نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ ازبکستان یا مشرق وسطیٰ کے دوسرے علاقوں کے لوگ جب یہاں آئے تو وہ پورے ملک میں نہیں پھیلے بلکہ اُن کا مستقر عموماً شمالی ہندوستان رہا۔ اس لیے وہاں کے الفاظ اگر ہندوستان میں مروج ہوئے یا یہاں کے الفاظ وہاں رواج پا گئے، دونوں ہی صورتوں میں شمالی ہندوستان ہی متاثر ہوا۔ اسی خطے میں وہاں کے اثرات قبول کیے گئے اور وہاں جو اثرات قبول کیے گئے وہ اسی خطے سے تعلق رکھتے ہیں:

> ''اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شمالی ہندوستان کی ملی جلی تہذیب، اُردو زبان اور اس کی ادبی و شعری روایت، ازبیکستان کی تہذیب، زبان اور شعری روایت سے غیر معمولی مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ ازبیک زبان میں اردو شعرا مثلاً غالب، اقبال اور فیض کا ترجمہ نسبتاً آسانی اور کامیابی سے ہو سکا۔ اسی سہولت کا احساس، ترجمہ کرنے کے عمل میں مجھے بھی ہوا۔'' 75

قمر رئیس نے مندرجہ بالا کتاب ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' میں بھی ازبیکستان اور ہندوستان کے قدیم علمی، تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں زبان، ادب، مذہب اور تہذیب کے ساتھ ساتھ متعدد دوسرے علوم وفنون کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ازبیکستان اور ہندوستان کے اس شاندار ماضی کو بیان کرنے کے بعد قمر رئیس نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ زمانہ قدیم سے بنے ہوئے ان باہمی رشتوں کو برطانوی اور سوویت روس کے دور میں نقصان پہنچا۔ اسی کے ساتھ وہ موجودہ صورت حال کا بیان کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ حالیہ عرصے میں تعلقات ایک بار پھر سے استوار اور مستحکم ہونے لگے ہیں:

اقتباس دیکھئے:

''ان معروضات کا مقصد ہندوستان اور ازبیکستان کے دیرینہ رشتوں کی اہمیت اور معنویت کو جتانا ہے۔ اسلامی عہد کے آغاز کے بعد یہ رابطے دونوں خطوں کے درمیان' انیسویں صدی کے اوائل تک قائم رہے لیکن بد قسمتی سے برطانوی عہد اور پھر سوویت دور میں یہ تعلقات تعطلّ کا شکار ہو گئے اور ان کی تاریخی اہمیت کو بھی نظر انداز کیا گیا۔

ازبیکستان کی قومی آزادی (1991ء)کے بعد ہمسایہ ایشیائی ملکوں سے تہذیبی اور تجارتی رشتوں کی تلاش اور بحالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔''76

پروفیسر قمر رئیس کے ان فکر انگیز خیالات کے تناظر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تصنیف صرف نمائندہ ازبیکی شعراء کے کلام کا انتخاب اور ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ایسے دانشور استاد کی بڑی بیش قیمت آرا بھی موجود ہیں جنہوں نے ازبیکستان کی سرزمین پر بہ نفس نفیس اپنی زندگی کے بہترین برس بتائے اور اپنے مشاہدے' مطالعے اور تحقیق کا عطر مجموعہ مقدمہ میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف پروفیسر قمر رئیس کی اس تصنیف پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اُنہوں نے ازبیکستان میں ہندوستانی ثقافت کی افہام و تفہیم اور ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا تو دوسری طرف ازبیکستان سے متعلق دو کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔'' 77

قمر رئیس نے اپنی مذکورہ بالا تحریروں (جس میں ترجمے' تاریخ' تحقیق اور سفر نامہ شامل ہے) کے ذریعے ازبیکستان کی سرزمین' وہاں کی ثقافت' اس ملک کی تاریخ اور وہاں کے عوام کے دلوں کی دھڑکنوں ہی کو نہیں پیش کیا ہے بلکہ ازبیکی ادب کو اُردو میں متعارف کرانے کا اہم فریضہ بھی ادا کیا ہے۔ برصغیر ہندو پاک کی تاریخ ادبیات میں پروفیسر قمر رئیس ہی کی ذات ایک ایسی نظر آتی ہے جس نے ازبیکستان کے تعلق سے اس قدر بڑے پیمانے پر اور اتنے منظّم انداز سے اپنی نگارشات کو پیش کیا ہے۔ یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ موجودہ عہد میں اگر قمر رئیس نے ازبیکستان اور وہاں کے ادب کو اُردو میں پیش کرنے کا قصد نہ کیا ہوتا تو آج کی اُردو دنیا ان شعری و ادبی کارناموں سے اچھی

طرح واقف و باخبر نہ ہو پاتی۔

اُردو دنیا کو ازبیکی ادب سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ قمر رئیس نے ازبکستان کے ادبأ و شعرأ سے اُردو ادیبوں کو بھی بڑے پیمانے پر متعارف کرایا ہے۔ اُنہوں نے متعدد اُردو ادیبوں پر ازبیکی زبان میں اپنے شاگردوں سے تعارفی مضامین لکھوائے اور خود اُنہوں نے بھی متعدد مضامین سپرد قلم کیے۔ اُنہوں نے ہندوستانی ادب کے ازبیکی ترجموں پر مقدمے تحریر کیے، ترجمے کی مشکل وادیوں کی سیر کی اور اس سلسلے میں وہاں کے ادیبوں کی اُردو سے ازبیکی ترجمے میں مدد کی۔ اسی کے ساتھ ان ترجموں کی اشاعت کی راہیں بھی ہموار کیں۔ اس بارے میں ایک ازبیک اسکالر ڈاکٹر سونیا چیرنی کووا لکھتی ہیں:

"ڈاکٹر قمر رئیس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے اُردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کو سوویت ازبیکستان میں متعارف کرایا۔ اُن کے ترجمے کرائے اور اُن کا تعارف لکھا۔ مرزا غالبؔ کا جو ترجمہ ازبیکی میں ہوا اس کا مقدمہ ڈاکٹر قمر رئیس نے ہی لکھا۔ اسی طرح اقبال، فیض، منٹو، مجاز، مخدوم، کرشن چندر، بیدی اور دوسرے ادیبوں کے کلام کا جو انتخاب انہوں نے کیا وہ ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ ان کے مشوروں سے شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹریٹ کے مقالے کے موضوعات طے ہوئے اور لکھے گئے۔" 78

قمر رئیس نے قیام تاشقند کے دوران بے شمار طلبہ کو اُردو پڑھائی اور ان کی تہذیب و تربیت کی۔ اُن کی انہیں کوششوں کی بنا پر تاشقند میں انہیں اُردو کے مسیحا اور محسن کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کووا مزید لکھتی ہیں:

"کوئی اسکالر ایسا نہ تھا جس نے اپنے علمی کام میں قمر صاحب سے مدد نہ لی ہو۔ طالب علموں کے ساتھ اُن کا وہ سلوک تھا جو بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کے درمیان ہوتا ہے۔ قمر رئیس صاحب کے تاشقند میں رہنے سے سوویت یونین کے اسکالرز کو جتنا فائدہ پہنچا وہ لفظوں میں بتانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے... تاشقند یونیورسٹی جب اپنے محسنوں کے نام یاد

کرے گی تو قمر صاحب کا نمایاں ہوگا۔'' 79؎

ازبیکستان میں قمر رئیس نے صرف اُردو کے ایک استاد نہیں بلکہ ایک تہذیبی سفیر' ادب شناس فنکار' انسان دوست استاد کی حیثیت سے خود کو پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ادبا و شعرا کے ساتھ ساتھ وہاں کے حکام نے بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جس کی سند انہیں عطا کی جانے والی حسب ذیل اعزازی ڈگریاں ہیں:

O مئی 2001ء میں اکیڈمی آف فائن آرٹس' ازبیکستان نے قمر رئیس کو فائن آرٹس میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کرتے ہوئے اپنے افتخار میں اضافہ کیا.........اور

O جون 2001ء میں تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز نے ادب میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

پروفیسر قمر رئیس نے ازبیکستان میں رہ کر دو سطحوں پر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اولاً ہندوستانی اور اُردو زبان و ادب کو اس دیارِ غیر میں فروغ دیا اور اُردو' ہندی و بنگالی ادب کے شاہکار شہ پاروں کے تراجم ازبیکی زبان میں کروائے اور دوم ازبیکستان اور ازبیکی شعراُ کے فن سے اُردو اور ہندوستان کو روشناس کیا۔

مندرجہ بالا سطور میں ایک ازبیکی اسکالر ڈاکٹر کووا کے اقتباس درج کیے گئے ہیں جن میں قمر رئیس کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ازبیک شعرا کے کلام کے تراجم اُردو میں شائع کیے۔ ان تراجم کے مطالعہ کے بعد سجاد ظہیر اپنے ایک انگریزی مضمون میں لکھتے ہیں:

"Having lived in for a long time in Uzbekistan, K. Rais through his poetry acquaints us with the Soviet Social Society in Uzbekistan, that extends the topic of discussion of Urdu poetry" 80؎

ترقی پسند تحریک کے اولین سالار سجاد ظہیر کی یہ تحریر دراصل قمر رئیس کی خدمات کا اعتراف ہے۔ سجاد ظہیر نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ قمر رئیس کے تراجم ہی کے وسیلے سے ازبیکستان کے سماجی حالات کا عرفان ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر ہندوستانی تھے' اُردو کے ادیب تھے۔ ممکن ہے کہ اُن کی اس رائے کو بزرگانہ شفقت قرار دیا جائے۔ مگر اس

باب کو ازبیک اسکالر کمالوف کے اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے جنہوں نے ازبیکستان میں پروفیسر قمر رئیس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بین الاقوامی تہذیبی روابط میں اس سے اہم اور اس سے خوبصورت خدمت کوئی اور ممکن نہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "To my mind, there is no more beautiful and more important work in the field of development and strengthening of International cultural ties, than that made by K. Rais." 81

....

حواشی و حوالے

1 کھ۔این۔کمالوف ''ازبیک شعرا و ادبا کی اُردو اور ہندی خدمات'' ص36
مقالہ مشمولہ ''ہندوستان اور ازبیکستان کے درمیان تاریخی و تہذیبی رابطے'' سنہ اشاعت 1996ء

2 قمر رئیس ''ہند ازبیکستان تہذیبی تعلقات'' ص6 مضمون مشمولہ "Shark aldezia" تاشقند بحوالہ ایضاً

3 قمر رئیس ''جدید ازبیکی شاعری'' ص69 مضمون مشمولہ تلاش و توازن سنہ اشاعت 1968ء

4 قمر رئیس ''جدید ازبیکی شاعری'' تحشیہ برصفحہ 70-69 مضمون مشمولہ تلاش و توازن سنہ اشاعت 1968ء

5 قمر رئیس 'دیباچہ' مشمولہ ''ازبیکستان انقلاب سے انقلاب تک'' ص15 سنہ اشاعت 1997ء

6 قمر رئیس 'دیباچہ' مشمولہ ''ازبیکستان انقلاب سے انقلاب تک'' ص16 سنہ اشاعت 1997ء

7 قمر رئیس 'ازبیکستان اور علی شیر نوائی' ص17 ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ، دسمبر 1994

8 ڈاکٹر دیوندر کوشک بحوالہ قمر رئیس 'ازبیکستان اور علی شیر نوائی' ص18 ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ، دسمبر 1994

9 قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص71-70

10 قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص71

11 قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص73-72

12 قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص73

13 قمر رئیس ''تلاش و توازن'' ص98

14 پروفیسر سید احتشام حسین ''جدید روسی ادب کا نظریاتی ارتقاء''

ص261-260 مضمون مشمولہ روایت اور بغاوت طبع دوم 1956ء

15۔ قمر رئیس ''تلاش وتوازن'' ص75

16۔ قمر رئیس'ازبیکستان اور علی شیر نوائی' ص10 ہریانہ اردو اکادمی' پنچکولہ' دسمبر 1994

17۔ مجتبیٰ حسین '' کچھ پھل' کچھ قہقہے اور تھوڑی سی تنقید'' ص 65 مشمولہ قمر رئیس: ایک زندگی

18۔ قمر رئیس''ازبیکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' ص 26

19۔ قمر رئیس''ازبیکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' ص 20

20۔ قمر رئیس''ازبیکستان انقلاب سے انقلاب تک'' ص31-30

21۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص 30-29

22۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص 31-30

23۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص 19

24۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص3

25۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص20

26۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص 239

27۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص20

28۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص19-18

29۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص20

30۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص25-24

31۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص27-26

32۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص18-17

33۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص42

34۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص88

35۔ قمر رئیس''ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک'' ص18

36۔ قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' پیش لفظ ص 9

37۔ قمر رئیس''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 14

38۔ قمر رئیس''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 16

39 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 21-20

40 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 28-27

41 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 34

42 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ، دسمبر 1994ء ص۔34

43 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 39

44 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ص 10

45 سقراط سے جب پوچھا گیا کہ تم نے علم کہاں سے سیکھا تو اُس نے جواب دیا تھا کہ میں نے علم جاہلوں سے سیکھا ہے۔علی شیر نوائی مفکر و شاعر تھے انہوں نے سقراط کے اس قول کو اپنے شعر میں موزوں کیا ہے۔(م۔ج)

46 قمر رئیس ''ازبیکستان اور علی شیر نوائی'' ہریانہ اردو اکادمی، ص 8-7

47 48 49 50 51 52 53 ظفر الدین ''قومی آواز'' نئی دہلی بابت 30 جولائی 1995ء

54 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر: شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 6، دہلی 2002ء

55 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 15 - 13

56 بحوالہ پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 15

57 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 40

58 قمر رئیس نے جون 2003ء میں بتایا کہ اس شعر کے سلسلے میں دو الگ الگ افراد کے خطوط آئے جن کا کہنا ہے کہ یہ شعر بابر کا نہیں بلکہ اُس کے کسی معاصر شاعر کا ہے البتہ شاعر کا نام کسی نے نہیں بتایا۔دراصل مصرعہ ثانی بآبر کے ہم تخلص شاعر ابوالقاسم مرزا بآبر کی تخلیق ہے۔ابوالقاسم مرزا بابر، ظہیر الدین محمد بابر کا چچا تھا۔گلشن ابراہیم یا نورس نام میں محمد قاسم فرشتہ نے اس مصرعہ کو سب سے پہلے ظہیر الدین محمد بابر سے منسوب کیا تھا جو آج تک اسی طرح چلا آ رہا ہے۔(م۔ج)

59 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 41

60 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 49

61 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 52

62 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 54

63 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص6

64 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدبن محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص124

65 پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص113

66. پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ''محمد ظہیر الدین بابر'' مضمون مطبوعہ روزنامہ سیاست حیدرآباد ادبی وثقافتی اڈیشن بابت جولائی 2003

67. پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' صفحہ نمبرات بالترتیب 98، 96، 92، 88، 80

68. پروفیسر قمر رئیس ''ظہیر الدین محمد بابر شخص، شخصیت اور شاعری'' ص 62

69. ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ''بابر شناسی کی ایک نئی جہت'' ص 40 تبصرہ مشمولہ ومطبوعہ رسالہ انشا مدیر ف س اعجاز بابت مارچ اپریل 2003ء جلد 18 شمارہ 3 و 4

70. ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ''بابر شناسی کی ایک نئی جہت'' ص 40 تبصرہ مشمولہ ومطبوعہ رسالہ انشا مدیر ف س اعجاز بابت مارچ اپریل 2003ء جلد 18 شمارہ 3 و 4

71-72. ڈاکٹر قمر رئیس ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' ص 19 ہندوستانی کتاب گھر دہلی 2001ء

73. ڈاکٹر قمر رئیس ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' دہلی، 2001ء

74. ڈاکٹر قمر رئیس ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' ص 21-20

75. ڈاکٹر قمر رئیس، بیسویں صدی کی ازبیک شاعری، ص 16 - 15

76. ڈاکٹر قمر رئیس، بیسویں صدی کی ازبیک شاعری، ہند۔ازبکستان دوستی سوسائٹی، دہلی 2001ء ص 14

77. ڈاکٹر خالد اشرف ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' ص 48 تبصرہ مشمولہ رسالہ ایوان اُردو دہلی بابت نومبر 2002ء

78. ڈاکٹر سونیا چیرنی کووا ''ڈاکٹر قمر رئیس اور سوویت یونین'' مضمون مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی ص 29-328

79. ڈاکٹر سونیا چیرنی کووا ''ڈاکٹر قمر رئیس اور سوویت یونین'' مضمون مشمولہ قمر رئیس ایک زندگی ص 27-326

80. Kamalvoa Kh.N. "Works of Uzbek writers and poets on the Hindi & Urdu languages" P-36

81. Kamalova Kh.N. "Works of Uzbek writers and poets on the Hindi & Urdu languages" P-36

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

اختتامیہ

قمر رئیس اساتذہ کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو طلبا و ریسرچ اسکالرس کی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشتی ہے اور جو اپنی نگارشات کے ذریعے قوم وسماج کی رہنمائی و رہبری کرتی ہے۔ جنھیں انسانی عظمت، انسانی اقدار اور انسانوں کی سر بلندی عزیز ہوتی ہے اور جن کی زندگی کا مقصد انسان دوستی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی تعلیم و تربیت شاہجہاں پور اور لکھنؤ میں ہوئی۔ یہ دونوں شہر تہذیب اور شعر و ادب کے گہوارے تھے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر قمر رئیس کے خاندان میں بھی شاعری اور علم دوستی کی روایت پروان چڑھ رہی تھی۔ ان کے نانا سید حبیب الحق صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اور ان کے بڑے بھائی مبارک شمیم بھی زمانۂ طالب علمی سے ہی شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر قمر رئیس کی ذہنی اور جذباتی تربیت میں ابتداء سے ہی شعر و ادب کا حصہ کارفرما رہا۔ ان کے والد ایک کامیاب مختار اور زمیندار تھے۔ شاہجہاں پور میں وہ آنریری مجسٹریٹ اور طویل مدت تک شہر کی Bar Association کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ قمر رئیس کے والد جناب عبدالعلی خاں کی یہ خواہش تھی کہ ان کا یہ بیٹا وکیل بن کر ان کا جانشین ہو۔ اس لئے والد بزرگوار کے اصرار پر ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کیا اور وکالت شروع کردی۔ لیکن ادبی ذوق جو بچپن سے مزاج کا خاصہ بن گیا تھا اس کی تسکین کا سامان بھی کرتے رہے۔ چنانچہ 1952ء سے 1955ء تک لکھنؤ کے زمانہ قیام میں انہوں نے وہاں کی ادبی شخصیتوں سے ربط وضبط بڑھایا اور ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے حصہ لیا۔ شعر گوئی کا سلسلہ 1948ء ہی سے جاری تھا۔ اب انہوں نے تنقید کی جانب بھی توجہ کی انہوں نے بہت جلد لکھنؤ کے نوجوان ادیبوں

کے حلقے میں نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔ ان کے ساتھیوں میں قاضی عبدالستار‘ احمد جمال پاشا‘ اقبال مجید وغیرہ شامل تھے۔ ہر اتوار کو منعقد ہونے والے ترقی پسند مصنّفین کے جلسوں میں بھی نوجوان ادیبوں کے ساتھ پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ اسی کے ساتھ مارکسی نظریات کا مطالعہ بڑی سنجیدگی سے کر رہے تھے۔ لکھنؤ کی اس ذہنی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وکالت کے پیشے سے ان کی دلی وابستگی پیدا نہ ہوسکی اور وہ خاموشی سے اُردو میں ایم اے۔ کے امتحان کی تیاری کرتے رہے اور 1955ء میں انہوں نے ایم اے کا امتحان نہایت امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وکالت کا پیشہ ترک کیا اور اُردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ حالانکہ والد صاحب کی سرپرستی میں ان کو وکالت کے پیشے میں خاصی کامیابی مل رہی تھی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ زمانہ ملک میں اور خاص طور سے یوپی میں اُردو زبان وادب کے لئے نہایت حوصلہ شکنی اور تاریکی کا زمانہ تھا۔ قانون کے ذریعہ اُردو کی تعلیم اور سرکاری اداروں میں اُردو کا استعمال ختم کیا جاچکا تھا۔ ایسے ماحول میں کوئی بھی ذہین اور حوصلہ مند نوجوان اُردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اسے اپنا پیشہ بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے پیروں میں ایک طرف وکالت اور دوسری طرف ازدواجی بندھن کی بیڑیاں پڑ گئی تھیں۔ اگر وہ وکالت کرتے تو اس پیشہ میں آج ان کی مہارت کی عمر پچاس برس کی ہوتی اور شائد وہ اپنے شہر کے یا صوبہ کے ممتاز اور سربرآوردہ وکیلوں میں شمار کیے جاتے لیکن انہوں نے اس پیشہ کو ترک کرکے اُردو زبان وادب کی خدمت گزاری کا راستہ اختیار کیا۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک تابناک رُخ ہے۔ ڈھائی تین سال کے عرصے میں انہوں نے اپنی محنت‘ ذہانت اور لگن سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پریم چند پر ڈاکٹریٹ کا کام مکمل کیا۔ 1959ء میں جب یہ مقالہ شائع ہوا تو یوپی گورنمنٹ نے اسے نثر کی سب سے وقیع کتاب قرار دے کر سب سے بڑا انعام دیا۔ اسی سال ان کا تقرر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ہوگیا۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی اس نے انہیں علم ودوستی اور اپنی مادری زبان اُردو کی خدمت کے جذبے سے سرشار کردیا۔ اس کے ساتھ ہی عزم وارادے اور ایثار وقربانی کا جذبہ بھی ان کی شخصیت میں مسلسل بروئے کار رہا۔ نظریاتی طور پر وہ ترقی پسند تحریک اور مارکسی فکر سے بہت قریب رہے ہیں لیکن اس راہ میں انہوں نے ہمیشہ اعتدال

کا مسلک اپنایا اور افراط وتفریط سے دور رہنے کی کوشش کی۔

ادبی تنقید میں ان کا آغاز شاعری کے مطالعہ سے ہوا۔ لکھنؤ میں انہوں نے احمد ندیم قاسمی، عبدالحمید عدمؔ اور مجازؔ پر مضامین لکھے لیکن پریم چند کی فکشن پر مقالہ لکھ کر وہ فکشن کی تنقید کی طرف راغب ہوئے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ علی گڑھ میں انہیں فکشن کے مطالعہ سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اپنے نگراں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مشورے سے انہوں نے نہ صرف اُردو کے کلاسیکی فکشن بلکہ عالمی ادب میں موجود فکشن کی نمائندہ تصانیف کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا۔ ان میں روسی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے اہم ناول نگار مثلاً ٹالسٹائی، دوستووسکی، بالزاک، فلا بیر اور ڈیکنس وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے مضامین کے پہلے مجموعے تلاش وتوازن میں اُردو ناول کے ارتقائی مراحل پر کئی اہم مضامین شامل ہیں۔ پریم چند پر بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کے ناولوں کے علاوہ افسانوں کو بھی ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا۔ اس طرح فکشن خصوصاً افسانے کی تنقید میں انہوں نے جلد ہی اپنے لئے ایک منفرد جگہ بنالی۔

افسانوی ادب کی تنقید میں ڈاکٹر قمر رئیس کے امتیاز کا سبب یہ تھا کہ مارکسی تنقید کی روایت سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ اسے ایک تخلیقی ڈھنگ سے برت رہے تھے یعنی فکشن کے حوالے سے پہلے تحقیقی مواد جمع کر کے پھر اس کے موضوع اور سماجی عوامل کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے اور مصنف کے اپنے موقف یا وژن کو تلاش کرتے اور پھر فکشن کے فنی اوصاف وعناصر کا محاکمہ مذکورہ عوامل واثرات کی روشنی میں کرتے۔ رتن ناتھ سرشار کے بارے میں ان کی کتاب جو ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوئی اور فسانۂ آزاد کی تلخیص کے دو ایڈیشن نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوئے۔ اس میں انہوں نے اسی تنقیدی طریقہ کار کو عملی طور پر پیش کیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ایک توازن قائم کرنے کی غرض سے سماجی، تاریخی، فکری اور فنی عناصر کی باہمی اثر پذیری کو نتیجہ خیز ڈھنگ سے سامنے لانے کی کوشش کی۔

قمر رئیس نے فکشن کے ہم عصر رجحانات اور مسائل کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ فکشن میں ترقی پسندی کی روایت اور ان کے نمائندہ افسانہ نگاروں کو انہوں نے خصوصیت سے اپنا موضوع بنایا۔ احمد ندیم قاسمی، جوگندر پال، اقبال مجید، رتن سنگھ اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ گہرائی سے غور وخوص کے ساتھ

کیا۔عہد حاضر کے افسانوی ادب کے فروغ میں ان ادیبوں کا جو منفرد حصہ رہا ہے اور جس طرح انہوں نے اپنے فنی اسلوب کا تشخص قائم کیا ہے' ڈاکٹر قمر رئیس نے وضاحت اور استدلال کے ساتھ ان حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ 1965ء کے بعد جدیدیت کے علمبردار نقادوں نے ترقی پسند افسانوی ادب کو کڑی تنقید کا ہدف بنایا۔صرف یہی نہیں انہوں نے ترقی پسند فکشن اور ان کی تنقید کے پیچھے جو ادبی تصورات کارفرما رہے تھے ان کی بھی کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ان کے بے محابا حملوں سے ترقی پسند ادیبوں کی یا تو حوصلہ شکنی ہوئی یا پھر وہ جدید طرز کے علامتی اور تجریدی افسانے لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ان حملوں کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ڈاکٹر قمر رئیس نے پہلے 'عصری آ گہی' اور پھر 'نیا سفر' جیسے ترقی پسند ادبی پرچوں کا اجراء کیا اور ان کے وسیلے سے ترقی پسند ادب کی صحت مند روایت اور اس کی معنویت کو منوانے کی سعی کی۔انہوں نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی ادب پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا۔اسی طرح اپندر ناتھ اشک' قرۃ العین حیدر' پریم چند اور ان کے تخلیقی ورثے کے حوالے سے اہم مضامین لکھے۔انہوں نے ترقی پسند ادبی روایت میں 'زمین اور زندگی' سے جڑے پریم چند کے فن کی معنویت کو بار بار اجاگر کیا۔مثال کے طور پر ان کے مجموعے تعبیر و تحلیل میں شامل درج ذیل مضامین

1. پریم چند کے افسانے ایک جائزہ
2. پریم چند کے ہیرو ایک سماجیاتی مطالعہ
3. پریم چند کی روایت اور جدید افسانوی ادب

ایک طرف حقیقت پسندانہ افسانوی ادب کی فنی قدر و قیمت کا جائزہ پیش کرتے ہیں' تو دوسری طرف جدید افسانے کی بے معنویت اور عام قاری سے اس کی بڑھتی ہوئی دوری کو بے نقاب کرتے ہیں۔انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے زیر اہتمام دہلی میں منعقدہ سہ روزہ سمینار میں جدیدیت کے زوال اور عہد حاضر کے ادب خصوصاً فکشن میں حقیقت پسندی کے رجحانات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔سمینار کے کلیدی خطبے کے موقع پر ہم عصر ادب کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

”اس حقیقت کی تردید مشکل ہے کہ ترقی پسند ادبی فکر کے انحطاط اور جدیدیت کے انہدام کے نتیجے میں نظریاتی سطح پر جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مغرب کی تھیوریز سے نہ پُر ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر تانیثیت یا Feminism ' مغرب میں اس کی لمبی تاریخ ہے اور اس کے تحت مرد کے مقابلہ میں' طبقہ نسواں کی مساوات کے تصور نے وہاں ایک مضبوط اور مانوس تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے جب کہ ہمارے معاشرے اور ادب میں ایسا نہیں ہے' ہمارے یہاں تو عورت پرمرد کے جبر' تشدد اور سفاکانہ استحصال کے خلاف مہم ابھی تحریک کی شکل بھی اختیار نہیں کرسکی۔ مساوات تو دور کا خواب ہے۔ اس لئے بنیادی سوال یہی ہے کہ نظریاتی عملی اور تخلیقی سطح پر اس خلا کو کیسے پُر کیا جائے؟“

(عصری آگہی' دہلی' پندرہ روزہ 15 اپریل 2003ء ص 33 مدیر سیماب احمد)

ڈاکٹر قمر رئیس مغرب کے ادبی افکار ونظریات کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن ان کا موقف شروع سے یہ رہا ہے کہ ہر ملک اور ہر زبان کا ادب اس کی مخصوص تہذیب اور اس کے اجتماعی مسائل کی نمائندگی کرتا ہے اور اس لئے اس ادب کے بطن سے پیدا ہونے والے تنقیدی نظریات بعض عمومی ضابطوں کے باوجود اس زبان کے تہذیبی اور قومی کردار سے جڑے ہوتے ہیں اور اس لئے ان کا اطلاق دوسری زبانوں کے ادب پر نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک ہم عصر ادب کا تعلق ہے ڈاکٹر قمر رئیس کے مطالعہ کا خاص میدان بے شک افسانوی ادب رہا ہے لیکن انہوں نے دوسرے موضوعات اور دوسری اصناف کو بھی اپنی تنقیدی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ مثال کے طور پر طنز وظرافت پر انہوں نے ایک کتاب لکھی جو اُردو اکیڈمی دہلی سے شائع ہوئی۔ اُردو کے لوک گیت' اُردو تنقید خاص طور سے احتشام حسین اور سردار جعفری کے تنقیدی رویوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ پیروڈی کے فن پر بھی ان کا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر اُردو شاعری کے بعض اہم موضوعات اور شخصیات کو بھی انہوں نے تنقیدی تجزیے کا موضوع بنایا۔ ان میں علامہ اقبال' جوش ملیح آبادی' حالی' فیض احمد فیض' اختر الایمان' کیفی اعظمی اور احمد فراز کی شاعری پر ان کے

مقالے اہل نظر کی تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نثر ہو یا شاعری، ڈاکٹر قمر رئیس کے تنقیدی استدلال اور تجزیے میں ان کی منفرد بصیرت اور گہرائی کے پیچھے مارکسی فکر کار فرما ہوتی ہے جو بعض دوسرے ترقی پسند نقادوں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس کے یہاں مارکسی اوزاروں کا استعمال زیادہ احتیاط اور ضبط و توازن سے ہوا ہے اور بدلتے ہوئے ادبی منظرنامے اور رجحانات کے زیر اثر انہوں نے اپنے تنقیدی موقف میں مناسب تبدیلیوں کو بھی جگہ دی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس دس سال تک ادبی صحافت سے بھی وابستہ رہے 1956ء سے 1959ء تک علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں وہ جامعہ اُردو کے ماہنامہ ادیب اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مجلّے 'علی گڑھ میگزین' کے مدیر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ علی گڑھ کی روایت کے مطابق علی گڑھ میگزین کی ادارت ایک بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ علی گڑھ میگزین میں ڈاکٹر قمر رئیس نے پہلی بار اُردو شاعری اور عہد جدید میں میر تقی میرؔ کی معنویت کو دریافت کیا۔ انہوں نے ایک خاص گوشہ ترتیب دے کر ممتاز ناقدین کے ایسے مضامین شائع کیے جنہوں نے مرزا غالب کے متوازی میرؔ کی عظمت اور ان کے تشخص کو مستحکم کیا۔ ان مقالہ نگاروں میں آل احمد سرور، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر سلامت اللہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد ہی برصغیر میں میرؔ کی مقبولیت اور ان کی بازیافت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسی طرح ماہنامہ ادیب میں انہوں نے انتقاد نمبر اور انشائیہ نمبر جیسے خصوصی شمارے شائع کیے۔ پہلی بار اُردو میں انشائیہ کی صنف کو اس کی تمام فنی ضرورتوں اور ادبی اوصاف و عناصر کے ساتھ متعارف کرانے کی کوشش کی گئی۔ صرف یہی نہیں ڈاکٹر قمر رئیس نے عالمی ادب میں بھی انشائیہ کی جو اہمیت رہی ہے اس کا بھی تعارف کرایا۔ انہوں نے فرانسیسی، روسی، انگریزی، عربی اور فارسی انشائیوں کے معیاری ترجمے پیش کیے۔ اُردو میں سرسید کے دور سے انشائیہ نگاری کی جو روایت شروع ہوئی تھی اس کا انہوں نے مختلف مضامین میں تنقیدی جائزہ بھی لیا اور اُردو کے ممتاز انشائیہ نگاروں کے شاہکار نمونے مثال کے طور پر پیش کیے۔ ایک خصوصی شمارے کے اداریے میں بھی ڈاکٹر قمر رئیس نے انشائیہ کے فن اور اس کے امکانات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ماہنامہ 'ادیب' تین سال تک پابندی سے ڈاکٹر قمر رئیس کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے ذریعہ انہوں نے نہ صرف اُردو کے طلباء کو

وقیع مواد فراہم کیا بلکہ اُردو کے اساتذہ اور ادیبوں کے مسائل اور ادب کے نئے رجحانات کے تنقیدی جائزے بھی پیش کئے۔ بہت سے ممتاز ادیبوں مثلاً احتشام حسین، اختر انصاری، خورشید الاسلام اور ڈاکٹر محمد حسن کے انٹرویوز بھی شائع کئے گئے جن میں اس عہد کے ادبی رجحانات اور میلانات کا جائزہ لیا گیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں یہ ایسا زمانہ تھا جب بیشتر معیاری رسائل یا تو بند ہو گئے تھے یا ان کے مدیر پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ مثلاً صہبا لکھنوی کا 'افکار' یا شاہد احمد دہلوی کا 'ساقی' اور ہندوستان کے اُردو ادب میں جمود و انحطاط کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا۔ ایسے ماحول میں ماہنامہ 'ادیب' کی اشاعت نے ایک اہم رول ادا کیا۔ اس کے ذریعے بہت سے نوجوان ادیبوں کو متعارف کرایا گیا اور ادب میں نئے رجحانات کی نشاندہی کی گئی۔ اس رسالہ میں اگرچہ تخلیقی ادب کی اشاعت نہیں ہوتی تھی۔ تاہم تنقیدی تحقیقی اور تجزیاتی تحریروں کے ذریعے اس رسالے نے اُردو کے نوعمر طالب علموں کی رہنمائی کا فرض انجام دیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی علم دوستی اور تنقیدی بصیرت نے اُردو ادب کے کچھ اور مختلف گوشوں کو بھی منور کیا۔ بعض ایسے ذہین اور باصلاحیت فنکاروں کی خدمات کو انہوں نے اجاگر کیا جو حالات اور وقت کی گرد میں دب گئے تھے۔ ان میں ایک اہم نام نیاز حیدر کا ہے جو ترقی پسند شاعروں کی پہلی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہوں نے بلا مبالغہ سیکڑوں نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ اسٹیج کے لئے ڈرامے بھی لکھے اور فلمی ڈراموں کے لئے اسکرپٹ بھی تصنیف کئے لیکن ان کی قلندرانہ بے نیازی کی وجہ سے ان کی شاعری کا کوئی نمائندہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ 1992ء میں انہوں نے نیاز حیدر کی نمائندہ اور شاہکار نظموں کا ایک مجموعہ 'شعلۂ آوارگی' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کتاب کے مقدمے میں انہوں نے نیاز حیدر کی لاابالی شخصیت اور ان کی فکر انگیز ترقی پسند شاعری پر تجزیاتی انداز سے تفصیلی روشنی ڈالی۔ انہوں نے کوشش کی کہ اُردو کی ترقی پسند اور جدید شاعری کی روایت کے فروغ میں ان کی خدمات اور ان کے منصب کا تعین ہو سکے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر قمر رئیس کی نگرانی میں ڈاکٹر ظفر الدین نے دہلی یونیورسٹی سے نیاز حیدر کے ادبی کارناموں پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ مکمل کیا جو بعد میں قمر رئیس کے تعارف کے ساتھ شائع ہوا۔ عام طور پر نیاز حیدر کو نظم کا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر قمر رئیس نے ان کی غزلوں کا گم شدہ سرمایہ بھی ان کی بہن مرتضائی

بیگم اور ایک شاگرد ڈاکٹر شاہد تسلیم کی مدد سے جمع کیا اور اُسے ' نغمہ جمال زمیں ' کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعہ کا تفصیلی تعارف بھی ڈاکٹر قمر رئیس نے سپر دقلم کیا ہے جس میں ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے نیاز حیدر کی منفرد خصوصیات اور اُردو غزل کی روایت میں ان کی شناخت کا تعین کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے حکومت ہند کے Deputation پر کم و بیش 4 1/2 سال وسطی ایشاء کے مرکزی علاقے ازبکستان میں گزارے۔ 1962ء میں شروع ہوئے اس سلسلے اسفار کا سلسلہ 1982ء تک جاری رہا اور وہ کئی بار اُردو کے مہمان پروفیسر ہو کر تاشقند یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ آخر میں 1997ء میں حکومت ہند نے انہیں تاشقند کے انڈین کلچرل سنٹر کا ڈائرکٹر بنا کر بھیجا اور تقریباً ساڑھے چار سال تک وہ اس منصبِ جلیل پر فائز رہے۔ اس دوران انہوں نے وہاں کی مقامی زبان ازبکی اور روسی سیکھی۔ درس و تدریس کے کام کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس نے ازبکی زبان کی کلاسیکی اور جدید شاعری کی شاہکاروں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا۔ جو چار جلدوں میں شائع ہوا۔ صرف یہی نہیں انہوں نے کوشش کی کہ اُردو نثر اور شاعری کے بلند پایہ نمونوں کا ترجمہ ازبکی زبان میں شائع ہو۔ چنانچہ میر امن کی باغ و بہار، مرزا غالب کے اُردو دیوان کا انتخاب، فیض احمد فیض اور سردار جعفری کا کلام اور ان کے علاوہ پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، اور دوسرے افسانہ نگار کے ترجمے بھی ان کی تحریر اور رہنمائی میں ازبکی زبان میں شائع ہوئے اور ازبیک عوام میں اس قدر مقبول ہوئے کہ میر امن کی داستان ' باغ و بہار ' قصہ چہار درویش کے نام سے ایک سال میں دو مرتبہ شائع ہوئی اور ایک لاکھ سے زیادہ کاپیاں اس کی فروخت ہوئیں۔ اسی طرح غالب کے اُردو کلام کا انتخاب بھی دوبارہ شائع ہوا اور اس کی بھی ساٹھ ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں، رسوا کا ناول امراؤ جان ادا بھی شائع ہوا۔ ان کتابوں کے پیش لفظ ڈاکٹر قمر رئیس ہی نے لکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ازبیک زبان کے دو عظیم کلاسیکی شعرا علی شیر نوائی اور ظہیر الدین محمد بابر کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے بھی دو کتابیں تصنیف کیں۔ ان تصانیف اور تحریروں میں ڈاکٹر قمر رئیس نے اُردو اور ازبکی زبان کے تہذیبی، ثقافتی، فکری اور لسانی سرچشموں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے درمیان تاریخی طور پر جو مماثلتیں رہی ہیں ان کو بھی مثالوں اور استدلال کے ساتھ واضح کیا ہے۔ انڈین کلچرل سنٹر

کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر قمر رئیس نے ہندوستان اور ازبکستان کے ثقافتی ورثے کو قریب لانے کی کوشش کی۔ ان کے بہت از بیک شاگرد اُردو کے نامور اسکالر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں مثلاً فتح تیشا بائف' امان ختمووف' صورت میر قاسموف اور شرف الدین نے ازبکستان کی حکومت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ ایسے شاگرد ہیں جو ہندوستان' امریکہ اور انگلستان میں سفارت کے منصب پر بھی مامور رہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی انہیں خدمات کے صلہ میں ازبکستان کی حکومت نے انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی دو ڈگریاں تفویض کیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس ازبکستان میں ہندوستان اور اُردو زبان کے غیر سرکاری سفیر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی کوشش سے ہندوستان میں بھی ازبکستان کے بارے میں علم و آگہی کا دائرہ وسیع ہوا۔ اس سلسلہ میں ازبکستان کے بارے میں ان کا روز نامچہ اور سفر نامہ 'ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک' کے نام سے شائع ہوا' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں انہوں نے از بیک عوام کی تہذیب ان کے رسم ورواج' ان کی تقریبات' ان کے تہوار اور ان کے شعر وادب پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ بابر جو ایک حکمراں اور فاتح کی حیثیت سے مشہور تھا' اس کا تعارف ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک دانشور اور شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وسطی ایشیاء کے بارے میں ان کی تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ 2002ء سے 2003ء تک انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے Institute of third world studies میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے وسطی ایشیاء کے شعبہ میں تحقیقی کام کیا اور ہند و ازبکستان کے ثقافتی تعلقات پر انگریزی میں دو مقالے پیش کئے۔ امید ہے کہ وسطی ایشیاء سے ان کی گہری دلچسپی کے نتیجہ میں آئندہ بھی اہم کتابیں سامنے آئیں گی۔

جیسا کہ اکثر اُردو کے علماء اور ناقدین ادب کے ساتھ ہوا ہے' ڈاکٹر قمر رئیس کی ادبی زندگی کا آغاز بھی شاعری سے ہوا۔ جب وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے انہوں نے شعر گوئی کا آغاز کیا اور روایتی انداز کی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ بی اے کی طالب علمی کے زمانے میں جب وہ کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند ادب کے قریب آئے تو ترقی پسند انداز کی سیاسی نظمیں بھی کہنا شروع کیں۔ 1952ء سے 1955 تک لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں ان کی شعری و ادبی سرگرمیاں زیادہ برگ و بار لانے لگیں اور ان کی نظموں کے ساتھ ساتھ مضامین بھی

بعض رسائل میں شائع ہوئے۔ علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کرنے کے دوران تحقیق میں وہ اس درجہ مشغول ہو گئے کہ شعر گوئی کا دامن تقریباً چھوٹ گیا اور بعد ازاں تنقیدی اور علمی کاموں میں ان کا انہماک اتنا بڑھا کہ شاعری کی تخلیق کے لئے بہت کم وقت نکال سکے۔ تاہم زندگی اور زمانے میں رونما ہونے والے واقعات کی تحریک پر وہ سال میں دو چار نظمیں ضرور کہتے رہے۔ اُردو میں ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے لیکن ازبیکی زبان میں ان کی نمائندہ نظموں کا ایک مجموعہ 1973ء میں سجاد ظہیر کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا۔ تاہم پچھلے چند برسوں میں بابر اور ازبیکستان کے کم و بیش 35 شعرا کی شاہکار نظموں کا جو منظوم و منثور ترجمہ انہوں نے کیا اس سے اہل نظر کو ان کی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ ان کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کی روایتی شاعری جو بیشتر غزلوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے دور کی شاعری میں ترقی پسند موضوعات اور سماجی و سیاسی واقعات کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد جو نظمیں انہوں نے لکھیں اس میں ان کی ذاتی زندگی کے واقعات' ان کی محرومیاں' ان کے دکھ اور نشاط و انبساط کے لمحے اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں جن میں شہر پناہ' گلکار مقبرہ' نیم شب' ازبیکستان میں اجنبی' رقاصہ اور ماں وغیرہ قابل ذکر اور اہم ہیں' کو انہوں نے مشاعروں میں پیش کیا جسے سامعین نے بے انتہا پسند کیا۔ ان کے شعری اسلوب میں سادگی کے ساتھ ساتھ نئے نئے شعری پیکر اور تمثیلی اظہار خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ دوستوں کے اصرار پر اپنا مجموعہ مرتب کر کے شائع کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس کے احباب وطلبہ جانتے ہیں کہ ان کی ذہنی اور علمی سرگرمیاں مختلف جہتوں اور میدانوں میں بروئے کار رہی ہیں۔ اپنی تنظیمی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی وہ اپنے معاصرین سے مختلف اور ممتاز رہے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں وہ دوبار صدر شعبہ کے منصب پر فائز ہوئے اور اپنی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں سے کام لے کر انہوں نے درس و تدریس اور تحقیق کے کاموں کا معیار بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کی۔ اُردو میں تحقیق اور متنی تنقید کے بارے میں کوئی معیاری اور مستند کتاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے رفیق کار ڈاکٹر تنویر احمد علوی سے اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھوائی اور اسے اپنے پیش لفظ کے ساتھ شعبۂ اُردو سے شائع کیا۔ ہندی کے ادیب

امرت رائے اور بعض دوسرے اُردو مخالف عالموں نے اُردو زبان پر جہاں دوسرے اعتراض وارد کئے وہاں اس کو محض ایک شہری زبان ثابت کرنے کے لئے یہ دعویٰ کیا کہ اُردو زبان میں لوک ادب کی کوئی روایت نہیں ہے۔ یعنی ایسا ادب جسے قصبوں، دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں اُردو بولنے والی آبادی گھریلو تقریبات رسم ورواجوں اور تہواروں کے موقع پر گاتی ہو یا دوسرے طریقوں سے پیش کرتی ہو۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے دورِ صدارت میں اُردو میں پہلی بار اُردو کے لوک ادب پر ایک دو روزہ سمینار کیا۔ جس میں نہ صرف دلّی، یوپی بلکہ بہار، پنجاب، مہاراشٹرا اور دوسرے علاقوں کے اُردو لوک ادب پر مستند مقالے پڑھے گئے اور ان پر بحث اور گفتگو ہوئی۔ ان علمی اور تحقیقی مقالوں میں یہ بتایا گیا کہ اگر چہ اُردو کے علماء نے اُردو کے لوک ادب کی تحقیق اور تلاش کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی لیکن جہاں جہاں اُردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں نثر اور نظم میں اُردو ڈراموں اور ڈرامائی فیچر کی شکل میں اُردو کا لوک ادب بھی موجود ہے۔ اس میں پہلی بار ہندوستان میں اُردو کے عوامی یا لوک ادب کی تلاش اور چھان بین کی طرف سنجیدگی سے توجہ دلائی گئی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے سمینار میں پڑھے جانے والے سارے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ اسی طرح علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری پر بھی سمینار شعبہ میں منعقد ہوا اور اس میں پڑھے جانے والے مقالات بھی کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں نظامِ خطبات کا ہر سال اہتمام کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اس کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ پروفیسر آل احمد سرور موجودہ عہد کے اقبال شناسوں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں لیکن اقبال پر ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، ڈاکٹر قمر رئیس نے ان کو علامہ اقبال کی شاعری اور نظریہ شاعری پر نظامِ خطبات پیش کرنے کی دعوت دی۔ یہ خطبات بے حد مقبول ہوئے جنھیں قمر رئیس نے شعبے کی جانب سے شائع کیا اور اب اقبال شناسی شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی اور پروفیسر آل احمد سرور کا منفرد عطیہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ کہا جاتا تھا کہ اُردو زبان شعر وادب کے دائرے تک محدود ہے اس میں سائنسی تحقیق کے حوالے سے اہم لٹریچر موجود نہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ہندوستان کے ممتاز سائنس داں اور ٹاٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے نامور دانشور پروفیسر ڈاکٹر عبید صدیقی کو نظامِ خطبات کے تحت انسانی دماغ (Neoriology) پر Lecture پیش کرنے کی دعوت دی۔ پروفیسر صدیقی برسوں سے اس اچھوتے اور مخصوص موضوع پر تحقیقی کام

کرر ہے ہیں۔ انہوں نے اُردو زبان میں لکچر پیش کیا۔ علی سردار جعفری ترقی پسند افکار و ادب کے ماہر اور دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس میدان میں اہل نظر نے ان کی ہمہ گیر خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ کچھ عرصہ سے یہ محسوس کیا جار ہا تھا کہ ترقی پسند نظریہ وادب کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اس کام کے لئے علی سردار جعفری کا انتخاب کیا اور اس موضوع پر انہوں نے نظام خطبات پیش کئے جو شعبہ سے شائع ہوئے۔

انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند ایک کل ہند تنظیم ہے۔ آل احمد سرور، محی الدین قادری زور، عبد القادر سروری، اختر اور ینوی اور خواجہ احمد فاروقی جیسے اکابر علما اور اساتذہ نے اس انجمن کی بنیاد رکھی تھی۔ جس طرح تاریخ کی تعلیم سے وابستہ اساتذہ کی تنظیم وقفے وقفے سے کانفرنسیں کر کے اپنے علمی، تنظیمی اور پیشہ ورانہ امور پر غور وفکر کرتی ہے اسی طرح اس انجمن کے اجتماع بھی ہوتے تھے۔ عموماً دو سال کے وقفے سے یہ کانفرنس منعقد ہوا کرتی اس موقع پر اس کے صدر، جنرل سکریٹری اور دوسرے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ 1972ء میں لکھنؤ کی کانفرنس میں جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر قمر رئیس کا انتخاب عمل میں آیا اور صدر محمد حسن منتخب ہوئے۔ انہوں نے اساتذہ اُردو کی اس تنظیم کو بہت فعال بنا دیا اور اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ مختلف دانش گاہوں اور کالجوں کے اُردو اساتذہ کو قریب لانے اور متحد کرنے کی کوششیں ہوئیں بلکہ اس کی کانفرنسوں میں اُردو زبان وادب اور اس کی تعلیم کے مسائل، اُردو ادب کی تحقیق کے مسائل اور خود اُردو اساتذہ کے پیشہ ورانہ مسائل پر بڑے فکر انگیز اور نتیجہ خیز سمینار کئے گئے۔ اُردو اساتذہ کو اس کی کارروائیوں سے آگاہ رکھنے کے لیے ایک بلٹین (Bulleten) بھی جاری ہوا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے رانچی، ٹونک اور بنگلور میں جو کانفرنسیں کیں وہ بے حد کامیاب رہیں اور ان کانفرنسوں کا اثر سارے ہندوستان کی دانش گاہوں کے اُردو اساتذہ کی علمی اور عملی سرگرمیوں پر محسوس کیا گیا۔ 1982ء میں جب قمر رئیس چوتھی بار بحیثیت پروفیسر تاشقند گئے تو انہوں نے اپنے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

بیسویں صدی میں اُردو کی سب سے بڑی ادبی تحریک ترقی پسند تحریک ہے جس نے اُردو شعر وادب میں نئی فکر اور نئے تصورات کی آبیاری کر کے اسے زندگی اور ادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا۔ لیکن 1960ء کے بعد یہ تحریک اور اس کی تنظیم دونوں جمود وانحطاط کا شکار ہوگئیں۔ دسمبر 1960ء کی دہلی کانفرنس کے ذریعہ اس تحریک میں

نئی جان ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش اس لئے نا کام رہی کہ اس کی قیادت ابھی تک پرانے رہنماؤں یعنی سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم اور کرشن چندر جیسے ادیبوں کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ اس میں ترقی پسند فکر واحساس رکھنے والے نوجوان ادیبوں کی امنگوں اور حوصلوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ستمبر 1972ء میں قمر رئیس کی تحریک اور رہنمائی میں نوجوان ادیبوں کی ایک نئی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں حسن نعیم، انور عظیم، شہاب جعفری، اجمل اجملی، سید محمد عقیل رضوی اور سیفی پریمی وغیرہ شامل تھے۔ اس کمیٹی کے زیر اہتمام ہر مہینے پابندی سے جلسے ہونے لگے اور پھر اس کمیٹی کے زیر اہتمام 1973ء میں ادب وعصری آگہی کے عنوان سے ایک بڑا سمینار دہلی میں کیا گیا جس میں اعلیٰ درجے کے مقالات پڑھے گئے جس میں آزادی کے بعد اُردو ادب کے مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا۔ اس کی رپورٹ سجاد ظہیر مرحوم نے اور ایک رپورتاژ قاضی عبدالستار نے ماہنامہ کتاب لکھنؤ میں شائع کرایا۔ 1976ء میں ڈاکٹر قمر رئیس نے ترقی پسند تحریک کا چالیس سالہ جشن منایا۔ اس اجتماع میں حیات اللہ انصاری اور اپندر ناتھ اشک جیسے بزرگوں کے علاوہ نوجوان ادیبوں اور شاعروں نے بھی حصہ لیا۔ اپریل 1980ء میں ترقی پسندوں کی اس نئی تنظیم کے زیر اہتمام پریم چند کا صد سالہ جشن بھی منایا گیا۔ اس طرح ڈاکٹر قمر رئیس کی کوششوں سے ترقی پسند تحریک میں نہ صرف نئی جان پڑ گئی بلکہ نوجوان ادیب بھی سامنے آنے لگے۔ یہ صورت حال اس وقت اور موثر ہوگئی جب 1979ء میں ڈاکٹر قمر رئیس نے 'عصری آگہی' نام کا ایک ماہنامہ دہلی سے شائع کیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی ہی کوششوں سے لندن میں 1985ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کا 50 سالہ جشن منایا گیا۔ اس کے بعد 1986ء میں دہلی میں اس انجمن کے قیام کا جشن طلائی بڑے شان وشکوہ سے منایا گیا۔ 1960ء کے بعد جدیدیت کی تحریک کے علمبردار ترقی پسند ادب اور ادبی نظریات کو اپنی کڑی تنقید کا ہدف بنا رہے تھے۔ مذکورہ بالا جلسوں سے اس کی کافی حد تک مدافعت ہوئی۔ عصری آگہی کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس نے 'نیا سفر' جیسا سہ ماہی ترقی پسند ادبی رسالہ جاری کیا جو ان کی عدم موجودگی میں الہٰ آباد سے علی احمد فاطمی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ مارچ 2003ء میں ڈاکٹر قمر رئیس نے ہم عصر ادب اور جدید حقیقت نگاری کے موضوع پر ایک سہ روزہ سمینار کیا۔ اس کا مقصد بھی جدیدیت کے زوال کے بعد اُردو میں ترقی پسند ادب کی صحت مند قدروں کی بازیافت

تھا۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات نصف صدی پر محیط ہے۔ انہوں نے ترقی پسند مصنّفین کے حوالے سے اُردو میں انسان دوستی کو فروغ دیا' امن کی فضا کی تخلیق پر زور دیا' مظلوموں کی حمایت میں ہمیشہ ہر حال میں آواز بلند کی۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی تحریریں' ہندوستان میں اُردو ادب کے بدلتے رجحانات' اقدار کے ساتھ ساتھ اُردو پر ڈھائے جانے والے سیاسی ظلم کی پاسبان ہیں۔ انہوں نے اُردو ادب کو ملک کی سرحدوں سے باہر ازبکستان و برطانیہ کی فضاؤں میں کھل کر سانس لینے کا سلسلہ عطا کیا۔ اپنی کوششوں اور کاوشوں سے ان ممالک میں اُردو شعر و ادب کی روایت کو مستحکم کیا۔ ترقی پسند مصنّفین کو استحکام عطا کیا۔ پریم چند اور نیاز حیدر کی بازیافت قمر رئیس کی تحریروں کا امتیاز ہے۔ قمر رئیس انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو ادب کی تاریک راہوں میں لعل شب چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

کتابیات

قمر رئیس کی کتابیں

1۔ آزادی کے بعد دہلی میں اُردو افسانہ اُردو اکادمی، دہلی مارچ 1990ء

2۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات 1986ء دہلی اُردو اکیڈمی، دہلی

3۔ اُردو ڈرامہ: انتخاب مع مقدمہ سرسید بک ڈپو، علی گڑھ 1961ء

4۔ اُردو میں لوک ادب، شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی دہلی جنوری 1990

5۔ ارمغان تاشقند (ازبکستان کے قومی شاعر غفور غلام کی نظموں کا ترجمہ)

6۔ ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ) تخلیق کار پبلی شرز، نئی دہلی 1997ء

7۔ ازبکستان اور علی شیر نوائی (معاون مترجم۔رحمان بیروی محمد جانوف) 1994ء ہریانہ اُردو اکیڈمی، پنچکولہ

8۔ اصناف ادب اُردو (اشتراک ڈاکٹر خلیق انجم) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

9۔ اقبال کا شعور وفن شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی۔مئی 1979ء

10۔ بیسویں صدی کی ازبیک شاعری ہند۔ازبکستان دوستی سوسائٹی، دہلی 2001ء

11۔ پریم چند ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی 1981ء

12۔ پریم چند: فکر وفن پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی 1980ء

13۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار سرسید بک ڈپو، علی گڑھ 1959ء

14۔ پریم چند کے نمائندہ افسانے ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1991ء

15۔ پریم چند کی وچار یاترا (ہندی) پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی 1980ء

16۔ ترجمے کا فن اور روایت تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی جون 1976ء

17۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر (اشتراک عاشور کاظمی) نیا سفر پبلی کیشنز، نئی دہلی 1987ء

18۔ تعبیر و تحلیل (مضامین کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1996ء

19۔ تلاش و توازن (مضامین کا مجموعہ) 1968ء ادارہ خرام پبلی کیشنز، دہلی

20۔ تنقیدی تناظر (مضامین کا مجموعہ) 1978ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

21۔ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ جوش انٹرنیشنل سمینار کمیٹی، دہلی جون 1993ء

22۔ رتن ناتھ سرشار ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی 1983ء

23۔ شعرائے ازبکستان (ترجمہ، دو جلدیں) غفور غلام پبلشنگ ہاؤس، تاشقند

24۔ شعلۂ آوارگی (تدوین۔ نیاز حیدر کا مجموعہ کلام) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992ء

25۔ ظہیرالدین محمد بابر: شخص، شخصیت اور شاعری ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2002ء

26۔ فسانۂ آزاد (تلخیص) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی

27۔ مضامین پریم چند 1960ء

28۔ منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1983ء

29۔ نمائندہ اُردو افسانے (انتخاب) دہلی اُردو اکیڈمی، دہلی

30۔ نیا افسانہ۔ مسائل اور میلانات اُردو اکادمی دہلی، 1992

31۔ رپورٹ (کتابچہ) کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس، حیدرآباد، مارچ 1995ء

دیگر کتابیں

1۔ ادب اور انقلاب اختر حسین رائے پوری، ادارہ اشاعت اُردو، حیدرآباد

2۔ ادبی تناظر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ 1991ء

3۔ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، طبع دوم 1979ء

4۔ انگارے کا تاریخی پس منظر اور ترقی پسند تحریک ڈاکٹر خالد علوی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1995ء

5۔ ترقی پسند ادب، عزیز احمد، چمن بک ڈپو، دہلی

6۔ ترقی پسند ادب، سردار جعفری، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، طبع اول 1951ء

7۔ ترقی پسند اُردو افسانے اور چند اہم افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1995ء

8۔ ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری، یعقوب یاور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1997ء

9۔ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، علی سردار جعفری، شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی طبع اول 1987ء

10۔ تنقید شعر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید 1971ء

11۔ تنقیدی جائزے، سید احتشام حسین، ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ، طبع ہفتم 1978ء

12۔ تنقیدی شعور، اختر تلہری، کتاب نگر، لکھنؤ 1957ء

13۔ جدید اُردو تنقید اُصول و نظریات، شارب ردولوی، دوسرا ایڈیشن 1976ء اتر پردیش اُردو اکیڈمی، لکھنؤ

14۔ دکن کی مخصوص شعری اصناف اور دوسرے مضامین ڈاکٹر حبیب نثار، حیدرآباد 1995ء

15۔ حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل ڈاکٹر محمد انور الدین مکتبہ شاداب حیدرآباد

16۔ دیوان حالی، مولانا الطاف حسین حالی، مطبع انوار احمدی، الہٰ آباد

17۔ ذوق ادب اور شعور، سید احتشام حسین طبع چہارم 1978ء

18۔ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین 1956ء

19۔ روشنائی، سجاد ظہیر، آزاد کتاب گھر، دہلی طبع اول 1959ء

20۔ سرسید احمد خاں، خلیق احمد نظامی، پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی طبع اول 1971ء

21۔ فن تنقید اور اُردو تنقید نگاری، نور الحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1998ء

22۔ قمر رئیس: ایک زندگی، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، تخلیق کار پبلیشرز، نئی دہلی 1998ء

23۔ ماسٹر رام چندر اور اُردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ ڈاکٹر سیدہ جعفر

24۔ مقدمہ شعر و شاعری، مولانا الطاف حسین حالی، مطبوعہ اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ

25۔ ناٹک ساگر محمد عمر و نور الٰہی پہلا اکادمی ایڈیشن 1982ء

26۔ نئے ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن 1958ء

27۔ نیاز حیدر شخصیت اور شاعری ظفر الدین پرنٹ آرٹ دہلی، 1995ء

28۔ نیرنگ خیال محمد حسین آزاد مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1978ء

29- Theories of Personality : Calvin S. Hall & Gardner Lindzey,
Wiley eastern ltd. New Delhi, July 1989.

30- Works of Uzbek writers and poets on the Hindi & Urdu languages
Kamalvoa Kh.N. 1996.

31. सामान्य मनोविज्ञान की रूपरेखा - सिन्हा राय कुमार
बीसवां संस्करण, जुलाई 1982, पटना

اخبارات و رسائل

1۔ ادب لطیف، لاہور سالنامہ 1948ء

2۔ ادبی دُنیا، لاہور جولائی 1945ء

3۔ انشاء کلکتہ مارچ اپریل 2003ء

4۔ جامعہ دہلی، فروری 1983ء

5۔ سویرا، لاہور شمارہ نمبر 8

6۔ سیاست حیدرآباد ادبی وثقافتی اڈیشن 21 جولائی 2003ء

7۔ شاہراہ دہلی اپریل 1952ء

8۔ عصری آگہی دہلی مدیر سیماب احمد اپریل 2003ء

9۔ قومی آواز نئی دہلی 30 جولائی 1995ء

10۔ گفتگو ممبئی، ترقی پسند ادب نمبر، مدیر سردار جعفری بابت مارچ 1980ء

11۔ لیڈر، الہ آباد 5 اپریل 1933ء

12۔ ماہنامہ عصری آگہی نئی دہلی، مدیر قمر رئیس بابت جون 1979ء

13۔ نوائے ادب ممبئی جولائی تا ستمبر 2002ء

14۔ نیا ادب جنوری فروری 1941ء

15۔ نیا سفر (سہ ماہی)، نئی دہلی، مدیر قمر رئیس بابت 1996ء کتابی سلسلہ 6

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad - 46

CERTIFICATE

Date: 30-01-2004

This is to certify that I, **MOSARRAT JAHAN**, have carried out the research embodied in the present thesis entitled "**A critical study of the literary contribution of QAMAR RAIS**" for the full period prescribed under Ph.D ordinance of the University. I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of research degree of any University.

(Signature of the Candidate)
Name: MOSARRAT JAHAN
Enrl. No. **01HUPH02**

Head, Dept. of Urdu 30/1/04
अध्यक्ष/Head
उर्दू विभाग/Department of Urdu
हैदराबाद विश्वविद्यालय
University of Hyderabad
हैदराबाद-500 046

Signature of the **Supervisor**

05-02-2004
Dean
School of Humanities
DEAN
SCHOOL OF HUMANITIES
University of Hyderabad
Hyderabad-500 134

A Critical Study of the Literary Contribution of QAMAR RAIS

Thesis

submitted to the Universtiy of Hyderabad in partial
fulfilment of the requirements for the award of the degree of

Doctor of Philosphy
in Urdu

Jan, 2004

Submitted by

MOSARRAT JAHAN
M.A.(Magadh Univ. Bodh Gaya) M.Phil.(Univ. of Hyd.)

Supervised by

DR. HABEEB NISAR
M.A., M.Phil., Ph.D. (Univ. of Hyd.)
Lecturer, Dept. of Urdu, University of Hyderabad

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad, **Hyderabad** - 500 046 (A.P.)